تحریک ادب
شمارہ (۱۶)
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے
اُردو
تحریک بقائے اُردو
مدیر
جاوید انور
جمیل منظر
ڈاکٹر فریاد آزر
عبدالکریم سالار
وحشی سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شمارہ (۱۶)

تحریک ادب

رفقائے تحریک ادب

مظفر ایرج (ہندوستان)
دیپک بدکی (ہندوستان)
فاروق مضطر (ہندوستان)
خورشید اکبر (ہندوستان)
محمد اقبال بنارسی (بابو بھائی) (ہندوستان)
غفران امجد (ہندوستان)
خواجہ جاوید اختر (ہندوستان)
سجاد پوپچھی (ہندوستان)
خورشید اکرم سوز (ہندوستان)
شیخ خالد کرار (ہندوستان)
عرفان عارف (ہندوستان)
شفیق سلیمی (پاکستان)
طاہر نقوی (پاکستان)

طارق بٹ (پاکستان)
سوہن راہی (یو.کے.)
فہیم اختر (یو.کے.)
امجد مرزا امجد (یو.کے.)
پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی (امریکا)
حامد امروہوی (امریکا)
ذرہ حیدرآبادی (امریکا)
معین کرمانی (کینیڈا)
ڈاکٹر بلند اقبال (کینیڈا)
فیصل نواز چودھری (ناروے)
افتخار راغب (قطر)
صبیحہ صبا (متحدہ عرب امارات)
افروز عالم (کویت)

سال اشاعت: ۲۰۱۳ء

شمارہ نمبر : ۱۶

سرنامہ خطاط : انور جمال

سرورق وکمپوزنگ: عظمیٰ اسکرین

فی شمارہ : سو روپے

زرسالانہ : پانچ سو روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

تاعمر خریداری (ہند): دس ہزار روپے

تاعمر خریداری: دیگر ممالک بیس ہزار روپے

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ

کے ذریعے زرِ رفاقت ان نمبروں اور پتوں پر ارسال کریں۔

- Tahreek-e-adab IFSC IOBA 0001968 Current A/c 19680200000440
- Jawed Ahmad IFSC IOBA 0001968 A/c 19680100000568

Indian Overseas Bank, Glenhill School Ext. Counter, Manduadeeh Bazar, Varanasi-221103 (U.P.) India

ازراہِ کرم زرِ رفاقت کرنسی کی صورت میں لفافے میں رکھ کر ہرگز ہرگز ارسال نہ فرمائیں، پیسے راستے میں ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ تخلیق کے ساتھ اپنا فون نمبر یا ای-میل اور اگر ممکن ہو تو دونوں ہی درج کرنے کی زحمت فرمائیں۔ عنایت ہوگی۔

مراسلت کا پتہ

Jawed Anwar

Urdu Ashiana

167, Afaq Khan ka Ahata, Manduadeeh Bazar

Varanasi-221103 (U.P.) India

Mobile: 0091-993-595-7330 e-mail: jaweanwar@gmail.com

- اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
- متنازعہ فیہ تحریر/تقریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔
- تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف الہ آباد کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے مہاویر پریس، وارانسی سے چھپوا کر اردو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے شائع کیا۔

غیر ممالک میں تحریک ادب

ممالک	فی شمارہ	چار شمارے
کویت	۵/دینار	۲۰/دینار
متحدہ عرب امارات	۵۰/درہم	۲۰۰/درہم
سعودی عرب	۵۰/ریال	۲۰۰/ریال
قطر	۵۰/ریال	۲۰۰/ریال
امریکا	۲۰/ڈالر	۸۰/ڈالر
کینیڈا	۲۶/ڈالر	۱۰۰/ڈالر
انگلینڈ	۱۳/پونڈ	۵۰/پونڈ
پاکستان	۷۰۰/روپے	۲۸۰۰/روپے
ناروے	۲۰/امریکی ڈالر	۸۰/امریکی ڈالر
فرانس	۲۰/امریکی ڈالر	۸۰/امریکی ڈالر
آسٹریلیا	۲۰/امریکی ڈالر	۸۰/امریکی ڈالر
دیگر ممالک	۲۰/امریکی ڈالر یا اس کے برابر رقم	۸۰/امریکی ڈالر یا اس کے برابر رقم

نوٹ: بیرونی ممالک کے خریدار زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ یا چیک سے بھیجتے وقت بینک کمیشن کی مناسب شرح بھی زرِ سالانہ میں شامل کر لیں۔

ترتیب

عبدالقیوم آس بھدرواہی

ڈوڈہ

حمد

زندہ دلی کتنی یہاں دشوار ہے یا رب
جیسے کہ سونے کی کوئی تلوار ہے یا رب

بچپنا یہاں محال ہے انسان کا اب تو
مغرور جوانی بڑی عیار ہے یا رب

مشکل ہمارے ساتھ لگی ہے بڑھاپے میں
ہر ایک قدم پر نیا آزار ہے یا رب

اپنے تھے جو بھی آج وہ سب غیر ہو گئے
اب کس کو سمجھیں صاحب کردار ہے یا رب

ہے چار سو پھیلا ہوا اب ایک دھواں سا
کیوں گرم ہر سو لوٹ کا بازار ہے یا رب

ہر خواب الٹے سیدھے ہی اب دیکھتے ہیں ہم
دل اپنا حقائق سے بھی بے زار ہے یا رب

تیرے ہی حکم سے یہاں ہر پتا ہے ہلتا
تو ہی تو سب کا مالک و مختار ہے یا رب

بس نامۂ اعمال ترے آس کا ہے یہ
دل اپنا خطاؤں کا اک انبار ہے یا رب

20, Pamposh Colony, Janipura,
Jammu-180007 (J&K)

محمد یعقوب بٹ صیاد بھدرواہی

ڈوڈہ

نعت

مدینے کو جاؤں تمنا یہی ہے
شرف ایسا پاؤں تمنا یہی ہے

ہے زخموں سے دل پارا پارا یہ میرا
نبی ﷺ کو دکھاؤں تمنا یہی ہے

کہانی تو میری بھری ہے دکھوں سے
انہیں بھی سناؤں تمنا یہی ہے

مدینے کی گلیوں میں کرلوں بسیرا
میں واپس نہ آؤں تمنا یہی ہے

جہاں نقش پا آپ کے یا نبی ﷺ ہیں
وہاں سر جھکاؤں تمنا یہی ہے

مدینے میں آکر سکوں دل کا پاؤں
میں ہر غم بھلاؤں تمنا یہی ہے

قیامت کے دن آپ کی کملی والے
ملے مجھ کو چھاؤں تمنا یہی ہے

یہی خواب صیاد روضے پہ جاکر
میں آنسو بہاؤں تمنا یہی ہے

R/o Village Sharekhi, A/P Shingli, Teh.
Bhadrawah-182222 Distt. Doda

مقصود احمد تبسم
دبئی

گوشہائے مبارک

چاند جھکتا ہے تو سجدے کی صدا سنتے ہیں
آپ ﷺ کے کان اشارے کی صدا سنتے ہیں
بطن مادر میں ہیں، جنبش میں ہے قدرت کا قلم
لوح محفوظ پہ لکھنے کی صدا سنتے ہیں
پتھروں اور درختوں کی سنیں تسلیمات
آپ ﷺ آداب کے لہجے کی صدا سنتے ہیں
اونٹ فریاد کرے یا ہو ندا ہرنی کی
ہر مویشی کے بلکنے کی صدا سنتے ہیں
میرے آقا ﷺ نے انہیں دیکھا ہے بیعت بھی کیا
آپ ﷺ جنات کے آنے کی صدا سنتے ہیں
اپنے اصحاب کی جھرمٹ میں زمیں پر بیٹھے
در افلاک کے کھلنے کی صدا سنتے ہیں
ہم کلامی کا شرف پایا ہے معراج کی شب
نور توحید کے جلوے کی صدا سنتے ہیں
معرکوں میں بھی وہ پہنچاتے ہیں غیبی امداد
آپ ﷺ اصحاب کے گھرنے کی صدا سنتے ہیں
سجدہ ریزی میں ہوں مصروف ملائک جس دم
اس گھڑی عرش کے دبنے کی صدا سنتے ہیں
آپ ﷺ کے ہجر میں جب خشک تنا ہو بے تاب
اس کے رونے کی، سسکنے کی صدا سنتے ہیں
وحی حق آنے کی آواز جرس ایک طرف
پر جبریل کے ہلنے کی صدا سنتے ہیں
گذریں گر جعفر طیار فرشتوں کے ساتھ
اس جماعت کے گزرنے کی صدا سنتے ہیں
بنو نجار کی قبروں سے ہو جب ان ﷺ کا گزر
ایک اک گور سے رونے کی صدا سنتے ہیں
پھول اس واسطے کھلتے رہے خاموشی سے
آپ ﷺ کے کان چٹکنے کی صدا سنتے ہیں
جانور پیش کریں خود کو سواری کے لیے
بے زبانوں کے مچلنے کی صدا سنتے ہیں
اپنی بے نطق دعاؤں کا مجھے غم کیوں ہو
میرے سرکار ﷺ تو گونگے کی صدا سنتے ہیں
جب حجر نار جہنم کی تہوں میں پہنچے
اس کے گہرائی میں گرنے کی صدا سنتے ہیں
شب معراج نبی ﷺ خلد بریں میں اے بلال
آگے آگے تیرے چلنے کی صدا سنتے ہیں
ہر کوئی سامنے یا قرب سے سن سکتا ہے
آپ ﷺ دیوار کے پیچھے کی صدا سنتے ہیں
آئی آواز نصرت تو کہا تھا لبیک
بیٹھے طیبہ میں ہیں، کے کی صدا سنتے ہیں
غیر محدود ہے اعجاز سماعت کا محیط
سائنسی دور سے آگے کی صدا سنتے ہیں
قبر پر نور پہ ملنے کے لیے آ بدوی
آپ ﷺ دیدار کے پیاسے کی صدا سنتے ہیں
یار غار آتے ہیں جس وقت کفن میں لپٹے
اذن فرماتے ہیں آنے کی صدا سنتے ہیں
جس طرح آپ ﷺ حیاتی میں سماعت کرتے
اس طرح آج بھی لمحے کی صدا سنتے ہیں
میرا ایمان ہے مقصود کہ آقا ﷺ میرے
فکر کو شعر میں ڈھلنے کی صدا سنتے ہیں

R/o Village Sharekhi, A/P Shingli, Teh.
Bhadrawah-182222 Distt. Doda

مہدی پرتاپگڑھی
پرتاپگڑھ

نعت

خلیل خدا کی وہی تو دعا ہیں
نوید مسیحا، دلیل خدا ہیں
وہ محبوب رب ہیں بڑا ان کا رتبہ
وہ خیر البشر ہیں شہ دوسرا ہیں
پڑے کس تردد میں ہو دنیا دارو
سنو کم نگاہو! وہی رہنما ہیں
لگائیں گے وہ پار کشتی بشر کی
ہمارے سفینے کے وہ ناخدا ہیں
انہیں حق کے دشمن نہ پہچان پائے
وہ انساں کے پیکر میں نور خدا ہیں
انہیں رب نے خلوت میں دی باریابی
وہ راز و نیاز خدا آشنا ہیں
پڑھا کنکروں نے بھی کلمہ خدا کا
نہ بوجہل سمجھا یہ اسرار کیا ہیں
پلٹ آیا سورج اشارے پہ ان کے
رسول خدا، صاحب معجزہ ہیں
وقار ان سے دنیا کا قائم ہے مہدی
بنی نوع آدم کے وہ رہنما ہیں

28, School Ward, Pratapgarh-230001 (U.P.)
Cell: 07897192460

اشرف عادل
سرینگر

نعت

انسانیت تھی چاک گریباں کیے ہوئے
وہ آئے مشکلات کو آساں کیے ہوئے
عرش بریں پہ جشن کا منظر تھا رات بھر
وہ ایک شب تلاوت قرآں کیے ہوئے
گیسو دراز، دل کا غنی، ہاتھ میں شفا
بیٹھے ہیں ہم تصور جاناں کیے ہوئے
سب بت روایتوں کے گرے منھ کے بل سنو
جگ تھا تکلفات کا ساماں کیے ہوئے
افکار کے تمام سمندر سراب تھے
وہ آئے موج موج کو طوفاں کیے ہوئے
حضرت معاف کرتے رہے دشمنوں کو بھی
افلاک کے مزاج کو داماں کیے ہوئے
وہ آہ بھی کرے تو زمیں پر فلک گرے
چلتے رہے جراحت پنہاں کیے ہوئے
سایہ کیا ہے ابر گریزاں نے ہر قدم
اک شخص قدسیوں کو بھی حیراں کیے ہوئے

قربانی کا تصور اور ہمارا معاشرہ

مولانا وحید الدین خاں (نئی دہلی)

عیدالاضحیٰ کے موقع پر ہر سال جو قربانی کی جاتی ہے، اس کا تعلق انسانی زندگی سے بہت گہرا ہے۔ وہ صحت مند زندگی کی تعمیر کی علامت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں قربانی ایک سالانہ رسم بن کر رہ گئی ہے۔ اب وہ ایک بے روح مذہبی روایت کے طور پر زندہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ سال کے مخصوص دنوں میں رسمی طور پر جانور تو ذبح کر دیتے ہیں مگر اس کا کوئی اثر ان کی زندگیوں میں نظر نہیں آتا۔ قربانی کا عمل اگر زندہ اسپرٹ کے ساتھ کیا جائے تو ہمارا پورا معاشرہ بالکل بدل جائے۔

قرآن میں قربانی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اللہ کو اس کا گوشت اور اس کا خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے (الحج ۳۷)۔ گوشت اور خون جانور کے جسم میں ہوتا ہے جس کو ذبح کیا جاتا ہے اور تقویٰ اس آدمی کی چیز ہے جو ذبح کرنے والا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اگر چہ جانور کو خدا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، مگر یہ حقیقتاً اپنے آپ کو خدا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں قربانی جانور کا ذبیحہ نہیں بلکہ خود اپنا ذبیحہ ہے۔ یہ ذبح ہونے والے سے زیادہ ذبح کرنے والے کی تصویر ہے۔ بظاہر وہ ایک خارجی عمل ہے مگر باعتبار حقیقت وہ ایک اندرونی عمل ہے۔ اسی شخص کی قربانی صحیح ہے جس کی ظاہری قربانی اس کی اندرونی قربانی میں ڈھل جائے۔

جانور کو ذبح کر کے آدمی اپنے اس ارادہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خدا کی خاطر اپنی انا کو ذبح کرے گا۔ وہ اپنے مفادات کو قربان کر کے سچائی کے طریقہ پر قائم رہے گا۔ وہ مصلحتوں کو نظر انداز کر کے خدا کے حکم پر چلنے والا بنے گا۔ اس کا نفس اگر خدا کے راستہ میں چلنے میں رکاوٹ بنے گا تو وہ اپنے نفس پر چھری چلا دے گا مگر خدا کے راستہ سے ہٹنا گوارہ نہیں کرے گا۔ ایک اور مقام پر قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو (الکوثر)۔ یہ آیت ایک اعتبار سے، دین کے دو پہلوؤں کو بتاتی ہے۔ ایک عجز و تواضع، اور دوسرے ایثار و قربانی۔ نماز عجز کی علامت ہے اور جانور کا ذبیحہ قربانی کی علامت۔ یہ گویا دو بنیادیں ہیں جن کے اوپر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

ایک اعتبار سے اس کو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں عجز مطلوب ہے، اور

بندوں کے مقابلہ میں قربانی درکار ہے۔ اللہ بڑا ہے، ہم چھوٹے ہیں۔ اللہ دینے والا ہے، ہم پانے والے ہیں۔ اللہ آقا ہے۔ ہم اس کے بندے ہیں۔ اس اعتبار سے اللہ کے مقابلہ میں واحد چیز جو مطلوب ہوسکتی ہے، وہ عجز و تواضع ہی ہے۔ یہی بندے کا کمال ہے کہ وہ اپنے بے کمال ہونے کو پا لے، وہ اللہ کے مقابلہ میں عاجزی اور فرماں برداری کا طریقہ اختیار کرے۔ قربانی کا عمل کئی اعتبار سے بندوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اس اخلاقی برتاؤ اور انسانی سلوک کا خلاصہ ہے جو قربانی کرنے والے کو اپنے معاشرہ کے اندر پیش آتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسماعیل کو ذبح کرنے کے لیے لٹانا چاہا تو حضرت اسماعیل نے اپنے مقدس باپ سے کہا کہ آپ کو خدا کی طرف سے جو حکم ملا ہے، اس کو کر ڈالیے، انشاء اللہ آپ مجھ کو صبر کرنے والا پائیں گے (الصافات ۱۰۲)۔ اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کی حقیقت صبر ہے۔ قربانی اس کے بغیر انجام نہیں پاسکتی کہ آدمی پوری طرح صبر و برداشت کرنے والا بن جائے۔ قربانی کر کے آدمی علامتی طور پر اپنے اس ارادہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں حضرت اسماعیل کی طرح صبر کرنے والا بنے گا۔

صبر اچھے معاشرہ کی واحد بنیاد ہے۔ صبر کے بغیر کبھی صالح اور صحت مند معاشرہ نہیں بن سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بہت سے آدمی مل کر رہتے ہیں تو ان میں بار بار ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو ایک دوسرے کے لیے ناخوشگواری کا باعث ہوتی ہیں۔ ایسا ایک گھر کے اندر بھی ہوتا ہے۔ ایک بستی میں بھی ہوتا ہے اور ایک پوری قوم میں بھی ہوتا ہے۔ ایک کمرہ میں پتھر کے بہت سے اسٹیچو رکھے ہوئے ہوں تو ان کے درمیان آپس میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوگا۔ مگر جہاں زندہ انسان بستے ہوں، وہاں اختلاف اور شکایت کا پیش آنا ضروری ہے۔ ایسی حالت میں معاشرہ کو انتشار اور فساد سے بچانے کا واحد راز یہ ہے کہ اس کے افراد کے اندر صبر کا مادہ ہو۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں کو برداشت کرلیا کریں۔ لوگ شکایتوں سے اوپر اٹھ کر ایک دوسرے سے معاملہ کریں۔

یہ صبر ہمیشہ قربانی مانگتا ہے۔ قربانی کے بغیر صبر و برداشت کا رویہ ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرہ کے اندر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے رویہ سے کسی کے وقار کو ٹھیس لگتی ہے۔ کسی کا سلوک کسی کی انانیت کو بھڑکا دیتا ہے۔ کسی کی کوئی روش کسی کے لیے اشتعال پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ ایسے ہر موقع پر گویا آدمی کے اندر ایک حیوان جاگ اٹھتا ہے۔ اب آدمی کو اپنے اندر جاگنے والے اس حیوان کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ اس اندرونی حیوان کی قربانی ہی دراصل حقیقی قربانی ہے۔ کیونکہ اسی قربانی سے سچی حق پرست زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی وہ صالح معاشرہ بنتا ہے جس کو حقیقی معنوں میں صالح اور صحت مند معاشرہ کہا جاسکے۔

اختلاف اور شکایت کے مواقع پر جاگنے والے اندرونی حیوان کو ذبح کرنا ہی وہ اصل قربانی ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ اس قربانی کو پیش کر کے آدمی اس اعلیٰ عمل کا ثبوت دیتا ہے جس کو قرآن میں تقویٰ (الحج ۳۷) کہا گیا ہے۔

جب آدمی اس نفسیاتی حیوان کی قربانی دیتا ہے، اس کے بعد ہی اس کے اندر وہ مطلوب صفت پیدا ہوتی ہے جس کو صبر کہا گیا ہے۔ صبر و برداشت اور عفو و اعراض صالح معاشرہ کے قیام کے لیے ناگزیر طور پر ضروری ہیں۔ اور یہ صفتیں اندرونی حیوان کو ذبح کرنے کے بعد ہی حقیقی طور پر کسی کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن میں قربانی کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ لوگ حج کے لیے آئیں اور چند معلوم دنوں میں ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں دیے ہیں۔ پس تم اس میں سے کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو کھلاؤ۔ (الحج ۲۸)

اس آیت سے قربانی کے دو مزید پہلو معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے جو چیزیں انسان کو دی ہیں، خواہ وہ ذبیحہ کا جانور ہو یا کوئی اور ضرورت کی چیز، ان سب کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔ چیزوں کے استعمال پر اللہ کا نام لینا، دراصل اس واقعہ کا اعتراف کرنا ہے کہ یہ سب چیزیں براہ راست خدا کا عطیہ ہیں۔ اس نے انسانوں کی حاجت اور ضرورت کے لیے یہ تمام چیزیں پیدا کر رکھی ہیں۔ اب ہم سے یہ مطلوب ہے کہ ہم ان کو خدا کا عطیہ سمجھ کر انہیں استعمال کریں نہ کہ ان کو اپنی عقل یا اپنے دست و بازو کا کارنامہ سمجھ لیں۔

قربانی کے موقع پر جو جانور ذبح کیا جاتا ہے، اس کے متعلق حکم ہے کہ اس کو کھاؤ اور کھلاؤ۔ اس طرح قربانی کا عمل آدمی کے اندر فیاضی اور باہمی ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی اسپرٹ ابھارتا ہے۔ وہ سبق دیتا ہے کہ تم خود کھانے پر اکتفا نہ کرو بلکہ دوسروں کو بھی کھلاؤ۔ تم اپنی کمائی کو صرف اپنی چیز نہ سمجھ لو بلکہ اس میں دوسروں کا بھی حصہ سمجھو۔ تم صرف اپنا معاملہ درست کر کے مطمئن نہ ہو جاؤ بلکہ دوسروں کے معاملات میں بھی درست کرنے کی کوشش کرو۔ تم ایک انفرادی انسان بن کر نہ رہو بلکہ معاشرہ کے ایک مفید فرد کی حیثیت سے زندگی گزارو۔ تم انسانیت کے کل کا ایک صالح جز بن جاؤ۔

ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ قربانی ایک زندہ عمل ہے، نہ کہ محض ایک بے روح قسم کی تاریخی رسم۔ قربانی کا پیغام یہ ہے کہ اپنے وجود کے حیوانی حصہ کو دباؤ اور اپنے وجود کے انسانی حصہ کو زندہ کرو۔ یہی قربانی کی اصل حقیقت ہے اور یہی قربانی کا اصل پیغام۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ ایک عظیم مصلّح

مسرت جبین (راجوری)

آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں جب مسلمان قوم تاتاریوں کے ہاتھوں بری طرح تباہ و برباد ہو چکی تھی ، ہر طرف ظلم و جبر اور بدعات وخرافات کا دور دورہ تھا، ایسے پرآشوب اور تاریک دور میں اسلام کے ایک عظیم مرد مجاھد نے اپنی اصلاحی کاوشوں کا علم بلند کیا اور بڑی ہمت اور دلیری کے ساتھ میدان میں کود پڑے اور بدعات وخرافات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسلام کی گرتی ہوئی دیوار از سرنو قائم کی۔ اس عظیم شخصیت کا نام نامی شیخ الاسلام تقی الدین ابوالعباس احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہ نمیری رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ آپ آٹھویں صدی ہجری کے عظیم مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، نقاد اور مرد مجاہد تھے۔

اس عالم جلیل نے ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ بروز پیر علم وادب کے مرکز شہر حران کے ایک باوقار علمی اور مذہبی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ آپکے والد ماجد شیخ عبدالحلیم بلند پایہ عالم تھے، ان کے علم کا دور دور تک شہرہ تھا وہ دمشق کی جامع اعظم میں مسند تعلیم و تدریس اور وعظ وارشاد پر فائز تھے۔ اسکے علاوہ دارالحدیث سکریہ کے شیخ بھی تھے۔ آپکے دادا مجد الدین بھی بڑے عالم تھے، فقہ حنبلی کے ائمہ میں انکا شمار ہوتا تھا۔ آپکے چچا فخر الدین بھی ایک بلند پایہ خطیب اور واعظ تھے۔

امام ابن تیمیہ نے ایسے علمی وادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اپنے والد کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھنے لگے۔ اللہ رب العالمین نے آپ کو بے پناہ ذہانت و فطانت اور غیر معمولی قوت حافظہ سے نوازا تھا، آپکی غیر معمولی قوت یادداشت کا دور دور تک شہرہ تھا۔ بچپن میں ہی آپنے قرآن مجید حفظ کر لیا، اسکے ساتھ حفظ حدیث ولغت اور فقہ کی طرف متوجہ ہوئے اور اسکا ایک بڑا حصہ لفظ بر کر لیا۔ حدیث میں آپ نے سب سے پہلے جو کتاب حفظ کی وہ امام حمیدی کی کتاب الجمع بین الصحیحین ہے، اس کے علاوہ مسند احمد، صحیح بخاری، مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داوود، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ کی بار بار سماعت کی۔ حدیث کے علاوہ آپکو دوسرے علوم میں بھی غیر معمولی دلچسپی تھی۔ علوم

عربیہ، علوم ریاضی فن نحو اور علم کلام وغیرہ میں کمال حاصل کیا۔ ان علوم کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف آپ تفسیر قرآن کے اسرار و رموز کو حل کرنے میں مصروف رہے۔ اس سلسلے میں آپ نے تمام متعلقہ کتب اور علوم پڑھ ڈالے، ایک ایک حرف کا پوری توجہ سے مطالعہ کیا۔ غرض کہ امام ابن تیمیہ نے اس زمانے میں رائج تمام علوم حاصل کیۓ اور علم وادب کا کوئی ایسا مرکز نہیں چھوڑا جسکے دروازے پر آپ نے دستک نہ دی ہو، آپ نے تقریباً دوسو سے زائد اساتذہ کے آگے زانوتلمذ تہہ کیا۔

جب آپکی عمر ۲۱ برس ہوئی تو مشفق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کی وفات کے بعد آپ مسند تدریس پر فائز ہوئے اس وقت آپکی عمر صرف ۲۲ سال تھی، لیکن والد کی جانشینی کا حق آپ نے ادا کر دیا۔ آپکے حلقہ درس میں ہر قسم کے لوگ شریک ہوتے تھے، آپ کے مخالف بھی اور آپ کے حامی بھی۔ لیکن جو بھی آپ کی محفل میں آتا تھا آپ کا مداح اور ثناخوان بن کر جاتا تھا۔ جب آپ تمام طرح کے علمی اسلحہ سے لیس ہو کر مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوتے تھے تو بڑے بڑے ائمہ حیران رہ جاتے تھے۔ آپ کی زبان کو اللہ تعالی نے ایسی عطا کی تھی کہ جو بات بھی کرتے تھے سیدھی دل میں اتر جاتی تھی، اور سامنے والا مجبوراً دل واحساس آپ کو سونپ جاتا تھا۔ بڑے بڑے علماء نے آپکی علمی لیاقت اور مؤثر انداز بیاں کا لوہا مانا ہے۔ محدث کبیر ابن دقیق العید جو اپنے زمانے میں فن حدیث اور علوم عصری میں حجت کی حیثیت رکھتے تھے امام ابن تیمیہؒ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"یہ ایسا شخص میری نظر سے گزرا ہے کہ سارے علوم ہاتھ باندھے
اسکے سامنے کھڑے رہتے ہیں، علوم کے خزانہ عامرہ میں سے جسے چاہتا ہے
ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے رد کر دیتا ہے۔"

(حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ، تالیف محمد ابوزہرہ (مصر) ترجمہ: سید رئیس احمد جعفری ندوی، ص ۶۸)

اللہ رب کریم نے آپ کو بے پناہ ذہانت وفطانت سے نوازا تھا، ذہانت اور علمی لیاقت کے ساتھ ساتھ آپکی زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ آپ نے اپنے دور کے کئی علماء کے ساتھ علمی مناظرے بھی کیۓ اور حکومت وقت کے ساتھ مل کر تاتاریوں اور باغیوں کے خلاف عملی جہاد بھی کیا۔ امام صاحب صرف گفتار کے غازی ہی نہیں بلکہ کردار کے غازی بھی تھے، وہ صرف جہاد کے مبلغ اور داعی نہ تھے مجاہد صف شکن بھی تھے۔ آپ ایک بے باک اور نڈر شخصیت کے مالک تھے، اللہ کی ذات کے علاوہ کبھی کسی کے آگے سر نہیں جھکایا۔ بڑے بڑے ظالم و جابر ملوک وسلاطین کے سامنے بڑی بے جگری اور بے خوفی کے ساتھ اعلان کلمۃ الحق کیا، ایک بار ایک وفد کی قیادت کرتے ہوئے شاہ تاتار غازان کے دربار میں تشریف لے گئے اور بادشاہ کے سامنے بڑے پر جوش انداز میں عدل وانصاف

کی خوبیاں بیان کیں، آپکی تقریر اتنی سخت تھی کہ پورے وفد کو آپکے قتل ہو جانے کا یقین ہو چلا تھا لیکن غازان آپکی بارعب شخصیت، جرأت مندی اور حق گوئی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے آپکو قتل کرنے کے بجائے امراء کے سامنے آپکی تعریف کی اور دعاؤں کی درخواست کی۔ اگر ایک طرف آپکے مداحوں اور جان نثار کرنے والے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی تو دوسری طرف حاسدوں کی بھی ایک بڑی جماعت تھی جو آپکی شہرت کو دیکھ کر جلتی تھی اور ہمیشہ آپ پر الزام تراشی کرتی تھی۔ لیکن آپ کسی دباؤ اور خوف کی پرواہ کیے بغیر اپنے مشن میں ڈٹے رہے، اس مشن میں آپکو بے پناہ مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا لیکن حوادث و مصائب کا پوری عزیمت اور ہمت سے مقابلہ کرتے رہے۔ اپنے بعض فتوؤں کی وجہ سے آپکو ایک مدت تک قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں حتی کہ آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام بھی قید میں ہی گزارے اور بالآخر ۲۰ ذوالقعدہ ۲۸ءھ یہ عظیم مرد مجاہد، مصلح قوم، مجدد اور آسمان علم وادب کا درخشاں ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

امام ابن تیمیہؒ کی ذات گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی، آپکی ذات مجمع علوم وفنون، منبع حرب و پیکار اور ذخیرہ گفتار و کردار تھی۔ وہ کون سا کمال تھا جو امام ابن تیمیہؒ کی ذات میں مجتمع نہیں تھا، وہ کون سا جوہر تھا جسے ابن تیمیہؒ کی ذات سے انتساب پر فخر نہ تھا، وہ کونسی خوبی تھی جو ابن تیمیہؒ کے وجود پر نازاں نہ تھی۔ آپ ایک سحر طراز انشا پرداز، شعلہ نوا خطیب، بلا کے ذہین اور عظیم نقاد تھے۔ امام ابن تیمیہؒ کی اصلاحی تحریک کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ اسلام نمایاں ہو اور وہ اسلام ابھرے جو صدر اول کا اسلام تھا۔ جس پر صحابہ کرام عامل تھے، جو ہر قسم کے گرد و غبار اور بدعات و خرافات سے پاک و صاف تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو نام نہاد علماء کے ہتھکنڈوں اور جمود و تقلید سے باہر نکالا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپکی زیادہ تر تصانیف کا موضوع یہی چیز ہے۔ امام صاحب کی اصلاحی تحریک کا اور انکی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک جرمن اسکالر لکھتا ہے:

> ''اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو عظیم الشان تحریک امام ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) سے شروع ہوئی اور جس میں اسلام کے اصلی و حقیقی رجحانات پوری طاقت سے ظاہر ہوئے، اس نے کثیر اندرونی و بیرونی خطروں کے مقابلے میں اسلام کی خود اعتمادی کا زبردست ثبوت پیش کیا ہے، جو تیرھویں صدی عیسوی میں اسلام کے وجود کو لاحق تھے۔ صلیبی جنگوں اور ان سے بھی زیادہ تاتاری یلغاروں نے مسلمانوں کی قوت کو مفلوج اور انکی خود اعتمادی کو

بہت مضمحل کر دیا تھا۔ ابن تیمیہ (رحمۃ اللہ) اور ان کے تلامذہ اپنی دعوت کی ذمہ داریاں اٹھانے کی پوری اہلیت رکھتے تھے، وہ بڑے ہی پر جوش و سرگرم تھے۔ انھوں نے بڑی مردانگی کے ساتھ اپنے عقائد کا اعلان کیا، ایسا اعلان جو عظیم خیالات کے زیر اثر انسان ہی سے ممکن ہے۔"

یہی اسکالر ایک دوسری جگہ رقم طراز ہے:

"اسلام، رومن کیتھولک مسیحیت کی طرح ہو گیا تھا مگر ابن تیمیہ نے اسکی از سر نو تجدید کر دی۔"

Book: Contibution to the History of civilisation writer: Kremer)
Alfred ترجمہ: صلاح الدین بخش بیرسٹر)

الغرض شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اسلام کی بے پناہ خدمت کی، آپ نے اپنے پیچھے کتب و رسائل کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے جو متعدد علمی عنوانات پر مشتمل ہے، امام صاحب کی بعض تصانیف تفسیر پر، بعض فقہ و اصول پر، بعض کلام پر اور بعض مخالفین سے مناظرات پر مشتمل ہے۔ آپ کا جہاد صرف زبان و قلم تک محدود نہ تھا بلکہ میدان کارزار میں بھی آپ نے داد شجاعت حاصل کی۔ آپ اپنے زمانہ میں ایک ہلچل اور طوفان بن کر برپا ہوئے، آپ سنت رسول ﷺ کے سچے عاشق اور داعی تھے، نصرت دین کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ آپ کی گراں قدر اسلامی خدمات اور اس راہ میں آپ کی ناقابل فراموش جدوجہد کو تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔

Research Scholor Dept. of Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,

Rajouri (J&K)

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

M/o HRD, Deptt. of Higher Education, Govt. of India

Farogh-e-Urdu Bhawan

FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 Phone: 49539000

email: urducouncil@gmail.com

قومی اردو کونسل کی چند اہم مطبوعات

لفظ سازی

مصنف: علی رفاد فتیحی

لفظ سازی لسانیات کا ایک اہم شعبہ ہے، لسانیات کے نقطۂ نظر سے سلسلۂ کلام کو جن اکائیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ان میں ایک 'لفظ' ہے، لہٰذا فن سازی تشکیل لفظ کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ زبان میں لفظ کی حیثیت مقدم ہوتی ہے، زبانوں میں الفاظ و استعمالات کی تبدیلی زبان کی صحت کی علامت ہے لہٰذا لفظ سازی کا اصول ایک ناگزیر ضرورت ہے اس سے طلبہ و اساتذہ کو واقف ہونا چاہیے، علی رفاد فتیحی کی کتاب 'لفظ سازی' انھی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے، اس میں 'مستعاریت' اور اس کے صوتی و معنوی جہات، اشتقاقیت، تصریفیت، ترکیبیت، توسیعیت، اسمیت اور تقلیبیت جیسے اہم طریقۂ کار کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے، کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں امدادی لفظ اور لغی لفظ کا لسانی فرق، اصول اشتقاق، تراکیب لفظی، مستعاریت بہ طور اصول لفظ سازی اور اسمیت کی بحثیں شامل ہوئی ہیں، لسانیات کے طلبہ، اساتذہ بطور خاص اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ و اساتذہ کے لیے یہ کتاب لفظ سازی کے باب میں مفید تر ہے۔

صفحات ۱۰۲، قیمت ۵۹/روپے

نور جہاں بیگم: شخصیت اور کارنامے

مصنف: ابوسفیان

ہندوستانی تہذیب وتمدن کی تعمیر وتشکیل میں خواتین کلیدی اہمیت رکھتی ہیں۔ مغلیہ عہد کی خواتین میں شہنشاہ نورالدین جہانگیر کی ملکہ نور جہاں کا نام اس اعتبار سے بڑا روشن ہے۔ انھیں مورخین نے 'مقدر کی ملکہ' کہا ہے۔ ایک عظیم ملکہ کی حیثیت سے نور جہاں نے مغلیہ دربار کے وقار اور دبدبہ میں اضافے کے ساتھ اپنے عہد کی سماجی و ثقافتی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا، شہنشاہ سے غیر معمولی محبت اور اعتماد کی بدولت انھیں نورمحل اور نور جہاں کے خطاب سے نوازا گیا۔ نور جہاں بیگم کی شخصیت اور ان کے کارنامے پر مشتمل ابوسفیان کی یہ کتاب دس ابواب میں نور جہاں کے شخصی کردار اور تاریخی واقعات کو پیش کرتی ہے، جس سے یہ حقیقت بخوبی عیاں ہوتی ہے کہ نور جہاں نہ صرف ایک حسین وجمیل خاتون تھیں بلکہ سیاسی بصیرت اور عسکری حکمت عملی تیار کرنے میں بھی ان کی کوئی نظیر نہیں تھی۔ اس کتاب سے نور جہاں کی زیبائش، لباس، زیورات، تعمیرات و باغبانی، بخشش اور سخاوت، نظم ونسق کی صلاحیت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

صفحات ۱۶۴، قیمت ۸۰/روپے

انسانی ارتقا

مصنف: ایم آر ساہنی، مترجم: احسان اللہ خان

ایم آر ساہنی کی یہ کتاب ان معنوں میں بڑی دلچسپ ہے کہ روایتی نوعیت سے ہٹ کر یہ کتاب انسانی ارتقا کے بارے میں اہم سائنسی حقائق کو اس کے مخصوص تکنیکی سیاق سے الگ کر کے آسان اور عام فہم زبان میں پیش کرتی ہے۔ ارضیات (Geology)، انسانیات (Anthropology) اور حیوانیات (Zoology) کی متعدد بحثوں پر مشتمل یہ کتاب سائنس کے طلبہ کو نسل انسانی کے نامیاتی اور عضوی ارتقا سے واقف کراتی ہے، یہ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں ارضیاتی اور انسانی تاریخ کا تقابل کرتے ہوئے ارتقا کے سنگ میل، اسباب ارتقا، عظیم برفانی دور یا یورپ۔ ہندوستان، پاکستان اور برما میں پلیٹوسین عصر، پتھر کا زمانہ اور یورپ، ہندوستان، پاکستان اور برما کی تہذیبیں، سری لنکا میں پلیٹوسین اور ماقبل تاریخ، حیوانات اعلیٰ، انسان کی نسلیں اور اس کے قریبی رشتے داروں پر بحث کی گئی ہے جو غور و فکر پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ کتاب نئے موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ، اساتذہ اور عام قاری کے لیے مفید ہے۔

صفحات: ۲۹۲ قیمت: ۳۰/۷۰ روپے

امراض اور ان کی حقیقت (حصہ اول)

مصنف: محمد ہشام صدیقی

یہ کتاب ماہیت الامراض سے متعلق طب جدید کے نظریات و تحقیقات کو باقاعدہ مربوط اور یکجا طور پر اردو زبان میں پیش کرتی ہے، تاکہ یونانی طب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نئی راہیں متعین کرنے میں آسانی ہو اور وہ نہ صرف علم الامراض کے شعبے میں مہارت حاصل کر سکیں بلکہ تمام طبی مسائل میں ان کا رویہ سائنٹفک تشریح اور تحقیقی ہو۔ یہ کتاب بنیادی طور پر تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول بطور خاص مرض کے اسباب و وجوہات، خلیہ اور اس کے افعال، نیز اس کے تغیرات سے بحث کرتا ہے، یہ کتاب امراض سے متعلق عام جزئیات کا احاطہ کرتی ہے۔ مرض کی علامتیں، مرض کی تحقیق، اصول تحقیق، تشخیص، ماہیتی اعمال، اسباب مرض، اقسام، جراثیم، تعدیہ اور قوت مدافعت، خلیہ، اجزائے خلیہ، جسم انسانی کی فطری اور طبعی تبدیلیاں، تغذیہ کے نقائص، فاقہ کشی اور اس کے اثرات وغیرہ جیسے وسیع موضوعات و جزئیات کے احاطے پر مشتمل یہ کتاب طب یونانی کے طلبہ، اساتذہ اور ماہیت الامراض سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید ہے۔

صفحات ۱۹۹، قیمت ۸۰/روپے

تاریخ ایجادات

مصنف: ایگن لارسن، مترجم: صالحہ بیگم

ایگن لارسن کی یہ کتاب انسانی تمدن کے ارتقائی سفر میں انسانی ضروریات کے بموجب انسانوں کی ایجاد کردہ مختلف النوع اشیا اور آلوں کی دلچسپ تاریخ پیش کرتی ہے، کتاب کی افادیت کے پیش نظر اسے انگریزی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے تاکہ اردو حلقہ تہذیب انسانی کے ارتقائی سفر میں انسانوں کی قدرت اختراع کی عجیب و غریب کہانی سے لطف اندوز ہو، ماقبل تاریخ (Prehistory)، پتھر کا زمانہ اور پھر عصر حاضر کی ترقی یافتہ تہذیب میں 'ایجادات و اختراعات سے انسانی زندگی میں غیر معمولی ترقی، سکون اور شائستگی آئی ہے، تین حصوں پر مشتمل یہ کتاب بالترتیب، آندھی، پانی، بھاپ اور صنعت، برق، جوہری توانائی، سورج سے براہ راست توانائی۔ نقل و حمل کے زمرے میں۔ پہیے، سڑکیں، پل، نہریں، ریل، سڑک پر مشینیں، پانی کا جہاز، ہوائی جہاز اور تار پیغامات، ریڈیو، تصاویر، محفوظ آوازیں، ٹیلی ویژن اور روزمرہ کے برقی آلات کا احاطہ کرتی ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔ بچوں کے علاوہ یہ کتاب والدین اور اساتذہ کے لیے بھی مفید ہے۔

صفحات ۳۹۹، قیمت ۱۲۶/روپے

مومن خاں مومن: حیات اور مطالعاتی ترجیحات

مصنف: معید رشیدی

معید رشیدی کی یہ کتاب کلاسیکی عہد کے ایک عظیم اردو شاعر مومن خاں مومن کے مطالعے پر مبنی ہے۔ مومن خاں مومن اردو غزل میں اپنے منفرد لب و لہجہ اور طرز اظہار کے لیے معروف ہیں۔ انہیں اردو غزل میں ایک رجحان ساز استاد کی حیثیت حاصل ہے۔ انیسویں صدی میں اردو شاعری میں ذوق اور غالب کے ساتھ مومن کا شہرہ بھی خوب رہا ہے۔ یہ کتاب مختلف مضامین، تذکروں اور دیگر ثقہ مراجع کی بنیاد پر لکھی گئی ہے، جو غیر جانب دارانہ انداز میں مومن فہمی کے باب میں افہام و تفہیم کی نئی راہیں روشن کرتی ہے۔ یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے، تذکرے، سوانح اور تواریخ کے تحت پہلا باب مومن کی سوانح کو مختلف تذکروں، سوانح اور تاریخی ماخذ کے حوالے سے پیش کرتی ہے، دوسرا باب 'تحقیق: مسائل اور صورت حال' ہے جب کہ تیسرا باب 'تنقید: رویے اور ترجیحات' پر مشتمل ہے، کتابیات، اشاریہ اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ یہ کتاب مومن فہمی کے باب میں اردو کے کلاسیکی شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید ہے۔

صفحات ۱۸۳، قیمت ۸۰/روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159، e-mail: ncpulsaleunit@gmail.com

میرے حصے کی دنیا

پرتپال سنگھ بیتاب

باب-۳

اکے پر سوار ہو کر ہم لوگ بس سٹاپ تک پہنچے۔ بس فیروز پور شہر سے آتی تھی اور جی ٹی روڈ پر رُکتی تھی، جہاں سے ہم لوگ اُس پر سوار ہو کر امرتسر تک گئے۔ امرتسر میں بس سے اُتر کر ہم لوگ دربار صاحب ہرمندر یعنی گولڈن ٹیمپل گئے۔ وہاں ضرور میرے ماں باپ نے اپنی زِندگی کے اگلے پڑاؤ کے لئے دُعا کی ہوگی۔ گولڈن ٹیمپل دُنیا بھر کے سکھوں کے لئے ایک متبرک تیرتھ استھان ہے بلکہ ایک Archetype ہے۔ مجھے یاد ہے اِس سے پہلے بھی جب کبھی ہم لوگ فیروز پور سے جموں کے راستے پونچھ جاتے، راستے میں امرتسر ضرور رکتے۔ ہرمندر صاحب یعنی گولڈن ٹیمپل کے دیدار کرنے کے لئے۔

امرتسر سے ہم ہمیشہ کی طرح سورج ٹرانسپورٹ کی بس پر جموں کے لئے روانہ ہوئے۔ جموں میں ہم لوگ ہمیشہ میری ایک خالہ راج کور کے ہاں رُکتے جو ہمارے لئے بالکل ماں کی طرح تھی۔ اُن کا گھر ہمارے لئے ہمیشہ جموں میں رہنے کا ٹھکانہ ہوتا۔ خالہ راج کور ایک اسکول ٹیچر تھی جو جموں کے ایک سرکاری سکول میں پنجابی زبان وادب کا مضمون پڑھاتی تھی۔ اُن کی بڑی بیٹی ترلوچن کور اور چھوٹے بیٹے سنت پال سنگھ ہمارے سگے بہن بھائیوں کی طرح تھے۔ راج کور دراصل میری ماں کی سگی چچیری بہن تھی لیکن اُن کا رِشتہ آپس میں سگی بہنوں سے بڑھ کر تھا۔ حالانکہ ہم لوگوں کو مستقل طور پر جموں میں ہی اپنا خیمہ لگانا تھا لیکن گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمیشہ کی طرح پونچھ جانے کا پروگرام تھا۔

جموں سے پونچھ آنے جانے والی ایک موٹر بس تھی جس کا نمبر تھا J&K 9033۔ دراصل اُس موٹر بس کے مالک میرے پتا جی تھے۔ اُسی بس میں ہم لوگ جموں سے پونچھ جارہے تھے۔ بس کو میری بڑی بہن کے خاوند یعنی میرے بہنوئی رگھبیر سنگھ چلا رہے تھے۔ جموں سے پونچھ ۲۵۰ کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ جموں سے قریب قریب ایک سو کلومیٹر کی دوری پر کالی دھار نام کے پہاڑ سے گزرتے ہوئے بس کی بریک فیل ہوگئی۔ جانے جیجا جی نے (جنہیں ہم لوگ بھیا جی کہتے تھے) کس حکمت عملی

کے تحت بس کو ایک بڑے ریت کے ٹیلے سے ٹکرا دِیا۔ بس اگر اُس ٹیلے پر نہ رُکتی تو نیچے میلوں دُور کھائی میں جا گرتی۔ ایک بڑے جھٹکے کے ساتھ مجھے احساس ہوا کہ حادثہ پیش آ چکا ہے۔ شاید موت سے یہ میرے ہوش میں میری پہلی ملاقات تھی۔ حالانکہ میری ماں اکثر بتایا کرتی تھی کہ بہت چھوٹی عمر میں (شاید ایک ڈیڑھ سال کی عمر میں) میں کسی بہت شدید بیماری کا شکار ہوا تھا۔ چھ مہینے تک میری حالت مردوں کی سی رہی۔ میری ماں کو دوسری عورتیں اکثر صلاح دِیا کرتی تھیں کہ وہ مجھے کہیں جا کے دفنا آئے کیونکہ میں تو قریب قریب مردہ ہی تھا۔ میری ماں کہتی جب تک اِس کے سانس میں سانس ہے میں اِس کا علاج کرواتی رہوں گی۔ آخر پونچھ کے فقیر چند نام کے کسی حکیم نے میرا علاج کیا اور میں دوبارہ جی اُٹھا۔ اِس کے علاوہ فیروز پور چھاونی میں ایک بار میں لگاتار تین مہینے تک ٹائی فائڈ نام کی موذی بیماری کا شکار رہا تھا جس کے دوران میرے زِندہ رہنے سے زیادہ مرجانے کے امکانات تھے۔

کالی دھار کے بس حادثے کے فوراً بعد مجھے ایک عجیب قسم کا احساس ہوا کہ شاید مجھے بچانے کی خاطر خدا نے بس کے باقی مسافروں کو بھی مرنے نہیں دِیا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ میرا وہم تھا یا میرے اندر کی آواز۔

پونچھ پہنچ کر معلوم ہوا کہ میرے دور کے ماموں اور میری فیروز پور کی چاہت کے سگے ماموں (جو اکثر مجھے پڑھانے فیروز پور ہمارے گھر آیا کرتے تھے) کی شادی عنقریب ہی ہونے والی ہے۔ وہ لوگ رِشتے میں تو میرے ننہال والے ہی تھے۔ ہم سب لوگ شادی کے دوران دو تین دِن گل پور نام کے گاؤں میں رہے (یہ گاؤں ہمارے اپنے گاؤں کھڑی دھرمسال سے سٹا ہوا ہے آج کل ''چکاں دا باغ'' نام کے مقام سے ہندوستان پاکستان کے درمیان چلنے والی بسیں اِسی گاؤں سے ہو کر گزرتی ہیں۔ شادی کے دو تین دِنوں میں موقعہ تھا اپنی چاہت سے بات کرنے کا لیکن ۱۵ سال کا لڑکا ۱۳ سال کی لڑکی سے اظہار محبت کی جرأت نہ کر سکا حالانکہ وہ اس کا بہت خواہاں تھا، بہت کوشش کر کے بس اُس سے پانی کا ایک گلاس مانگ سکا۔ اُس نے پانی پلا دِیا اور بس، دِل میں البتہ چراغِ محبت روشن رہا۔ غلط یا صحیح مجھے یہ گمان تھا کہ میرے والدین اور اُس کے والدین ایک نہ ایک دِن ہم دونوں کی ایک دوسرے سے شادی کروا ہی دیں گے۔ کئی بار سوچ چکا ہوں کہ شاید اُن دو تین دِنوں میں جو چوک ہو گئی اُس کا خمیازہ مجھے عمر بھر بھگتنا پڑا۔

اُنہی دِنوں میں نے اپنا گاؤں کھڑی دھرمسال پہلی بار اچھی طرح دیکھا۔ نیچے کی طرف میرے ننہال کی بستی جس کا نام محلہ دھنی تھا اور اُوپر پہاڑ کی طرف میرے باپ دادا کا محلہ کالابن تھا۔ بیچ

میں غضب کی خوشبودار زرخیز زمین جو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہماری زمینیں پاکستانی کشمیر کے بارڈر تک پھیلی ہوئی ہیں اور وہاں دس بیس قدم ادھر اُدھر بھٹک جانے سے آدمی پاکستان کے قبضے والے کشمیر میں پہنچ جاتا ہے۔

اُس زمانے میں اپنے گاؤں کھڑی دھرمسال تک ہم لوگ بے تارنام کے دریا کو پار کر کے ۵/۴ میل لمبے کٹھن پہاڑی راستوں سے ہو کر پیدل جاتے تھے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا (بلکہ خوابوں میں دیکھا کرتا تھا) کہ میرے گاؤں تک پکی سڑک پہنچ جائے۔ بہت بعد میں دریائے بے تار پر پکا پل بھی بن گیا۔ ہمارے گاؤں میں سڑکوں کا جال بھی بچھ گیا لیکن اُس وقت تک پانچ سو ہندو سکھ گھرانوں کا گاؤں پوری طرح سے مسلم گاؤں بن چکا تھا۔ گنتی کے پندرہ بیس گھرانے سکھوں کے یا ہندوؤں کے اُس گاؤں میں باقی رہ گئے ہیں۔ بیشتر ہندو سکھ زمینداروں نے اپنی زمینیں اپنے مزارعوں (جنہیں وہاں ہالی کہا جاتا ہے) کے ہاتھوں اونے پونے داموں بیچ ڈالی ہیں اور خود مہاجروں کی سی حالت میں یہاں وہاں بھٹکنا قبول کر لیا۔

مٹی کے ساتھ رِشتے ہمارے قدیم تھے   یہ اُن دِنوں کی بات ہے جب ہم مقیم تھے

کھڑی دھرمسال سے مجھے آج بھی محبت ہے۔ عین سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے ہمارا گاؤں ہم سے چھن چکا ہے۔ ہماری زمین ہمارے پاؤں کے نیچے سے کھسک چکی ہے۔ میرے باپ نے آخری عمر میں ہمارے حصے کی زمین مٹی کے بھاؤ بیچ ڈالی۔ لیکن میرا اب بھی جی کرتا ہے کہ کھڑی دھرمسال میں دس بیس کنال زمین خرید کر ایک چھوٹا سا فارم ہاؤس بناؤں اور وہاں جا کے آباد ہو جاؤں اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک، سرحد کے دونوں طرف سے ہر لمحہ چلتے ہوئے گولی بارود سے بے پرواہ ہو کر۔ یاد رہے کہ پونچھ کی سرحد پر دونوں طرف سے ٹک ڈم جاری رہتی ہے۔ حالات جنگ کے ہوں چاہے امن کے۔

فیروز پور چھاونی، پونچھ کا مودی خانہ اور کھڑی دھرمسال میرے دِل نگر کے وہ مقامات ہیں شاید جن کے پس منظر میں میں نے یہ شعر کہا ہوگا:

دِل میں آباد کچھ مقام تو ہیں   اِتنی فرصت مگر کہاں کہ رکیں

گردشِ ایام کا عالم تو یہ ہے کہ

منظر وہ اُس کے بعد پھر آیا کبھی نہ تھا   پیچھے بھی ہم نے رخش کو موڑا کبھی نہ تھا

گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم نے پہلی بار پونچھ کے راحت افزا صحت افزا مقامات کی خوب سیر کی۔ منڈی (لورن)، بفلیاظ اور درابہ کچھ ایسے مقامات ہیں جن کا توڑ پونچھ تو کیا پورے کشمیر میں

کہیں نہیں ہے۔ پورے کا پورا کنبہ خوب مزے میں رہا۔ میرے دِل میں البتہ میری فیروزپور کی چاہت کے کھو جانے کا خدشہ بھی ساتھ ساتھ رہا۔ میں جانتا تھا کہ اب زِندگی میں دوبارہ فیروزپور جانے کا موقع بمشکل ہی ملے گا، وہی ہوا۔ آج میری عمر ۶۲ برس کی ہو چکی ہے۔ میں صرف ایک بار نیشنل بک ٹرسٹ آف اِنڈیا کے ایک ادبی پروگرام کے لئے بھٹنڈہ جاتے ہوئے فیروزپور چھاونی کے ریلوے اسٹیشن پر پانچ دس منٹ کے لئے رک سکا۔ لیکن ریلوے اسٹیشن میں وہ بات کہاں! پھر بھی عالم یہ تھا کہ:

تیری سجری پیڑ دا رتیا   چم چم لانواں اکھ نوں

(یہ پنجابی لوگ گیت کی ایک صنف ہے جس کے معنی ہیں "تیرے تازہ نقش پا کی ریت کو میں چوم چوم کر آنکھوں سے لگا رہا ہوں)

جموں میں آ کر ہم لوگوں نے گاندھی نگر میں ایک خوبصورت مکان کرائے پر لے لیا۔ اِس مکان کا نمبر A / ۴۹۹ ہے اور اِس کے ایک حصے میں ہم لوگ رہتے تھے، دوسرے حصے میں میری بڑی بہن اپنے شوہر رگھبیر سنگھ اور اپنی (بڑی) بیٹی کے ساتھ، رگھبیر سنگھ اُس وقت بھی ہماری اپنی موٹر بس (۹۰۳۳) چلاتے تھے اور باؤ جی نے اُن کو اب اُس میں حصے دار بھی بنا دِیا تھا۔ اِسی دوران میں باؤ جی نے اپنے دو تین اور رِشتے داروں کو ٹرانسپورٹ کے کام میں لگوا دِیا۔ دو ایک اور بسیں خرید لیں۔ اپنے رِشتہ داروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا، اُنہیں اپنی بسوں پر کنڈکٹر لگوایا، پھر ڈرائیور بنوایا، پھر بسوں میں حصے دار بنوایا۔ وہ رِشتہ دار حصہ دار ڈرائیور بعد میں پوری کی پوری بسیں نگل گئے اور باؤ جی کو اُن کا لگایا ہوا سرمایہ بھی پورا پورا واپس نہ ملا۔ باؤ جی کو آخری عمر تک یہ غم اندر ہی اندر کاٹتا رہا مگر دُنیاداری کے لئے اُنہوں نے اپنے رِشتہ داروں سے کبھی جھگڑا مول نہیں لیا۔

جموں میں باؤ جی نے میرا داخلہ رنبیر ہائیر سیکنڈری سکول کی دسویں جماعت میں کروا دِیا۔ میرے دونوں بھائیوں کو گاندھی نگر کے ہی ایک سکول میں داخل کروا دِیا گیا۔ ہماری سب سے چھوٹی بہن نریندر کور کو بھی لڑکیوں کے کسی سکول میں داخلہ مل گیا۔ رنبیر سکول کی دسویں جماعت میں میری دوستی میرے کُچھ ہم جماعتیوں سے اِتنی اچھی طرح سے ہو گئی کہ ہم لوگوں کا ایک اچھا خاصہ گروپ بن گیا۔ ہماری حاضری ایک بار پہلے پیریڈ میں لگتی تھی۔ ایک بار دسویں پیریڈ میں، دونوں بار حاضری ہمارے Form master لگاتے جن کا نام ایس۔ پی۔ رینہ تھا اور جو ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ بچوں سے پیار بھی کرتے تھے مگر پٹائی بھی اچھی کرتے تھے۔ ہمارا پورا کا پورا گروہ اکثر دوسرے پیریڈ میں اسکول کی دیوار پھاند کر دوڑتے ہوئے کسی نہ کسی سنیما تھیئٹر میں گھس جاتا اور دسویں پیریڈ تک فلم

ختم ہونے پر اُسی طرح سے دوڑتے ہوئے واپس آتا۔ وہی سکول کی دیوار پھاند کر Form master ایس۔ پی۔ رینہ کے حاضری لگانے پر Yes Sir, Yes Sir کہہ رہا ہوتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار رینہ صاحب نے ہمیں انگریزی ترجمہ کرنے کے لئے یہ جملہ دِیا تھا۔

''میں نے آج پرتپال اور روی کمار کو دوسرے پیریئڈ کے بعد اسکول کی دیوار پھاندتے ہوئے دیکھا۔''

روی کمار گپتا میرے ایسے جانی دوست تھے جو دسویں جماعت سے لے کر آج تک میرے ساتھ بھائیوں سے بڑھ کر رِشتہ نبھا رہے ہیں۔ اُن کے گھر میں کوئی اہتمام ہو میرا (بلکہ میرے پورے کنبہ کا) پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ روی آج جموں میں اپنے مرحوم والد کا تھوک کا کاروبار سنبھال رہے ہیں۔ روی بہت پیارے آدمی ہیں۔ دوستوں کے لئے خلوص تو اُن کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اُن کی بیوی ہماری گیتا بھابھی بھی ہم لوگوں سے بہت محبت کرتی ہیں۔ اُن کی دو جڑواں بیٹیاں رائل، پائل اور اُن کا بیٹا رِشو کمار ہمارے اپنے بچوں کی طرح ہیں۔ روی نے ہم لوگوں کی دسویں جماعت کی پوری کلاس کی ایک تصویر آج بھی اپنے ڈرائنگ رُوم میں سنبھال کے رکھی ہوئی ہے۔

دسویں جماعت کے امتحان کے بعد نتیجہ آنے میں دو ڈھائی مہینے باقی تھے۔ باقی بہن بھائیوں کے امتحانات میں ابھی کچھ دیر تھی۔ والدین نے میری پہلے سے پونچھ چلے جانے کی خواہش پر مہر ثبت کر دی۔ وادیٔ پونچھ کے خوش نما نظاروں کی سیر کے خیال سے ہی دِل میں ایک عجیب سا رومانس پیدا ہو جاتا ہے۔ ماں نے جاتی بار میری جیب میں تیس روپے ڈالے اور کہا، ''یہ پیسے میں خرچ کرنے کے لئے نہیں دے رہی ہوں۔ اِس لئے دے رہی ہوں کہ سفر میں اور پردیس میں کبھی کوئی بھی مشکل پیش آ جائے تو پیسہ کام آتا ہے۔'' ماں کے یہ الفاظ آج تک زِندگی کے اُوبڑ کھابڑ راستوں میں میری رہنمائی کر رہے ہیں۔

دسویں کے امتحان اور نتیجے کے درمیانی عرصے میں میرے روابط اپنے ابتدائی عمر کے دوستوں شام سندر (آنند لہر) اور جسبیر سنگھ پچھندہ وغیرہ سے اور بھی مضبوط ہوئے۔ یہ دونوں دوست اور کچھ دُوسرے ہم عمر (جن میں مہندر پیاسا کا نام مجھے اب تک یاد ہے) اُس زمانے میں کچی عمر میں اُردو شاعری کی طرف راغب ہو رہے تھے۔ شاید اُن لوگوں کی دیکھا دیکھی میرے من میں بھی شعر و ادب کے انکور پھوٹنے لگے۔ انکور کیا پھوٹنے لگے گویا پانی کا ایک چشمہ زمین کا سینہ چیر کر پھوٹ پڑا۔ چشمہ کیا پھوٹ پڑا گویا ایک سیلاب تھا رُکا ہوا جس کا باندھ ٹوٹ گیا اور سیلاب نے شش جہات میں تیز رفتار سے پھیلنا شروع کر دِیا۔ میں نے اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں غزل، آزاد نظم لکھنا شروع

کردی۔ کئی کاپیاں، کئی رجسٹر میری شعری تخلیقات سے پر ہو گئے۔ ہم لوگ ایک دوسرے کو اپنی شعری تخلیقات سناتے البتہ میں تھوڑا جھجک محسوس کرتا کیونکہ وہ لوگ بہت پہلے سے اِس میدان میں تھے۔ دسویں جماعت کا نتیجہ میں نے پونچھ میں ہی ریڈیو پر سنا۔ اُس وقت تک میرے والدین اور دوسرے بہن بھائی بھی پونچھ پہنچ چکے تھے۔

گیارہویں جماعت میں میں جموں واپس آ گیا۔ پھر سے وہی رنبیر اسکول وہی دوستوں کا گروہ، میری تعلیمی مشکلات کا آغاز یہیں سے شروع ہوا۔ گیارہویں جماعت میں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ بڑے بھائی صاحب کے فرمان پر میں نے میڈیکل سبجیکٹس لے تو لئے تھے لیکن یہ میرا علاقہ دراصل تھا ہی نہیں۔ کیمسٹری فیزیکس اور بایولوجی میری طبیعت سے میل ہی نہیں کھاتے تھے۔ 1965ء کی بات ہے گیارہویں جماعت میں ہم نے داخلہ لیا تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے ایک قسم کی پراپگینڈہ جنگ چل رہی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد اگست میں اسکول کھلے تھے اور ستمبر میں پراپگینڈہ جنگ گولی بارود ٹینکوں اور ہوائی جنگباز جہازوں کی جنگ میں بدل گئی۔ جموں سے امرتسر، فیروز پور تک اور فیروز پور سے رن آف کچھ (Run of Kutchch) راجستھان تک پورے کا پورا مغربی سرحدی علاقہ آگ اُگل رہا تھا۔ شام ہوتے ہی جموں شہر کے آسمان پر ہندوستانی اور پاکستانی ہوائی جہازوں کی جنگ دیوالی کی آتش بازی کا نظارہ پیش کرنے لگتی۔ جموں شہر پر پاکستانی قبضے کا خطرہ منڈرا رہا تھا۔ بہت سے لوگ شہر چھوڑ کر دور دراز کے محفوظ علاقوں کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ ایک دِن ہمارے گھر والوں نے بھی اپنی ہی ایک بس میں سوار ہو کر کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم لوگوں نے رات بھر سفر کرتے ہوئے دوسرے دِن شام کے وقت ہردوار پہنچ کر دم لیا۔ گاڑی میرے بہنوئی رگھبیر سنگھ خود چلا رہے تھے۔ ہماری بڑی بہن ست نام کور اور اُن کی چھوٹی سی بیٹی بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہردوار میں پہلی بار پوتر ندی گنگا سے آمنا سامنا ہوا۔ پورے ہردوار میں ایک روحانی ماحول چوبیس گھنٹے غالب رہتا ہے۔ گنگا میں ہم لوگوں نے خوب اشنان کیئے۔ ایک مہینے تک ہم لوگ ہردوار میں رہے۔ عین ہرکی پوڑی (ہندوؤں کا تیرتھ استھان) میں گورُونانک کی یاد میں ایک چھوٹا سا گورودوارہ بھی موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ گورونانک خود یہاں آئے تھے۔

میں نے ہردوار میں خوب فلمیں دیکھیں۔ مجھے یاد ہے ایک سنیما تھیئٹر بالکل ہرکی پوڑی کے ساتھ ہے (شاید گنگا تھیئٹر) ایک اور تھیئٹر تھوڑا آگے بازار میں ہے۔ مجھے یاد ہے "بے نظیر" نام کی اشوک کمار مینا کماری اور (شاید) ششی کپور اور تنوجہ کی ایک مسلم سوشل فلم میں نے اِسی تھیٹر میں دیکھی

تھی۔تنوجہ نے اُس فلم میں بہت خوبصورت چلبلی لڑکی کا رول کیا ہے۔ میں تنوجہ کا اُس زمانے سے ہی دیوانہ (fan) ہوں۔اُس کے بعد تنوجہ مجھے سب سے زیادہ دیو آنند کی فلم جیول تھیف میں پسند آئی۔

ہردوار سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر کنکھل نام کا گنگا کنارہ ہے جہاں سکھ نرملے سادھوؤں کا گورودوارہ (اکھاڑہ) ہے ہردوار میں سادھوؤں کے اپنی اپنی سمپر داؤں کے اپنے اپنے اکھاڑے ہیں۔نرملے سکھ سادھو بھگوے کپڑے پہنتے ہیں اور بھگوے ہی رنگ کی پگڑی باندھتے ہیں۔کنکھل کے نرملے آشرم کے بڑے سادھو (جن کا نام شاید بشن سنگھ کریٹ تھا) میرے والد کو اچھی طرح جانتے تھے۔ہم لوگ کئی بار کنکھل کے اُس آشرم میں گئے اور وہاں لنگر بھی چھکا (کھایا)۔ہمیں بتایا گیا کہ کنکھل کے عین اُس نرملے آشرم کی جگہ پر کسی زمانے میں سکھوں کے تیسرے گوروُ امرناتھ جی تپسیا کرتے رہے ہیں۔سکھوں کے دُوسرے گوروانگد دیو جی سے ملاقات کے بعد وہ سکھ سمپر دائے میں شامل ہو گئے تھے۔

جنگ ختم ہونے کے بعد ہم لوگ واپس جموں آ گئے۔جموں کے رنبیر اسکول میں (کامریڈ دلجیت سنگھ اور پروین کیسر وغیرہ) کچھ ہم جماعتیوں نے مجھے مارکس انجلز، لینن اور ماؤزے تنگ وغیرہ کمیونسٹ نظریہ سازوں اور رہنماؤں سے متعلق کتابوں وغیرہ (literature) سے متعارف کروایا۔کمیونسٹ مینیفیسٹو اور لعل کتاب جیسی کتابوں کا مجھ پر اِتنا اثر ہوا کہ میں زمیں دوز کام کرنے والی ایک تنظیم اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے ساتھ منسلک ہو گیا۔چارو مجومدار اور کانو سانیال جیسے نکسلی رہنما اُن دِنوں زمیں دوز کام کر رہے تھے۔جموں کے کرشن دیو سیٹھی اور رام پیارا صراف بھی اُن دِنوں بڑے نکسلی لیڈروں میں شامل تھے اور زمیں دوز تھے۔ ہمارے دوست اور پیش رو (ڈوگری زبان کے مشہور) شاعر وید پال دیپ بھی زمیں دوز کارکن تھے۔وید پال دیپ ڈوگری شاعرہ پدما سچدیو کے پہلے شوہر تھے۔شراب بہت پیتے تھے۔شاعر غضب کے تھے۔الگ ہونے کے بعد بھی پدما سچدیو سے بہت محبت کرتے تھے (اس بات کا اِظہار اُنہوں نے میرے ساتھ کئی بار روتے ہوئے کیا تھا)

کرشن دیو سیٹھی کے بارے میں اُن دِنوں کہا جاتا تھا کہ وہ اُس زمانے کے کابینہ درجے کے وزیر مفتی محمد سعید (جو بعد میں پی ڈی پی کے صدر اور ریاست کے وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں) کے قریبی دوست ہیں اور زمیں دوز ہوتے ہوئے بھی اکثر مفتی صاحب کی سرکاری رہائش گاہ میں رہتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا یہ بات کہاں تک سچ ہے مگر ہماری زمیں دوز تنظیم کی نشست میں ہمیشہ اِس بات کا ذِکر ہوتا۔کرشن دیو سیٹھی بعد میں نکسلی تحریک سے الگ ہو گئے اور منظر عام پر آ گئے۔رام پیارا صراف بھی کچھ عرصہ بعد اِس مسلح تحریک سے الگ ہو گئے اور بین الاقوامی جمہوری پارٹی (Internationalist

(Democrtic Party) نام کی ایک تنظیم سے منسلک ہو گئے۔
وید پال دیپ بعد میں بہت دنوں تک جموں سے نکلنے والے وید بھسین کے انگریزی اخبار ''کشمیر ٹائمز'' میں کام کرتے رہے۔ بھسین صاحب کے منع کرنے پر بھی خوب شراب پیتے رہے۔ روتے روتے پدما سچدیو کو یاد کرتے رہے اور بالآخر اپنی متزلزل منتشر اور برباد زِندگی سے تنگ آکر دُنیائے فانی کو خیر باد کہہ گئے۔ اُن کا ایک ڈوگری شعر یاد آتا ہے ۔

ساڑھے پاسا ہا یا اُندا ہا قصور　　زِندگی بھر اس رہے پر لور لور

(قصور ہمارا تھایا اُن کا مگر ہم زِندگی بھر دربدر رہے)

کالج میں رچھپال سنگھ نام کے ایک کٹر ہندو راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (R.S.S) کے نکر دھاری کارکن میرے دوست بن گئے۔ اُنہیں اُردو شاعری سے بلا کا لگاؤ تھا۔ خود بھی شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ میکش کاشمیری اور لالہ منوہر لعل دِل نے اُنہیں ''بیدار'' تخلص بھی عطا کیا۔ رچھپال میرے بہت پیارے خوب رو دوست تھے۔ میری اُن کی دوستی محبت کے دائرے میں داخل ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ میری محبت میں رچھپال کی شخصیت پر اشترا کی نظریات کا رنگ چڑھنے لگا اور میری شخصیت پر ہیڈ گیوار اور گورُو گولوالکر کے ''بھارتی کرن'' جیسے نظریات کا۔

مجھے یاد ہے کالج کے زمانے میں کبھی کبھار مجھے دائیں بازو کے ہندوتو نواز دوستوں سے ملوایا جاتا تو وہ مجھے دیکھتے ہی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جاتے۔ میں کوئی ایسا نکسلی لیڈر تو نہیں تھا لیکن رچھپال کے ہندوتو وادی دوست مجھ سے اِتنا خوف کھاتے تھے گویا میں کوئی چارو مجومدار یا کانو سانیال کے درجہ کا نکسلی تھا۔

آج رچھپال میرا ہمدم میرا دوست مجھ سے بچھڑ چکا ہے۔ ہمارے الگ ہونے کی وجہ ہے رچھپال کی نہایت خوبصورت بیوی رینو (Renu) کا جل کر مر جانا۔ رچھپال اور اُس کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ اُس کے اسٹوو جلاتے ہوئے اُس کی ساڑھی نے آگ پکڑلی تھی جب کہ رینو نے ہسپتال میں مجسٹریٹ کے سامنے بیان دِیا کہ رچھپال نے اُسے جلایا ہے۔ بعد میں انو نے اُسے لدھیانہ کے ایک ہسپتال میں جا کر بیان بدلنے کو کہا تا کہ رچھپال جیل سے باہر آسکے تو اُس نے کہا ''انو بھابھی اگر تم کہتی ہو تو میں بیان بدل دوں گی مگر سچائی تو یہی ہے کہ رچھپال نے مٹی کا تیل چھڑک کر مجھے جلایا ہے۔'' انو مایوس واپس لوٹ آئی۔ بعد میں کچھ سالوں کے بعد رچھپال رِہا بھی ہو گیا لیکن میں اپنے دِل میں اُسے کبھی معاف نہ کر سکا۔ رینو کی خوبصورت لاش آج بھی میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔

گیارہویں جماعت میں میں پہلی بار فیل ہو گیا۔ دوسری بار پاس ہوا، ایک سال ضائع ہو گیا۔ بارہویں جماعت میں میں نے جی جی ایم سائنس کالج میں داخلہ لیا۔ وہی کیمسٹری وہی فزیکس وہی بائیولوجی اور میرا وہی شعر و ادب کا سلسلہ۔ البتہ کہانی لکھنا چھوڑ کر میں نے شاعری پر ہی دھیان دینا شروع کر دِیا۔ جنون کی اِنتہا یہ تھی کہ ایک بار گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران میری غزلوں نظموں کی بیاض پونچھ میں ہی رہ گئی اور میں جموں واپس چلا گیا۔ جموں سے دوسرے دِن ہی پونچھ واپس آیا لیکن بیاض نہ ملی۔ پھر جموں واپس آ کے معلوم ہوا کہ بیاض دراصل جموں پہنچ چکی تھی۔ مجھے ہی کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی۔

اُسی سال کالج کے لٹریری میگزین کے اسٹوڈینٹ ایڈیٹر کے لئے پنجابی کے انچارج پروفیسر انمول سنگھ نے آٹھ لڑکوں سے کسی عنوان کے مضامین لکھوائے، پھر پڑھنے سے پہلے مضامین پر اپنی مرضی سے نمبر لگائے ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷ اور ۸۔ بعد میں انمول سنگھ نے مضامین پڑھے اور پڑھنے کے بعد اپنے پہلے سے لگائے ہوئے نمبروں کے مطابق نتیجے کا اعلان کر دیا۔ میرے مضمون کا نمبر آٹھواں تھا، جو لڑکا پہلے نمبر پر آیا وہ میڈیکل کی پڑھائی میں سب سے زیادہ لائق تھا اور میں سب سے زیادہ نالائق۔ ہربھجن سنگھ رِسم نام کا وہ لڑکا بعد میں ملک کا ایک مشہور ماہر قلبیات بن گیا۔ وہ کالج میگزین کے پنجابی سیکشن کا انچارج تو بن گیا لیکن ادیب نہ بن سکا۔ میں ڈاکٹر نہ بن سکا لیکن شاعر ادیب ضرور بن گیا۔ تمام تر مشکلات اور رُکاوٹوں کے باوجود۔

بعد میں جب کالج میگزین ''توی'' کے پنجابی سیکشن کے لئے میں اساتذہ اور طلبہ کے رِشتوں سے متعلق اپنا ایک مضمون لے کر پروفیسر انمول سنگھ کے پاس گیا تو اُس نے عنوان دیکھ کر ہی میرے مضمون کو دُور پھینک دِیا اور بس اِتنا کہا:

"Don't write such articles"

اُسی برس میرے ایک ہم جماعتی کلبیر سنگھ کے نام سے میرا لکھا ہوا خوابوں سے متعلق ایک مضمون کالج کے اُسی میگزین کے اُسی پنجابی سیکشن میں اُسی پروفیسر انمول سنگھ نے بڑی خوشی سے شائع کیا تھا۔ زِندگی کے اُس موڑ پر میں نے دوبارہ کبھی پنجابی نثر نہ لکھنے کا مصمم اِرادہ کر لیا۔ آج اِتنے برسوں بعد سوچتا ہوں کہ پروفیسر انمول سنگھ نے شاید پنجابی زبان کے ایک بہت بڑے نثر نگار کو پیدا ہونے سے پہلے ہی قتل کر دِیا تھا۔

بارہویں جماعت میں کیمسٹری میں میری Compartment آ گئی۔ میں اگلی جماعت میں داخل ہو سکتا تھا لیکن میرے بھائی صاحب نے ایک بار پھر سے ڈِکٹیٹرانہ فرمان جاری کیا کہ اگلی

کلاس میں داخلہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ Compartment Cancell کرواؤ اور اگلے سال پھر امتحان دے کر ڈاکٹری کی سیٹ کے لئے کوشش کرو۔ اگلے سال میں بالکل فیل ہو گیا۔ تیسرے سال پھر کمپارٹمنٹ آئی، اُسی کیمسٹری میں۔ میرے دو سال اور ضائع ہو گئے۔ میں دُنیا بھر سے دو سال اور پیچھے رہ گیا۔ میرے بھائی صاحب کی ضد کی وجہ سے، جو اُن دِنوں کہا کرتے تھے کہ آنے والے دِنوں میں صرف ڈاکٹر اور انجینیر ہی روٹی کما سکیں گے باقی سب لوگ بھوکے مریں گے۔ مجھ سے متعلق تو اُنہوں نے شوشہ چھوڑ دِیا کہ میں بڑا ہو کر اُن کی کار کے شیشے صاف کرنے کا کام کیا کروں گا۔ تمام رِشتہ داروں، بھائی چارے والوں میں یہ بات پھیل گئی۔ میرے ایک خالو اُن دِنوں ہمارے گھر آئے اور میرے ماں باپ سے کہا کہ وہ مجھے کچھ گدھے خرید کر دے دیں تاکہ میں اُن پر اینٹ پتھر ڈھو کر اپنی روٹی کمانے کے قابل ہو جاؤں۔

ایک دِن میں کالج کے نوٹس بورڈ پر ادبی میگزین سے متعلق کوئی نوٹس پڑھ رہا تھا جب میرے دور کے رِشتہ دار اور کالج میں مجھ سے ایک سال پیچھے پڑھنے والے ستیندر سنگھ میرے پاس آ کر گویا ہوئے ''آپ بھی ادب کا ذوق رکھتے ہیں؟'' میں نے کہا ''ہاں شوق تو رکھتا ہوں لیکن مجھے جموں کے ادبی ماحول کے بارے میں کچھ واقفیت نہیں ہے۔'' وہ بولے ''میں جموں کی بزمِ فروغِ اُردو کا Publicity Secretary ہوں۔ ہماری بزم کی ہر اتوار شام کے چار بجے میٹنگ ہوتی ہے۔ آپ بھی اُس میں آیئے، ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔''

میں نے ستیندر سنگھ فاؔنی کے کہنے پر بزمِ فروغِ اُردو میں جانا شروع کیا۔ بزمِ فروغِ اُردو کی ایک خصوصی نشست میں میں نے بھی ایک غزل سنائی۔ پروگرام ختم ہونے پر (مرحوم) میکش کاشمیری جو ریڈیو سٹیشن میں کام کرتے تھے میرے پاس آئے۔ مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اگلے دِن مجھے ریڈیو سٹیشن آنے کے لئے کہا۔ میں دوسرے دِن ریڈیو پہنچا تو وہ میرے لئے یوتھ پروگرام میں کلام سنانے کے لئے Radio Contract لئے میرا اِنتظار کر رہے تھے۔ وہ میرا ریڈیو کا پہلا پروگرام تھا جس کے لئے مجھے ۱۵ روپے ملے تھے۔ بعد میں میکش صاحب نے میرا تعارف (لالہ) منوہر لعل دِلؔ، رہبر جدیؔد اور کچھ دوسرے شعراء و ادبا سے کروایا۔ اُنہیں دِنوں جموں کے ایک مشاعرے میں (مرحوم) لبھو رام جوشؔ ملسیانی تشریف لائے تھے۔ میکش صاحب اور دِلؔ صاحب نے مجھے اُن کی شاگردی میں پیش کر دِیا۔ جوشؔ صاحب نے مجھے اپنے ساتھ آئے ہوئے اپنے شاگردِ رشید (مرحوم) جناب ساحؔر سیالکوٹی کے حوالے کر دِیا۔ ساحؔر صاحب پانچ سات سال تک میری غزلوں پر اصلاح فرماتے رہے بعد میں مجھے فارغ اُلبال قرار دے دیا۔

میکش صاحب اور دِلؔ صاحب کا احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ اُنہوں نے میری جدید شاعری کو کلاسیقیت کی چاشنی عطا فرمائی۔

کالج میں میرے ایک ہم جماعتی تھے، سرجیت سنگھ۔ اُنہوں نے سب سے پہلے مجھے دیوانِ غالبؔ لاکر دِیا۔ دیوانِ غالب پڑھ کر میرے گویا چودہ طبق روشن ہو گئے۔ بعد میں میرؔ و ذوقؔ و مومنؔ و داغؔ کا کلام بھی پڑھا اور اِن اساتذہ کے کلام سے بہت کچھ سیکھا۔ حالانکہ میری شاعری کی بنیاد میں سنت کبیرؔ، روی داس، نامدیوؔ، تلسی داس، میرا بائی، سکھ گوروؤں کے کلام بلھے شاہ، شاہ حسین، وارثؔ شاہ وغیرہ کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے۔

اُسی زمانے میں کالج کی لائبریری سے نفسیات، مارکسزم، سارتر اور کامو (وجودیت) وغیرہ سے متعلق کتابیں مستعار لیکر پڑھنا میرا عام مشغلہ بن چکا تھا۔ خاص طور سے کامو کی Outsider اور Sigmond Freud کی Interpretation of dreams نے مجھے بہت متاثر کیا۔ علامت، استعارہ، انفرادی واجتماعی شعور وغیرہ میں دِلچسپی نے میری سائنس کی تعلیم کو بری طرح سے متاثر کیا۔

بہر حال خدا خدا کر کے تیسرے درجے میں بی۔ ایس۔ سی پاس کرنے میں مجھے کامیابی مل ہی گئی۔ بھائی صاحب اُس وقت تک P.G.I. Chandigarh سے M.D. کر کے آچکے تھے اور جموں کے ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں Physycian کے طور پر تعینات ہو چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بے شک ڈاکٹر نہ بن سکا لیکن آگے ایم اے کی پڑھائی بھی مجھے سائنس کے مضامین یعنی Botany, Zoology یا Chemistry میں سے کسی ایک Subject میں کرنا ہے۔ یعنی میری تعلیمی پریشانیوں کا سلسلہ ابھی ختم ہونے والا نہیں تھا۔ میں اُردو اور پنجابی شاعری میں روز بروز ترقی کر رہا تھا لیکن میری تعلیم اور میرے مستقبل کی فکر مجھے اندر اندر کاٹے جا رہی تھی۔ بھائی صاحب کے عامرانہ حکم نامے کے سامنے ہمارے باؤجی تو کسی کو بولنے ہی نہیں دیتے تھے۔ ماں بھی کہتی تھی گورچرن ہی لائق ہے۔ وہی جو کہے گا وہ ہوگا۔ اور کہ اگر وہ میری پٹائی بھی کرتا ہے تو میری بھلائی کے لئے ہی کرتا ہے۔ حالانکہ اب تک میں اچھا خاصا جوان ہو چکا تھا اور بھائی صاحب میری پٹائی کرنے سے گھبراتے تھے اور اندر اندر ہی غم کھا لیتے تھے۔

بھائی صاحب کی شادی رنجیت کور نام کی ایک ڈاکٹر لڑکی سے ہوگئی۔ خدا کو مجھ پہ ترس آ گیا۔ بھائی صاحب کو آئر لینڈ میں ڈاکٹری کی نوکری مل گئی۔ وہ چلے گئے، میں آزاد ہو گیا۔ میرے اندھیروں میں ایک ایک کر کے روشنی کی کرنیں داخل ہونا شروع ہوئیں۔ میں نے بھی اللہ پر ماتما

واہگورو کے فیض سے کروٹ لی اور سوچا۔

کوئی اُمید پھر جگاؤں کہیں　　اِک دِیا غار میں جلاؤں کہیں
اے انا اِتنا ساتھ دے میرا　　موت سے پہلے مر نہ جاؤں کہیں
گمرہی تو ہی کوئی راہ نکال　　دشت میں شہر اِک بساؤں کہیں
ہے جو دریا رُکا ہوا بیتاب　　وقت ہے اب اِسے بہاؤں کہیں

میری زِندگی کے تین قیمتی سال بھائی صاحب کے عامرانہ فیصلوں کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ مجھے اُس لمبی دوڑ (Marathon) Race میں پھر سے شامل ہونا تھا جس میں میرے ہمنوا ہمنفس ہمجماعتی تین سال آگے نکل چکے تھے۔ نئے سرے سے بکھری ہوئی اپنی ذات کو سمیٹنے کا ایک لمبا سفر میرے سامنے تھا۔

ابھی آگے ہے ایک دَور نیا　　پھر سمٹنا ہے پھر بکھرنا ہے

بس اپنے آپ کو ایک جھٹکا دِیا ایک مکمّل انگڑائی لی اور دوڑنا شروع کر دِیا۔ اندر اندر کوئی اُمید کی کرن باقی تھی جس کے بارے میں گویا مجھے یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی دِن آفتاب صورت ہو جائے گی۔

نکل تو پڑے ہم تھے آشفتہ سر　　نہ آثار اچھے نہ اچھی خبر

17/10, Z-A, South Extension, Trikuta Nagar, Jammu Tawi-180012

Cell: 09419180824

تھیوری۔ انسانی تشخص کا بحران اور گوپی چند نارنگ (پہلی قسط)

پروفیسر قدوس جاوید (سرینگر)

''تھیوری'' محض ایک نقطۂ نظر، فلسفۂ حیات یا تصورادب ہی نہیں بلکہ ہر لمحہ بدلتی فکریات و علمیات کے تناظر میں ''تھیوری ایک جذباتی، احتسابی اور جمالیاتی وسیلہ بھی ہے جس کے طفیل عالم انسانیت، لسانی، معاشرتی اور ثقافتی تکثیریت کے باوجود ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہو رہا ہے۔ چنانچہ عصر حاضر کا کوئی بھی باشعور انسان خواہ جتنی بھی کوشش کیوں نہ کرے، تھیوری کے اثر ونفوذ سے اچھوتا نہیں رہ سکتا۔ اور جب ایسا ہے تو سمجھنا ہوگا کہ گذشتہ ڈھائی تین دہائیوں سے ''تھیوری کی لازمیت'' سے متعلق مسلسل توضیحات کے بعد کی تاریخ میں تھیوری کی اصطلاح کی معنویت اور اطلاقی امکانات کے اور کتنے زاوئے اور دائرے روشن ہو رہے ہیں۔

تھیوری۔ مابعد جدید ثقافتی صورت حال کے تار و پود Tissues سے وجود میں آنے والی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا استعمال بیسویں صدی کی آخری دہائیوں سے ''لسانیات'' ادب وفن اور سماجیات میں کثرت سے کیا جا رہا ہے۔ اس اصطلاح کے معنی مختلف علوم وفنون اور فکر وفلسفہ کی بصیرت سے پیدا ہونے والی وہ ''قوت'' (Power) ہے جو کسی بھی طرح کے متن یا متون کے داخلی اسرار، مضمرات اور امتیازات کو سامنے لاتی ہے۔

اُردو میں عام طور پر ''تھیوری'' کو ادبی نظریہ یا تصور کے معنوں میں برتا جا رہا ہے۔ لیکن یہ پورا سچ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے وسیع مفہوم میں ''تھیوری'' صرف اور محض اُن اصولوں کا نام نہیں جو ادب کا مزاج متعین کرتے ہیں یا ادب کے مطالعے کے طریقۂ کار کی نشاندہی کرتے ہیں بلکہ تھیوری، فلسفہ، تاریخ، سیاست، سماجیات، جنسیات، مذہبیات اور عمرانیات وغیرہ کسی بھی موضوع پر مبنی تحریر متن (Text) کو ''ڈسکورس'' کے بطور سمجھنے اور سمجھانے کے نئے زاوئے اور طریقے بروئے کار لاتی ہے۔ لہٰذا ''تھیوری'' کو کلیتاً ادبی نظریہ'' یا نظریہ نقد سمجھنا اور برتنا غلط فہمیوں کو راہ دے سکتا ہے۔ البتہ شعر و

ادب کے افہام وتفہیم اور توضیح وتعبیر کے ضمن میں تھیوری ایک اہم کردار ضرور ادا کر سکتی ہے۔

''تھیوری'' کی اصطلاح کا استعمال، ادب کے توسیعی تصور، مابعد جدیدیت کے حوالے سے اب عام ہو چکا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ''تھیوری'' کا ادب کے ساتھ تعلق ''لسانیات'' کے حوالے سے قائم ہوتا ہے کیونکہ ادب بھی لسانی اظہار کی ایک صورت، ایک ڈسکورس ہے۔ فرانسیسی، ماہر لسانیات اور دانشور سوسیئر Ferdinand de saussure نے اپنی کتاب A Course in general Linguistics میں جو زبان سے متعلق نظریہ پیش کیا اس کے زیر اثر مختلف اور متنوع قدیم وجدید تصورات ونظریات سامنے آئے۔ مثلاً لیوی اسٹراس کی ساختیات Structuralism رولاں بارتھ، لاکاں اور فوکو کی پس ساختیات PostStructuralism ژاک دریدا کا ردتشکیل De construction رومن جیک سن اور شکلووسکی کی ہئیت پسندی formalism جوناتھن کلر کا Concept of Common Sense وولف گانگ آئزر کی مظہریت Phenomenology ٹیری ایگلٹن اور پیری اینڈرسن کی نو مارکسیت Neo marxism اور ورجینا وولف سائمن دابوار اور ژولیا کرسٹیوا کی تانیثیت Feminism وغیرہ۔ ان سارے تصورات کے آپسی میل جول سے عالمی سطح پر انسان، انسانی معاشرت، ادب اور ثقافت سے متعلق ہر طرح کی سرگرمیوں کی تفہیم اور توضیح کا جو ایک تازہ کار آزاد، فطری اور دانشورانہ رویہ (intellectual attitude) وجود میں آیا ہے اس رویے کا نام ہی تھیوری ہے۔

''تھیوری'' گلوبلائزیشن، جدید ترین تکنیکی فتوحات اور انٹرنیٹ کی سہولیات کی زائیدہ صارفینی تہذیب Consumers culture اور اس کے مسائل وحقائق کے اندرون میں جھانکنے اور آج کی مقابلہ جاتی زندگی میں معاشرت اور ثقافت کو آزاد فطری، تکثیری اور تعمیری سانچے میں ڈھالنے پر یقین رکھتی ہے۔ دراصل صارفینی تہذیب کے سبب آج کا انسان ہر چیز کو نہ صرف ''نفع اور نقصان'' کی نظروں سے دیکھنے کا عادی ہو چکا ہے بلکہ بڑی تیزی کے ساتھ citizen کے بجائے netizen بنتا جا رہا ہے اور اس صورت حال میں زندگی کے مختلف شعبوں میں جو نئے ''ڈسکورس'' (روشیں) سامنے آرہے ہیں۔ ''تھیوری'' ان کی تمام طرفوں متبادلوں اور دوسرے پن (the other) کو کھولنے، سمجھنے اور سمجھانے کی ایک کوشش، ایک ذریعہ ہے تاکہ آج کے انسان کو زندگی اور زمانہ کا سامنا کرنے کا ایک روشن خیال تعمیری اور منطقی راستہ مل سکے۔

ٹیری انگلٹن نے اپنے ایک لیکچر The Signifacance of Theory میں کہا ہے کہ ''اس وقت انسان اور تمام انسانی علوم Humenities زبردست بحران سے دوچار ہیں اور انسان

اورانسانی علوم کواس بحران سے نکالنے کے لئے ''تھیوری'' بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ تھیوری زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں۔ جہاں زندگی ہے وہاں تھیوری ہے اور سماجی زندگی کا ہر رنگ ہر پہلو چونکہ ایک اصولی معنی (Theoritical Meaning) رکھتا ہے اس لئے ٹیری انگلٹن کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ "just as our socail life is theoritical, so all the theory is real social life" کے بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ تھیوری نے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ علوم اوران کے انسلاکات سے متعلق مروجہ روایات اور مفروضات کو زیروزبر کر کے انسانی فہم عامہ Common Senes سوچ فکراور رویوں Attitudes کو جونئی سمتیں اور طرفیں عطا کیں، ان کی بنا پر ابتدا میں تھیوری کا جو عام مفہوم قائم ہوا وہ موٹے طور پر اس طرح تھا۔

''تھیوری'' معاشرت اور ثقافت، جنسیات اور نفسیات، بشریات اور مذہبیات، مظہریت اور معنیات سے متعلق ہر طرح کے ڈسکورس معاملات، برتاؤ کے بارے میں عام انسانی سوچ اور فکر، عمل اور ردعمل پر اثر انداز ہونے اور انھیں نئے سانچوں میں ڈھالنے والی ایک ''قوت'' کا نام ہے۔ اس قوت کوفوکو نے علم knowlege سے تعبیر کیا ہے'' اور زیادہ واضح لفظوں میں:

''تھیوری، انسانی علم (دانشوری، معلومات، تجربات اور مشاہدات) کی زائیدہ وہ تازہ کار ترقی یافتہ زندہ اور متحرک طاقت ہے جو ہر طرح کے ڈسکورس (تحریر، غیر تحریر متن) سے وابستہ تصورات ومفروضات اور تاثرات و کیفیات کی تہوں اور طرفوں کو کھول کر موضوع یا معروض کے نادیدہ امکانات کو روشن کر سکتی ہے۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے تھیوری کے معنی و مفہوم اور اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے ساختیات اور پس ساختیات (۱۹۹۳ء) میں لکھا تھا:

''اس وقت ادب کی دُنیا میں سب سے زیادہ توجہ تھیوری یعنی نظریہ سازی پر ہے ....زندگی کا کوئی بھی تصور تھیوری کے بغیر ممکن نہیں۔ زبان ہی کو لیجئے۔ زبان مجموعہ نشانات ہے۔ جس سے معنی خیزی ہوتی ہے اور اس معنی خیزی سے انسان کا حیاتیاتی اور سماجیاتی عمل مرتب ہوتا ہے اور اس سلسلہ عمل سے تاریخ تشکیل پاتی ہے۔ گویا زبان، انسان تاریخ سب تھیوری کا موضوع ہیں۔ لیکن خطرہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تھیوری ایک وبا کی شکل اختیار کر لے یا دوسری سرگرمیوں کو دبانے لگے .... تھیوری کا مطلب

ہے مسائل کو نظریانا، ان مسائل کے بارے میں کچھ نہ کچھ موقف اختیار کرنا اور اس موقف کو ضبط تحریر میں لے آنا تاکہ مسائل کے بارے میں جو رائے قائم کی گئی ہے یا ان کا جو جواز فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کا کھرا کھوٹا پرکھا جا سکے۔ اگر مسائل کو نظریایا نہیں جائے گا تو ان کا کھرا کھوٹا بھی پرکھا نہیں جا سکے گا۔ غرض موجودہ عہد کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے تھیوری کی سرگرمی لابدی ہے۔ سوائے اس کے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔''

عام فہم الفاظ میں انسانی زبان، زندگی، زمانہ، ادب ثقافت اور تاریخ سے متعلق کسی بھی مسئلہ یا حقیقت کو سمجھنے اور اس کا سامنا کرنے کے لئے جو اصول، حکمت عملی، طریقہ یا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اسی اصول، طریقہ یا راستہ کا نام تھیوری ہے۔

تھیوری کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ''تھیوری'' سے وابستہ کئی بڑے نام ایسے ہیں جن کا ادب سے یا تو کوئی واسطہ نہیں اور اگر ہے بھی تو جزوی طور پر۔ مثلاً:

۱ سوسیئر (Ferdinand de Saussure) شعبہ۔ لسانیات

تصنیف A Course in General Linguistics

۲ فوکو۔ (Michel Foucault) شعبہ۔ سماجیات

(۱) Madness and sexuality

(۲) The Order of things

(۳) The history of civilization

۳ شلائرماخر (Fredrich Shleirmacher) شعبہ۔ تفہیمیت

تصنیفات Hermaneutics پر خطبات

۴ دریدا (Jacques Derrida) شعبہ۔ فلسفہ، علم معانی، ردتشکیل (Deconstruction)

تصنیفات: (۱) Of Grammatology

(۲) Writing and difference

(۳) Speech and Phenomena (Deconstruction)

۵ لیوی اسٹراس (Claud Levi Strauss) شعبہ۔ بشریات۔ ساختیات

تصنیف۔ structural Anthropology

۶ ہوسرل (Edmund Husserl) شعبہ۔ مظہریت

۷ جولیا کرسٹیو (Julia Kristiva) شعبہ۔ علم زبان، نفسیات۔ تانیثیت

تصنیفات: (۱) Desire in Language

(۲) Revolution and Poetic Language

دراصل یہ وہ چند دانشور ہیں جن کے لسانی، نفسیاتی، عمرانی، مظہریاتی، تاریخی اور معنیاتی تصورات نے زبان و ادب سمیت انسان اور انسانی زندگی سے متعلق تمام شعبوں کی مروجہ روایات، نظریات، اشیا، مظاہر اور دُنیا کے بارے میں سوچنے کے انداز اور غور و فکر کے رویوں (Attitudes) کو تازہ ترین سمتوں اور طرفوں کی راہ پر گامزن کیا، جس کی ایک عبوری منزل ''تھیوری'' تھی۔ چونکہ تھیوری کی تشکیل مختلف النوع علوم، نظریات اور تصورات کے سنگ و خشت سے ہوئی ہے، اس لئے اس کی ماہئیت ٹھوس اور وحدانی نہیں سیال اور تکثیری ہے۔ اسی بنا پر سید خالد قادری نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:

''تھیوری۔ ایک متفرق صنف (Miscelleneous Genre) کی عرفیت (Nikname) ہے جسے ان علوم، افکار یا تحریروں سے منسوب کیا جاتا ہے جو اپنے خود کے دائرے سے باہر جا کر دوسرے میدانوں میں رائج خیالات و تصورات پر اثر انداز ہوتی ہیں اور عرصے سے چلی آ رہی مقبول عام روایات پر سوچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہ اکثر ذہن انسانی کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ نئے فکری چلنج قبول کرتا ہے اور یوں فکر انسانی کی تشکیل نو کی صورتیں نکلتی ہیں۔''

ظاہر ہے کہ جب فکر انسانی کی تشکیل نو ہوتی ہے تو نہ صرف سماجی اور تہذیبی قدروں اور رویوں میں تبدیلی آتی ہے بلکہ انسان کی نفسیات، اس کی تخلیقیت، تجزیاتی صلاحیت اور اظہار کے پیرایوں میں بھی تازہ کاری پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ساتویں آٹھویں دہائی تک آ کر تھیوری کے اثر سے ہی، سماجیات اور تہذیبیت، تاریخیت اور دیگر علوم و فنون میں جو تغیرات رونما ہوئے ان سب کے اثر سے ہی شعر و ادب کے لسانی فنی اور جمالیاتی اقدار اور برتاؤ میں بھی تکثیریت Pluralism اور بین الموضوعیت اور بین المتونیت کے دروازے وا ہوئے۔ اور ادب کا وہ توسیعی تصور Extensive concept وجود میں آیا جسے مابعد جدیدیت کا نام دیا گیا۔ جو اپنے آپ میں خود ایک تھیوری ہے۔ ادب کی تخلیق اور تفہیم و تعبیر کا یہ ایک انداز، ایک اسلوب ہے۔ تھیوری کی معنویت کو مابعد جدید ثقافتی صورت حال نے ہی قائم کیا۔ تھیوری اور مابعد جدید ادبی تصور کی تشکیل۔ میں زندگی، فلسفہ، تاریخ، سماجیات اور ثقافت کے کس شعبہ نے کتنا اور کون سا کردار ادا کیا یہ، طے کرنا تو بے حد مشکل ہے۔ لیکن

مابعد جدید تصورادب کی توضیح وتشریح کے لئے یہ ضرور کہا گیا ہے کہ ما بعد جدیدیت تین مکاتب فکر کی آمیزش وآویزش کا نتیجہ ہے۔

۱۔ مابعد جدید جمالیات Post Modern Aesthtics

۲۔ مابعد ساختیاتی فلسفہ Post structuralist Philosophy

۳۔ مابعد مارکسی سماجیات Post Marxist Sociology

ظاہر ہے کہ صرف یہ تین مکاتب فکر ہی زندگی، زمانہ اورادب وفن کے کم وبیش تمام شعبوں کے مثبت ومنفی امتیازات اور نامساعدتوں (Inadequacies) کو اپنے اندر سمیٹنے کے لئے کافی ہیں۔ وہ شعبہ خواہ رسٹن (Rustin) کے مطابق تحلیل نفسی کا ہو یا کیلنر (Kelner) کے بقول، سماجی تصورات واقدار کا یا احب حسن Ihab Hassan اور لیزلی فیڈلر Leslie Fiedler کے خیال میں ادب کا۔

اب چونکہ ''مابعد جدید تصورادب'' بنیادی طور پر تھیوری کی ہی طرح تکثیریت Pluralism پر اصرار کرتا ہے۔ اس لئے زبان، زندگی، زمانہ، ذہن، مصنف، متن، معنی، روایات، شعریات، ثقافت، سائنسی دریافتیں، علوم کے ارتقاء اور پھیلاؤ اورادب کی تخلیق اور تفہیم وتعبیر کے حوالے سے بھی ایسے متعدد، زاوئے، رویے اور نظرئے سامنے آرہے ہیں جنھیں الگ الگ تھیوریز یا اینٹی تھیوریز کے نام دئے جارہے ہیں۔ حتیٰ کہ نفسیاتی، جمالیاتی اور مارکسی نظریہ ادب تک سب کے سب اصلاً تھیوریز ہی ہیں۔ اور چونکہ ان تمام تھیوریز کا موضوع اور معروض ادب بھی ہے، اس لئے ہر ایک کوادبی تھیوری یا نظریہ نقد بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ ایک ادبی تھیوری سے دوسری ادبی تھیوری تک ادب کی تفہیم وتعبیر کے اقدار اور رویے ہی نہیں طریقہ کار تک بدل جاتے ہیں۔ اسی لیے آج کی زندگی کی طرح آج کے ادب کی قدر سنجی بھی ایک مسئلہ Problematic ہوگئی ہے۔ دوئم یہ کہ مابعد جدید تھیوری کی طرح نئی ادبی تھیوریز کی تشکیل بھی مختلف ومتضاد، مفاہمتی اور مزاحمتی لسانی، فنی، فکری اور جمالیاتی عناصر سے ہوئی ہے لہٰذا کسی بھی نئی ادبی تھیوری کی کوئی ایک جامع حتمی اور سب کے لیے قابل قبول تعریف یا تعبیر مشکل ہے۔ پھر بھی چند بنیادی امتیازات کی اشارتاً نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ مثلاً جس طرح جدیدیت کی تفہیم کے لئے ترقی پسندی قریب ترین حوالہ ہے اسی طرح مابعد جدید تھیوری کی ناگزیریت کے ادراک کے لئے اُن نظریات (تھیوریز) سمجھنا ضروری ہے جس سے گزر کر جدیدیت بذات خود ایک تھیوری کے وجود میں آئی تھی۔ جدیدیت کے تشکیلی عناصر میں سب سے اہم ''ہیئت پسندی'' ہے۔ جس سے ایک حد تک مابعد جدید تھیوری کی تشکیل میں بھی مدد لی گئی۔

ہئیت پسندی کو بیسویں صدی میں ظہور پزیر ہونے والی پہلی ادبی تھیوری کہا جا سکتا ہے۔
چونکہ اس کا آغاز انقلاب روس (۱۹۱۷) کے آس پاس ہوا تھا، جسے روس کے مستقبل کی تعمیر کی غرض سے روسی دانشوروں نے فیوچرزم futurism کی تحریک کے طور پر آگے بڑھایا تھا۔ عام طور پر ہئیت پسندی کو روسی ہئیت پسندی بھی کہا جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ روس کے چند بڑے دانشوروں ا۔ رومن جیکب سن (Roman Jakobson) ۲۔ وکٹر شکلووسکی (Victor Shklovsky) ۳۔ بورس توماشوسکی (Boris Tomashevsky) ۴۔ باختن (Bakhtin) ۵۔ مکارووسکی (Mukarovsky) ۶۔ رینے ویلیک (Rene vellek) وغیرہ نے ہی پہلے پہل ''ادب کی ادبیت'' literariness of Literature کی بازیافت کے لئے فن پارے کی لسانی ہئیت کے سائنسی اور معروضی مطالعے پر زور دیا۔ ہئیت پسندی کی رُو سے فن پارے کی اصل اہمیت اور معنویت اس کی وہ داخلی لسانی ساخت یا ہئیت ہے جس میں وہ فن پارہ سامنے آتا ہے اور جس خیال، فکر، تجربہ یا مشاہدہ (متن) کو اُس ہئیت میں پیش کیا گیا ہے اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ اُردو میں جدیدیت پسندوں نے اسی تھیوری کی پیروی کی۔ ہئیت پسندی، ادب کے سماجی وثقافتی یا جذباتی اور تخیلاتی عناصر کو فن پارے کا بالکلیہ لازمہ قرار دینے پر اصرار نہیں کرتی بلکہ ایسے تمام عناصر کو محض ادبی اظہار کے معاون قرار دیتی ہے۔ اس اعتبار سے ہئیت پسندی مارکسزم (ترقی پسندی) کی ضد تھی۔ ہئیت پسند ناقدین ادب میں کہی اور بیان کی گئی باتوں کی بجائے ان لسانی، فنی اور جمالیاتی عناصر کو سامنے لانے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں جن کی وجہ سے کسی تحریر کو ادبی تحریر قرار دیا جاتا ہے۔ اسی لئے ہئیت پسند ادبی تھیوری نے ادب میں عام زبان کے بجائے تخلیقی زبان کے استعمال اور ادبی تخلیق کو تازہ کاری اور غیر مانوسیت (Defamiliarisation) کے ساتھ پیش کرنے پر زور دیا ہے۔ ہئیت پسندی کے مطابق ادب حقیقت کا علم حاصل کرنے کا نہیں بلکہ حقیقت کی اصل حقیقت یعنی اشیا کی بصیرت حاصل کرنے کے امکانات فراہم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ہئیت پسند ناقدین۔ مارکسی دانشوروں کی طرح ادب کو زندگی کی عکاسی یا تعبیر جیسی باتوں پر اصرار تو نہیں کرتے لیکن اس بات پر ضرور نظر رکھتے ہیں کہ ادب عام زندگی پر کیسے اثرات مرتب کرتا ہے۔

روسی ہئیت پسندی کو فروغ دینے میں تین مکاتب فکر کی خدمات کو اہم مانا جاتا ہے۔

۱ ماسکو لنگوسٹک سرکل جو ۱۹۱۵ء میں رومن جیکب سن کی قیادت میں قائم ہوا تھا۔

۲ انجمن برائے مطالعہ شعری زبان (The Society for the apojaz) جو شکلووسکی (Victor Shklovsky) کی سربراہی میں ۱۹۱۶ء میں قائم ہوا۔ بورس آئخن، توشیووسکی اور یوری

تینیانوف وغیرہ بھی اس انجمن میں شامل تھے۔

۳ پراگ لنگوسٹک سرکل جسے رومن جیکب سن نے روس سے چیکوسلواکیہ ہجرت کے بعد پراگ میں ۱۹۲۶ء میں قائم کیا تھا۔ اس انجمن نے ہئیت پسندی اور ساختیات کے مشترکہ اور مشابہہ امتیازات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اور ادب کے خالص سائنسی اور تکنیکی مطامعے کے بجائے تخلیقی اور جمالیاتی جائزے پر زور دیا۔ لیکن ہئیت پسند ادبی تھیوری کی اپنی کچھ خامیاں بھی تھیں اس لئے اس ادبی تھیوری کو ابتدا میں جتنی مقبولیت حاصل ہوئی بعد میں اُتنی ہی اس پر نکتہ چینیاں بھی ہوئیں اور آخرکار آپسی اختلافات اور خصوصاً سوویت روس کے نظریاتی اور سیاسی دباؤ کے سبب ہئیت پسند ادبی تھیوری زوال کا شکار ہوتی چلی گئی۔ لیکن ہئیت پسند دانشوروں نے ادب میں زبان کے برتاؤ کے حوالے سے جو تھیوری پیش کی تھی اسکے اثرات امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے ادیبوں نے بھی اپنے اپنے طور پر قبول کئے اور ہئیتی تھیوری کو نئی شکلیں بھی عطا کیں۔ بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائیوں میں امریکی دانشوروں جان کرورینسم (John crowransom) اور ایلین ٹیٹ وغیرہ نے ادب کی فکری اور سماجی جمالیات کی جگہ لسانی جمالیات پر زور دیا۔ امریکی دانشوروں کی اس تھیوری کو ''نئی تنقید'' New Criticism کا نام دیا گیا حالانکہ نئی تنقید کی تھیوری ہئیت پسندوں کی تھیوری سے مشابہت رکھتی تھی لیکن اس کا اعتراف کم ہی کیا گیا۔ ابوالکلام قاسمی نے اس ضمن لکھا ہے:

''......ہئیتی تنقید کے نقطہ نظر سے زبان کے استعمال کی نوعیت کو جو اہمیت حاصل ہوئی اس کے نتیجے میں ادبی زبان اور ترسیلی زبان کی تفریق زیر بحث آنے لگی تھی۔ روسی ہئیت پسندوں کے خیالات عام نہ ہونے کے باعث نئی امریکی تنقید بنیادی حوالے کے طور پر ان کے ذکر سے خالی تھی مگر برطانیہ میں فی نفسہٖ ادب پارے کے مطالعے پر جو زور دیا گیا تھا، اسے نئی تنقید کے ابتدائی آثار کی حیثیت بہر حال حاصل رہی۔''

''ہئیت پسندی اور نئی تنقید عام طور پر متن کے مقررہ معنی و مفہوم اور ادب کے عام سماجی و ثقافتی سروکاروں کو غیر ضروری قرار دیتی ہے اور ورڈز ورتھ جیسے رومانی نظریہ سازوں کے اس قول کی حمایت کرتی نظر آتی ہے کہ The world is too much with us۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ہئیت پسندی نے شعر و ادب میں زبان کے لسانی برتاؤ کے حوالے سے متن میں جمالیاتی محاسن کی جلوہ آفرینی سے متعلق جو تصورات پیش کئے ہیں۔ مابعد

جدید تھیوری انھیں رد نہیں کرتی ۔ ویسے مابعد جدیدیت چونکہ سوئیر کے نظریہ لسان پر مبنی ساختیات Structuralism اور پس ساختیات (Post Structuralism) کی زائیدہ ہے۔اس لئے ہئیت پسندی کی لسانی تھیوری ساختیات کی لسانی تھیوری سے قدرے مشابہت کا رشتہ بھی رکھتی ہے ۔ کئی مابعد جدید مفکرین رومن جیکب سن ، لیوی اسٹراس وغیر نے ہئیت پسندوں کے اس خیال کی حمایت کی ہے کہ فن پارے مین زبان کے برتاؤ میں الفاظ کے استعمال میں آفاقی اصولوں کی دریافت اور قیام ضروری ہے ۔ البتہ ساختیاتی تھیوری ادراک حقیقت کی تھیوری ہے جو انسان ، کائنات اور اشیا کے حقیقی معنی ومفہوم کو جاننے پر زور دیتی ہے۔ لیکن ہئیت پسندی کے برعکس ساختیات یہ مانتی ہے کہ زبان ایک پیچیدہ اور پُر اسرار میڈیم ہے جو دنیا کے انسانوں اور اشیا کی معنویت اور اہمیت کی تشکیل جدید اور ان کے باہمی تفریقی (یعنی مختلف ومتضاد اور تغیر پذیر) رشتوں کی بازیافت اور شناخت کے امکانات رکھتی ہے۔اس کے ساتھ ہی ساختیات ۔ سماج کی پرانی اور تصوراتی تعبیر کو رد کر کے عصری حقائق وحالات کی بنیاد پر نئے سرے سے سماج کی تشکیل کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔ گوپی چند نارنگ نے ساختیاتی تھیوری پر تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ'' مارکسیت اور ساختیات دونوں جدیدیت کی اجنبیت (Alienation) اور یاسیت (Despair) کے خلاف ہیں ۔ مارکسیت اور ساختیات کے مقامات اشتراک اور اختلافات کے کئی پہلو ہیں لیکن دونوں اس سائنسی رویے پر اصرار کرتے ہیں کہ دنیا حقیقی ہے اور انسان اس کو سمجھ سکتا ہے ۔ مارکسیت اور ساختیات دونوں دنیا کے انتشار ظاہری میں تصوراتی ربط پیدا کرنے کے نظرئے ہیں ۔ دونوں دنیا اور انسان کو بطور کل دیکھتے ہیں۔''

(ساختیات، پس ساختیات ص ۳۶)

اب تک کی وضاحتوں سے نتیجہ یہ برآمد ہو رہا ہے کہ مابعد جدید تھیوری مختلف ومتضاد لسانی ادبی اور فلسفیانہ نظریات سے گذر کر اس مقام تک پہنچی ہے جہاں اسے انسان دوست تھیوری کہا جا سکتا ہے۔

H.O.D. Dept. of Urdu, Central University of Kashmir. Cell: 09419010472

شائستہ فاخری کے افسانوں کی دنیا

پروفیسر صغیر افراہیم (علی گڑھ)

کہتے ہیں کہ 'کسی قوم کی تاریخ پڑھنا چاہو تو اس وقت کے ادب کا مطالعہ کرو' اور آج جب میں شائستہ فاخری کے افسانے پڑھ رہا ہوں تو سوچتا ہوں کہ شائستہ فاخری نے اس عہد کی 'عورت' ہونے کا کفارا ادا کرنے لیے جو خوبصورت افسانے لکھے ہیں وہ ان کے عہد کے بھیانک سچ ہیں جو دلوں میں خوف کی صلیب بن کر لٹک رہے ہیں۔ ان افسانوں میں لوگوں کے جذبات، احساسات زندگی کو برتنے کے طور طریقے کی ہو بہو تصویر پیش کی گئی ہے۔ لیکن یہ واقعات تمام تر سچ ہونے کے باوجود سیدھے سپاٹ سچ نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں کہانی پن پوری قوت سے موجود ہے۔ اور یہی کہانی پن قاری کی توجہ کو بھرپور انداز میں اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی شائستہ فاخری کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔

شائستہ فاخری نے اپنے مختصر افسانوں میں خطیبانہ، واعظانہ اور ناصحانہ انداز اختیار نہیں کیا بلکہ سادگی کے ساتھ بیانیہ انداز میں معاشرے کے افراد کی کمزوریوں اور اچھائیوں کو واضح کیا ہے۔ وہ عام فہم، رواں اور سادہ زبان کے ذریعے قاری کے ذہن میں اتر جاتی ہیں، اپنے افسانوی کرداروں کے ذریعہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا تجزیہ کرتی ہیں۔

شائستہ فاخری مختصر افسانے کے فنی رموز سے بخوبی آگاہ ہیں۔ میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑتا کہ مختصر افسانے میں وحدت تاثر، مرکزی خیال اور نقطۂ عروج کی کیا حیثیت یا اہمیت ہے یا مختصر افسانے کو کتنا طویل مختصر ہونا چاہیے یا کہانی کو آگے بڑھانے میں تذبذب......کا کیا کردار ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ مجھے فقط اتنا کہنا ہے کہ مختصر افسانہ نویس کی حیثیت سے شائستہ فاخری کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ مطالبات فن پر خاص توجہ دیتی ہیں۔ مثلاً پلاٹ کی تعمیر میں ان کی سلیقہ مندی افسانہ کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ پیش پا افتادہ واقعات قابل توجہ بن جاتے ہیں، عام حالات میں جن چیزوں پر ہم اچھلی سی نظر ڈال کر گزر جاتے ہیں یک لخت اہمیت حاصل کر لیتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ 'سنورقیہ باجی' کی واحد متکلم کیسے کہانی کی تعمیر میں معاون ہو سکتی ہے؟ لیکن 'سنورقیہ باجی' شائستہ فاخری کے

مشاہدے میں آ کر جب کہانی کی بنیاد بنی، تو کیا سے کیا ہو گئی۔ اگر رقیہ سخاوت حسین کا 'سلطانہ کا خواب' نہ ہوتا تو اردو کو 'سنو رقیہ باجی' جیسا اہم افسانہ بھی کیسے میسر آتا۔ رقیہ سخاوت حسین نے The Sultana's Dream کے نام سے ایک افسانہ ۱۹۰۵ء میں انگریزی میں لکھا تھا جس کا اردو ترجمہ 'سلطانہ کا خواب' اسی سال پریم چند کے رسالے 'زمانہ' کانپور میں شائع ہوا۔ تقریباً سو برس بعد شائستہ فاخری نے آزادیٔ نسواں کو موضوع بنا کر یہ معرکہ آرا افسانہ لکھا ہے جو تحریک تانیثیت کی مسلم خاتون اول رقیہ سخاوت حسین کے نام ہے۔ جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ کس طرح اس معاشرے میں ایک عورت کے ہاتھوں ایک عورت ذلیل ہوتی ہے۔ اگر نئی تھیوری کی فکریات کو پیش نظر رکھ کر اس افسانہ کو پرکھا جائے تو اردو میں بین المتونیت کے تناظر میں تحریر کردہ افسانہ کی اتنی اچھی مثال شاید ہی مل سکے۔ اس افسانے کا ایک حصہ دیکھیں:

> "یہ سلطانہ ہیں کون؟" مجسٹریٹ نے سوال کیا "آخر ان کی طرف سے مقدمے کی پیروی کرنے کے لیے کوئی کیوں نہیں آیا۔"
>
> عدالت میں موجود لوگوں کے بیچ اچانک چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ہر شخص سلطانہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ کیونکہ بات اب خواب کی نہیں سلطانہ کی تھی اور سلطانہ کا وہاں موجود رہنا ضروری تھا۔
>
> اب میں سب کو کیسے سمجھاؤں، کیسے ثابت کروں کہ سلطانہ رقیہ باجی کی جنمی ہے۔ رقیہ سخاوت حسین باجی نے لگ بھگ سو سال پہلے ایک کہانی میں سلطانہ کو جنم دیا تھا اور اسے جسم اور روح عطا کی تھی۔ سلطانہ کے جنم سے ایک تہذیب کا جنم ہوا تھا۔ ایک مخلوق کی طرف سے ایسی مخلوق کی تخلیق تھی جو ان دیکھی تھی لیکن موجود تھی۔ جو نگاہوں سے اوجھل تھی لیکن سب کی نگاہوں میں سمائی ہوئی تھی۔ اور وہ سلطانہ جب سن بلوغ کو پہنچیں تو خوابوں میں جینے لگی۔ گود میں ہمکتے بچے کی خالی آنکھوں میں مائیں کاجل لگاتی ہیں مگر باجی نے سلطانہ کی سونی آنکھوں میں خواب سجا دیے۔ واہ رے باجی، تم چلی گئی اور سلطانہ کے خواب رہ گئے۔ میں تو پھنس گئی ان خوابوں میں۔ اب یہ سب میں کیسے ثابت کروں۔
>
> اچانک مجسٹریٹ کی بلند آواز نے اٹھتے ہلکے شور پر خاموشی کی مہر لگا دی۔

''خواب سلطانہ کے چوری ہوئے تھے تو اس وقت یہاں سلطانہ حاضر کیوں نہیں ہوئیں۔ اگر نہیں ہوئیں تو ان کی طرف سے داخل لکھت رپورٹ پیش کیوں نہیں کی گئی۔''

افسانہ کے آخر کے ان جملوں پر غور کریں:

''سنو رقیہ باجی! اب میں خوابوں سے اوب گئی ہوں، اب میں حقیقت کی دنیا میں جینا چاہتی ہوں۔ میں ماضی کو بھول جانا چاہتی ہوں، میں حال میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ ماضی نے تو زخم دیے ہیں، اب آنے والا وقت ان پر مرہم رکھے گا، اس کا مجھے یقین ہے۔

رقیہ باجی! عورت کے وجود کی چیخ و کراہ، اس کی روح کے المیے، اس کے باطن کی ویرانی کو محسوس کرنے والا کون ہے؟ سو برس کے بعد بھی، ہے کوئی؟''

شائستہ فاخری کے افسانوں کا انسان ایک زندہ اور متحرک حساس مخلوق کی شکل میں دکھائی دیتا ہے جو زندگی سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ اس کے جذبات میں روانی، خیالات میں وسعت، فکر میں گہرائی، زبان کے استعمال میں تنوع، جمالیاتی احساس کا ایک نیا تصور لے کر سامنے آتا ہے۔ زندگی اور سماج کا قریبی اور آشنا آہنگ سنائی دیتا ہے جو افسانے میں شعور اور تاریخی حقائق کے رابطے ملاتا ہے۔ شائستہ فاخری کے افسانوں میں ماحول کی تلخی اور چبھن محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان کے افسانوں میں 'کوکھ، صوفی آپا، انگلیوں پر گنتی کا سفر، منگلا کی واپسی، رشتوں کی تراش' بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں تجسس اختتام تک قائم رہتا ہے جو ان کی فنی و فکری اظہار بیان کی دلیل ہے۔ چند اقتباسات دیکھیں:

''کسی جادوگر کے طلسمی تماشے کا کردار بنی وہ جل دھارا کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ اس کے دونوں گداز سینوں سے ٹپکتی ہوئی دودھ کی ننھی ننھی بوندیں جل کی دھارا میں دودھیا نقطے کی شکل میں پھیل رہی تھیں۔ چند قطرے سوکھی پیاسی زبان کی خوراک بھی بن رہے تھے۔ یہ زبان تھی اس ننھی جان کی جو پچھلے دو چار دنوں سے بستی والوں کے لیے ایک بڑا مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ ایک لاینحل مسئلہ..... اپنے بازوؤں میں بچی کو سمیٹے وہ لگاتار اسے نہارے جا رہی تھی۔''

(کوکھ)

"آسمان کے کینوس پر کتنے مناظر ابھر رہے تھے، مٹ رہے تھے۔ مٹتے پھر سنورتے، پھر ابھرتے۔ صوفی آپا ان منظروں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ بنتی بگڑتی تصویروں میں کوئی بھی تصویر ایسی نہیں تھی جو آج کی صوفی آپا سے میل کھاتی ہو۔ پچاس سال کی ایک پختہ عمر عورت، ڈھیلے ڈھالے ہاتھ سے سلے کرتے، رنگین گھیر دار بڑے پائنچے کی شلوار، سر پر پڑا ہوا ململ کا بڑا سا سفید دوپٹہ، ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک بڑی سی تسبیح، جو جبراً ان کی انگلیوں میں پھنسا دی گئی تھی۔ عطر کی خوشبوؤں سے مہکتے ان کے کپڑے۔ کانوں کے کناروں میں ٹھونسی گئی چھوٹی سی عطر سے بھیگی روئی کی پھریری۔ کبھی کبھار عزیزن بوا کی ضد سے وہ نہ چاہتے ہوئے سرمہ آنکھوں میں لگا لیتیں۔"

(صوفی آپا)

"ساری رات یعقوب صاحب غموں کے اندھیرے میں ڈوبتے ابھرتے رہے اور پھر جب رات ضرورت سے زیادہ لمبی لگنے لگی تو وضو کر کے جائے نماز پر بیٹھ گئے۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا تو نیچے آیا ہی نہیں۔ دھیرے دھیرے رات گزرتی رہی، وہ خدا کو یاد کر رہے تھے یا زینی کی یاد میں ڈوبے تھے، یہ ان کے سوا کون جان سکتا تھا۔ بہرحال رات گذر گئی۔ سویرا ہو گیا۔ جسمانی تھکن سے زیادہ ذہنی طور پر تھکے ہوئے یعقوب صاحب جائے نماز سے اٹھ آئے۔ کھڑکی کا پردہ کھسکایا، سورج کی نرم روشنی کمرے میں آنے لگی۔ وہ منہ دھونے اور فریش ہونے کے لیے واش بیسن کے پاس پہنچے۔ زینی کے ہاتھوں لگایا ہوا چھوٹا سا آئینہ واش بیسن کے اوپر لگا تھا، جسے انہوں نے جان بوجھ کر نہیں اتارا تھا۔ انہوں نے آئینہ میں اپنی شکل دیکھی۔ آدھے سے زیادہ پکے ہوئے بال، چہرے پر ابھری ہوئی گزرتے وقت کی لکیریں، حالات کی جھریوں میں غمگین چہرہ، سوجی آنکھیں، انہیں اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ پچاس سال کی عمر بھی کوئی عمر ہے۔"

(رشتوں کی تراش)

شائستہ فاخری کے افسانوں کی سب سے پہلی خصوصیت جو میری توجہ کا مرکز بنی وہ ہے ان کا

اختصار۔ یوں تو افسانہ کہتے ہی ہیں Short Story کو مگر جس استقلال سے یہ اختصار شائستہ فاخری کے یہاں برقرار رکھا گیا ہے اس میں ایک شعوری کاوش نظر آتی ہے۔ غالباً اسی اختصار نے ان کے افسانوں میں وہ اثر انگیزی پیدا کی ہے جس کی وہ خود بھی خواہاں ہوں گی۔

شائستہ فاخری کے افسانوں میں 'آفندی کا بیٹا، سرخاب ابھی زندہ ہے، کنور فتح علی، دو خطوں کی دنیا' کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ تیز اور اپنے قلم پر پوری گرفت ہے۔ ان کی نظر اشیا، مناظر اور کرداروں کے بطون میں اتر کر افسانے کا خام مواد حاصل کرتی ہے جو خوبصورت اسلوب میں ڈھل کر ایک معیاری افسانے کا روپ دھار لیتا ہے۔ ان کی ژرف بیں نگاہ دل دریا سمندروں ڈونگھلے پانیوں میں اتر کر انسانی سائیکی کے بیش قیمت اور انوکھے موتی اپنی مٹھی میں لاتی ہے اور خوبصورت لفظوں کے دھاگے میں پرو کر جب کہانی کا تانا بانا بنتی ہے تو ایک عمدہ افسانہ صفحہ قرطاس پر چمکنے لگتا ہے۔ عورت ہونے کے ناتے انہوں نے صنف نازک کو بہت قریب سے دیکھا، پرکھا اور اس کی سائیکی کو سمجھنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ یہ افسانے شائستہ فاخری کو ادب کی تاریخ میں تادیر زندہ رکھیں گے۔

> "اگلی صبح آمنہ بی کے پاس خبر آئی۔ آفندی چلتی جیپ سے کود کر بھاگنے لگا تھا۔ پکڑنے کی کوشش کی گئی مگر پولیس جب ناکام ہونے لگی تو مجبوری میں پیر پر فائرنگ کی گئی۔ افراتفری میں گولی پیٹھ پر لگی اور آفندی مارا گیا۔
>
> آفندی جیسے لوگوں کی موت عام بات ہوتی ہے مگر آمنہ بی اچھی طرح جانتی تھیں کہ اس کے شوہر کو افغانی ہونے کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ آفندی چلا گیا، بہت دور جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔ مگر آفندی کا بیٹا رہ گیا آمنہ بی کا دل بہلانے کے لیے۔ آمنہ بی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ اس معصوم جان پر باپ کی موت کا کیا اثر ہوا اور آفندی کا بیٹا راستے کے کس موڑ پر آ کھڑا ہوا۔"
>
> (آفندی کا بیٹا)
>
> "اوپر نیچے دائیں بائیں رینگتی ہوئی ان کی انگلیاں کبھی کسی کے پیر سے ٹکرا جاتیں تو کسی کے ہاتھ کو چھو لیتیں۔ کبھی خوف سے کپکپاتے ہونٹ اس کی انگلیوں میں آ جاتے تو کبھی پسینے میں بھیگے بالوں میں اس کی انگلیاں

پھنس جاتیں۔ ان میں کہیں بھی ان کا نیرو نہیں تھا۔ نیرو کو پہچاننے کے لیے انگلیوں کی نہیں صرف نتھنوں کی ضرورت تھی اور اس کی ناک میں نیرو کی جانی پہچانی خوشبو نہیں آ رہی تھی اس لیے وہ بے چین تھی۔ بہت بے چین۔ اتنی کہ دل چاہ رہا تھا کہ سارے خوف، سارے ڈر کو روند کر باہر نکل جائے۔ باہر جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ بھیانک شور تھا۔ دھماکے تھے، گولیوں کی بوچھاریں تھیں اور بارودی ہواؤں سے گھٹتی ہوئی سانسیں تھیں۔''

(سرخاب ابھی زندہ ہے)

آخر میں مجھے یہی کہنا ہے کہ شائستہ فاخری کے افسانوں میں حقیقت بینی اور حقیقت پسندی ملتی ہے۔ انہوں نے شفاف آنکھوں سے معاشرے کے اچھے اور برے گوشوں کو جانچا اور پرکھا ہے، ہمارے گردو پیش کی اوجھل حقیقتوں کو شگفتہ اور سلیس پیرایۂ اظہار میں قاری تک پہنچایا ہے۔ ان سے اردو افسانہ میں روشن مستقبل کی امیدیں ہیں۔

Dept. of Urdu, Aligarh Muslim University, Aligarh-202002 (U.P.)

Cell: 09358257696

بیسویں صدی کا شعری منظرنامہ اور جمیل مظہری کا پیمانۂ تخیل

اشفاق احمد عارفی (نئی دہلی)

جمیل مظہری کا شمار ہمارے ان شعرا میں ہے جنہوں نے ہمیں شاعری کا وافر اور وقیع سرمایہ دیا۔ جمیل مظہری نے شاعری کی مقبول ترین صنف غزل سے لے کر نظم، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ اور گیت ہر صنف سخن میں اپنے فکر و خیال کے نمونے پیش کیے۔ افسانے لکھے، مضمون تحریر کیے اور خطبے دیے۔ اپنے تمام تر رنگ سخن اور نمونۂ فکروفن کے باوجود اپنے شعری مزاج کے اعتبار سے جمیل مظہری ہماری شاعری میں ایک قابل قدر نظم گو شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی نگارشات میں رومانیت اور شبابیات، سیاسیات و عمرانیات اور فکر و فلسفہ، ہر رنگ اور تمام پہلوؤں کے باوجود، وہ اپنے شعری سروکار اور ذہنی و فکری رویوں کے اعتبار سے اول و آخر فکری اور فلسفیانہ مزاج کے شاعر ہیں۔ اس اعتبار سے وہ غالب اور اقبال کے قبیل کے شاعر قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اس اختلاف اور امتیاز کے ساتھ کہ وہ مردِ مومن رکھتے ہیں اور نہ کوئی فلسفۂ خودی۔ ان کی شاعری کا کوئی فکری محور ہے تو وہ حرکت و حیات، مسلسل ارتقا اور عظمت آدم ہے۔ زندگی کے گہرے تجربات و مشاہدات، شدید عصری حسیت، بے پناہ سیاسی و سماجی شعور کے ساتھ بھرپور ادبی و فنی خلوص اور ادب اور زندگی کے دائمی اقدار کی آمیزش و آویزش ان کی شاعری کا حسن متزاد اور طرۂ امتیاز ہے۔

جمیل مظہری کا نام اردو کے شعری منظرنامے پر بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ایک ایسے وقت پر توجہ کا مرکز بنا جب اردو شاعری کی روایت میں اقبال کے فوراً بعد جوش، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، روش صدیقی اور احسان دانش کی شاعری وفور جذبات، نعرہ بازی، تخیلی عشق، رومانی فضا، فراریت اور نرم موسیقیت کی داد حاصل کر رہی تھی۔ شعر و ادب کے ایک ایسے دور میں نمود و نمائش، صلہ و ستائش سے بے پروا، نعرے اور اشتہار بازی سے دور شاعر نے اپنے فکری اور فنی امتیاز اور انفرادیت ثابت کرنے میں کامیابی حاصل کی تو اس کی وجہ ان کے تخلیقی وجدان اور فکری اجتہاد کے وہ

اوصاف ہیں، جس کا سلسلہ کبیر، ٹیگور، انیس، غالب اور اقبال سے ملتا ہے۔ جمیل مظہری نے خود اپنے آپ کو دبستان غالب کا طالب علم اور اقبال کا مقلد تسلیم کیا ہے۔ یہاں پر اس مختصری گفتگو میں جمیل مظہری کے فکر و فن کی نمائندہ نگارشات کے حوالے سے یہ دیکھنا اہم ہوگا کہ آخر وہ کون سے فکری و فنی جہات اور ابعاد ہیں، جو بیسویں صدی کے شعری منظرنامے کی تشکیل اور بوطیقا سازی میں انہیں استناد اور اعتبار کا درجہ فراہم کرتے ہیں۔

جمیل مظہری جس طرح ذاتی اور عملی و تجرباتی سطح پر ایک بوقلموں شخصیت کے مالک تھے۔ صحافت سے وابستہ رہے، افسری کی، فلمی دنیا کا تجربہ حاصل کیا، درس و تدریس کے فرائض انجم دیے۔ حب الوطنی کے جام سے سرشار ہوکر ملازمت سے استعفیٰ دیا اور جیل کی صعوبتیں جھیلیں۔ شعری اور تخلیقی میدان میں اظہار و بیان کی سطح پر کسی ایک دائرے میں کیوں کر اسیر اور قانع ہوتے۔ حسن و عشق کے معاملات کے تعلق سے ان کے چند اشعار دیکھئے۔

ترا حسن بھی بہانہ، مرا عشق بھی بہانہ یہ لطیف استعارے نہ سمجھ سکا زمانہ
تری زلف خم بہ خم نے نئے سلسلے نکالے مری سینہ چاکیوں سے جو بنا مزاج شانہ
بہت مشکل ہے پاس لذت درد جگر کرنا کسی سے عشق کرنا اور وہ بھی سحر بھر کرنا
سر محفل ترا وہ پرسش زخم جگر کرنا مری جانب بہ مشکل اک نظر کرنا مگر کرنا

بدل جاتے ہیں دل حالات جب کروٹ بدلتے ہیں
محبت کے تصور بھی نئے سانچوں میں ڈھلتے ہیں
تبسم جب کسی کا روح میں تحلیل ہوتا ہے
تو دل کی بانسری سے نت نئے نغمے نکلتے ہیں
محبت جن کے دل کی دھڑکنوں کو تیز رکھتی ہے
وہ اکثر وقت کی رفتار کے آگے بھی چلتے ہیں
محبت تو طلب کی راہ میں اک ایسی ٹھوکر ہے
کہ جس سے زندگی کی ریت میں زم زم ابلتے ہیں
جواں ہوکر محبت کیوں نہ ٹپکے اس کی جیون سے
مری معصوم بیتابی نے پوجا جس کو بچپن سے
سنا عذرا تمہاری چوڑیوں سے آج وہ نغمہ
جوانی جس کو سنتی آرہی تھی دل کی دھڑکن سے

پلٹ کر مظہری نے اک نظر پھینکی تو مجرم ہے
تمہیں حق ہے کہ تم جھانکا کرو شاعر کو چلمن سے

جیسا کہ ذکر ہوا، جمیل مظہری کا زیادہ تر سرمایۂ سخن نظموں پر مشتمل ہے اور ان کا میلان طبع بھی غزلوں کے مقابلے زیادہ نظموں کی طرف مائل رہا۔ ان کی نظمیہ شاعری میں بھی حسن و عشق، شباب اور رومان کے مضامین کی ایک وافر مقدار موجود ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جمیل کی نظموں کی رومانی فضا اختر شیرانی اور ان کے دوسرے ہم عصروں کی رومانی فضا سے یکسر مختلف اور منفرد ہے۔ جمیل مظہری کی محبوبہ اختر شیرانی کی سلمٰی، عذرا یا ریحانہ یا جوش کی مہترانی، مالن، بھکارن یا جنگل کی شہزادی کے جیسی نہیں بلکہ خالص گھریلو اور روایتی قسم کی شخصیت ہے جو فرض اور محبت کی کشاکش کے درمیان زندگی گزارتی ہے اور بالآخر فرض کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ جمیل مظہری کی نمائندہ عشقیہ نظموں میں نالہ 'سحر' یا 'شاما' یہ کیا ہوا تم کو، ڈرو خدا سے ڈرو، کہتے ہیں اسی کو کیا محبت، دوشیزۂ بنگال، نقوش ماضی، حسینوں کی عید اور عشق ناتمام ہیں۔ یہاں پر ہر نظم کے مشمولات، کیفیات اور فنی دروبست پر علیحدہ تبصرے تجزیے کی گنجائش نہیں۔ بطور نمونہ چند بند دیکھئے۔

اٹھو عمر شب مختصر ہو رہی ہے — دعا کامیاب اثر ہو رہی ہے
نکھرتے ہیں جلوے، بکھرتی ہے ظلمت — سحر ہو رہی ہے، سحر ہو رہی ہے
پریشاں ہے نکہت، صبا جھومتی ہے — شجر جھومتے ہیں، فضا جھومتی ہے
ترنم سے لبریز ہے قلب شاعر — لب آرزو پر دعا جھومتی ہے
جو بو تیری زلفوں کی آتی نہیں ہے — چمن میں کلی مسکراتی نہیں ہے
تری جستجو میں ہیں گنگا کی موجیں — کہ تو اب نہانے کو جاتی نہیں ہے

ہے ابھی چشم تصور میں وہ گھر کا آنگن — اور اس آنگن کا اک چھوٹی سی دنیا ہونا
عشق معصوم کے وہ غیر شعوری اقدام — یعنی رخساروں پر رخساروں کا رکھا ہونا
چاندنی رات میں دیکھا ہے انہیں تاروں نے — میرے شانے پہ تیری زلف کا بکھرا ہونا
عشق کو میرے نہ آئے تھے جنوں کے انداز — حسن نے تیرے نہ سیکھا تھا خود آرا ہونا
وہ تیرے گلشن طفلی میں جوانی کی نسیم — مری آنکھوں کا وہ گلچین تمنا ہونا
وہ مجھے پہلے پہل درد جگر کا احساس — اور ترا اپنی حقیقت سے شناسا ہونا
وہ ترا پھولوں میں تلنا وہ سہاگن بن کر — میرے گلزار تخیل کا وہ صحرا ہونا

رنگ حسن و شباب اور ذکر عشق و رومان جمیل مظہری کی شاعری میں جملہ معترضہ کی حیثیت

رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا اصل اور بنیادی موضوع وہ فکر و فلسفہ ہے جو انہیں غالب اور اقبال کے بعد بیسویں صدی کے ایک اہم شاعر کے طور پر سامنے لاتا ہے۔ جمیل مظہری دراصل عظمت آدم کا رجز خواں شاعر ہے۔ وہ انسان اور کائنات کی تخلیق کے راز کا جویائے فطرت، کائنات اور اس کے باہم رشتوں کا متلاشی ہے۔ انسان کی ذات میں پوشیدہ صلاحیتوں اور امکانات کی طرف اشارے ان کی نظموں میں جا بجا ملتے ہیں اور ان سب کے پیچھے حرکت و عمل ارتقائے مسلسل اور حیات و کائنات میں پوشیدہ امکانات کا نظریہ ہے جسے جمیل مظہری نے تخلیقی سطح پر اس طرح برتا ہے کہ فکر تخلیقی حسیت اور وجدان سے شیر و شکر ہوگئی ہے۔

یہاں پر اس بات کی طرف اشارہ بے جا نہیں کہ جمیل مظہری کی نظم شاعری کے فکری عناصر اور عوامل کو اکثر غالب اور اقبال کی روایت سے استفادے اور اثرات سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں جمیل مظہری کے یہاں انسان، کائنات اور اشیا و مظاہر کائنات کے بارے میں تشکیک اور سوالیہ لب و لہجے کو بطور خاص نشان زد کیا جاتا ہے۔

یہ دراصل جمیل مظہری کا انفراد بھی ہے اور تقلید بھی۔ انفراد یہ کہ جمیل مظہری نے فکری سطح پر کسی طرح کی کورانہ تقلید سے کام نہیں لیا اور اپنے فکر و خیال کے ہر نکتے کو اپنی تخلیقی حسیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اپنی معروف فکری نظم ''پیام'' میں سعی مسلسل، حیات اور حرکت مسلسل کو جس تخلیقی بصیرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں وہ جمیل کا اپنا رنگ ہے۔ چند بند دیکھئے۔

جز سعی دوام اور کیا ہے　　　شاعر کا پیام اور کیا ہے؟
یعنی اس میکدہ کی رونق　　　جز گردش جام اور کیا ہے
انسان کا کام اور کیا ہے

کوشش میں ہے راز نظم ہستی　　　جنبش ہے دلیل زندگانی
اے تیگ وجود آدمی زاد　　　پانی میں اگر نہ ہو روانی
پانی کو کہے گا کون پانی

ہستی کا نظم ہے تسلسل　　　تکمیل میں زندگی نہیں ہے
منزل کا وجود ہے خیالی　　　منزل کہیں شوق کی نہیں ہے
فطرت کبھی رکتی نہیں ہے

اس بزم عمل میں صرف انسان　　　بے خود ہے خراب رنگ و بو ہے
ہونے کو ہے دل میں آرزو بھی　　　لیکن رسوائے آرزو ہے

بیگانۂ راز جستجو ہے

جمیل مظہری کی فکری نظموں میں 'آدم نو کا ترانہ' سر، فسانۂ آدم، ارتقا، میں اور تو، ہم کون ہیں ہم کیا ہیں؟ فلسفۂ اخلاق' اور شاعری کی تمنا' چند ایسی نظمیں ہیں جوان کی فکری اور فلسفیانہ جہتوں کو کھولتی ہیں۔ تفصیل اور تشریح کی گنجائش نہیں۔ جستہ جستہ کچھ بند سنیے۔

یہ مہر تاباں سے کوئی کہہ دے کہ اپنی کرنوں کو گن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرے ذرے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں
مرا تخیل مرے ارادے کریں گے فطرت پہ حکمرانی
جہاں فرشتوں کے پر ہیں لرزاں، میں اس بلندی پر جا رہا ہوں

(آدم نو کا ترانہ)

میں تھا ضمیر مشیت میں ایک عزم جلیل
کہ دفعتاً محترک ہوئے لب تخلیق
کیا سرور نے اک عالم دگر پیدا
خودی کے نشے میں اللہ رے بے خودی میری
ہوا حدود نظر سے نکل کے آوارہ
فرشتے رہ گئے حیرت سے دیکھتے مجھ کو
دلیل راہ بنی اپنی گرمیٔ پرواز
بہک بہک کے بکھیرے یہاں وہاں سجدے
ہوئیں جہان عمل میں شریعتیں پیدا
کبھی جلائی اندھیرے میں شمع علم و عمل
کبھی بگاڑ کے رکھ دیں ثواب کی شکلیں
بڑھا تو رہ گیا پیچھے مرے زمانۂ حال
بلندیوں کا تصور بھی رہ گیا پیچھے

ہنوز شوق کی کروٹ بھی لی نہ تھی میں نے
پکڑ لی صورت ظاہر وجود کی میں نے
چرا کے پی جو مئے سرکش خودی میں نے
بدن سے چادر عصمت بھی پھینک دی میں نے
ہوائے شوق میں جنت بھی چھوڑ دی میں نے
نہ کی قبول مشیت کی رہبری میں نے
کہ طاقت پر جبرئیل چھین لی میں نے
بھٹک بھٹک کے حقیقت تلاش کی میں نے
خدا کے نام پہ برپا جو کی خودی میں نے
کبھی بجھا دی ہدایت کی روشنی میں نے
کبھی بدل دی حقیقت گناہ کی میں نے
رکا تو وقت کی رفتار روک دی میں نے
پہنچ کے اتنی بلندی پہ سانس لی میں نے

(فسانۂ آدم)

مذکورہ بالا اشعار جو جستہ جستہ جمیل مظہری کی دو اہم ترین اور نمائندہ فکری نظم آدم نو کا ترانہ اور فسانۂ آدم سے لیے گئے ہیں۔ اس کائنات میں انسان کی ذات کی عظمت، اس کے اندر پوشیدہ صلاحیت اور بے پناہ امکانات کا نہ صرف اظہار بلکہ ایک پیغام بھی ہے اور انسان کے دنیائے آب و گل

میں آنے سے لے کر اس کے مختلف مرحلوں سے گذرنے اور اس کے ذہنی سفر کا اظہار بھی۔

جمیل مظہری کے فکر و خیال پر کوئی گفتگو نامکمل ہوگی اگر ان کی دو اہم اور طویل نظم ''فریاد'' اور ''جواب فریاد'' کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ نظم اقبال کی نظم ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' سے متاثر ہو کر لکھی گئیں۔ فریاد میں انسان کی جانب سے دربار الٰہی میں اس کی بے بسی ولاچاری، زبوں حالی کا شکوہ اور ساتھ ہی اس کی عظمت کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ جواب فریاد میں خدا کی جانب سے انسان کو اس کے وجود کی طاقت اور اہمیت باور کراتے ہوئے اس نظام کائنات میں اس کی عظمت اور انفرادیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور یہی مضمون ان کی مشہور اور معرکہ آرا فکری اور فلسفیانہ مثنوی 'آب وسراب' اور 'جہنم سے' میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ یوں تو جمیل مظہری نے سیاسی وسماجی مسائل اور صورت حال پر بھی نظمیں کہی ہیں، مزدوروں کے لیے بانسری بجائی، حب الوطنی کے نغمے بھی گائے ہیں اور 'بھارت ماتا' جیسی پر جوش نظم بھی کہی۔ سماجی شخصیت اور سیاسی ہستیوں کی حیات وخدمات پر مشتمل منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیے ہیں۔ ان سب کے درمیان جمیل مظہری کا پیمانہ تخیل وہی فکر و فلسفہ ہے جو ان کے تخلیقی وجدان اور فکری اجتہاد کے سانچے میں ڈھل کر کسی مرتب اور منظم ایقان ویقین کی بجائے کبھی سوال، کبھی تشکیک، تذبذب، جستجو، اقرار اور انکار کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور انہیں اردو شاعری کی بوطیقا میں مناسب مقام اور مرتبہ کا مستحق قرار دیتا ہے۔

Urdu Officer Dept. of Art, Culture & Languages, Govt. of NCT of Delhi

7th Level, Wing-C, Delhi-110002 Cell: 09910718476

ندرت اظہار کا شاعر۔ خورشید اکبر

ظفر اقبال ظفر (فتح پور)

غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جو کہ ہر دور میں اپنی غنائیت اور تازہ کاری کے باعث ارتقاء پذیر رہی ہے۔ غزل کا کینوس کافی وسیع ہے۔ ولی دکنی سے لے کر میر و غالب، حسرت و فراق اور موجودہ دور کے شعراء تک ایک طویل سفر غزل نے طے کیا ہے جو گل و بلبل سے شروع ہو کر نئے عہد کی ترجمان بن کر ہمارے ذہن و دل کو طمانیت فراہم کر رہی ہے۔

غزل کا جادو ہر عہد میں رہا ہے اور آج بھی اس کا سحر قائم ہے۔ نئے عہد کے جن شعرا نے اپنی توجہ مبذول کرائی ان میں کافی نام شامل ہیں۔ انہیں میں سے ایک نام خورشید اکبر کا ہے جو کافی عرصہ سے عروس سخن کی مشاطگی اور فن کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ جن کی عمر عزیز کا ایک حصہ قلم کی جولانیوں اور علم و ادب کی فکر سامانیوں میں صرف ہوا۔ ان کے اشعار میں وہ سب کچھ ہے جو کسی شاعر کے لیے سرمایۂ افتخار ہو سکتا ہے۔ انہوں نے فنی روایات کے ساتھ جودت طبع اور جدت فکر کو نمایاں رکھا ہے۔

اس وقت میرے سامنے ان کی غزلوں کا مجموعہ ''فلک پہلو میں'' ہے اس لیے میری تحریر کا موضوع موصوف کی غزلیات ہیں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کر کے یہ محسوس ہوتا ہے کہ خورشید اکبر نے غزل کے نئے رویوں کو اپنایا ہی نہیں بلکہ انہیں قابل عمل بھی بنایا ہے اور اپنے ہنر کو کمال عطا کرنے کے لیے مشقت و لگن سے کام لیا ہے۔ جس سے ان کا ہنر گوہر آبدار بن گیا ہے۔

ان کے کلام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے موضوعات کا دامن وسیع ہے۔ جس میں رنگا رنگ اشعار کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ آپ بھی اس خوشبو کو محسوس کریں۔

ایک پانی ہے عدم ایک وجود — اوڑھ لوں یا کہ بچھا لوں پانی

شاخ مژگاں کے پرندے ہیں یہ آنسو گویا — آب و دانہ لیے تقدیر نکل آئی ہے

روتا ہوں تو سیلاب سے کٹتی ہیں زمینیں — ہنستا ہوں تو ڈھ جاتے ہیں کہسار مری جاں

ستارے ٹوٹتے ہیں کروٹوں پر — فلک پہلو میں شب بھر جاگتا ہے

بجھتے بجھتے بھی ہوئی آتش جاں تیز بہت — اور جو رسم تھی باقی وہ شرارے کی ہوئی

بدن کیسا وظیفہ ہے نظر کا | وہ مجھ میں روح بن کر جاگتا ہے
کہیں اندر سسکتی ہے کوئی شئے | کہیں خوش پوش منظر جاگتا ہے
خوں ابلتا ہے نکلتا ہے دھواں آنکھوں سے | دیکھ پانی کی یہ تحریر نکل آئی ہے
وہ اک ٹوٹی ہوئی کشتی پڑی تھی ریگ ساحل پر | اسی ٹوٹی ہوئی کشتی کو دریا پار ہونا تھا
وہ ایک آئینہ چہرے کی بات کرتا ہے | وہ ایک آئینہ پتھر سے ہے زیادہ کیا

ان کے درج بالا اشعار فن اور زندگی کے نظریات کے عکاس ہیں۔ انہوں نے غزل میں اپنے فکری و معنوی ابعاد کو اختصار اور ہنر کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ جس سے اس کا شعری حسن بڑھ گیا ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔

اک شہر زمیں بوس ہے آمد پہ تمہاری | رستے میں بچھے ہیں در و دیوار مری جاں
دنیا کا اثاثہ اسی دنیا کے لیے ہے | بہتر ہے مجھے بے سروسامان کیا جائے
صحرا میں خوب نقش قدم آپ نے چنے | کچھ آبلوں کے پھول مرے خواب نے چنے
یہ ابرو کا علاقہ ہے یہاں پر | فضا کی بادشاہی کھیلتی ہے
میں اپنی آخری کشتی ڈبونے والا ہوں | مرے لہو کے سمندر تمہیں کنارہ ملے

'فلک پہلو میں' خورشید اکبر کے فن کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں لطف و انبساط کے ساتھ غم جہاں کے نوع بہ نوع اور خوبصورت مرقعے شامل ہیں جس کی وجہ سے ان کے شعری لذت و فن پر وابستگان علم و ادب کیف حاصل کرتے رہیں گے۔

غزل نے عصر جدید میں جو نئے نئے امکانات پیدا کیے ہیں یا عہد نو کے اسلوب فکر اور طرز احساس نے اردو غزل کے حسن میں جو اضافہ کیا ہے۔ خورشید اکبر کی غزل اس کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ ان کے فکر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اسے انتہائی فنکاری اور مکمل اہلیت کے ساتھ شعر کے پیکر میں ڈھال دیتے ہیں۔ جس سے ان کے پیرایۂ اظہار میں کہیں الجھاؤ محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک فنی سحر طرازی کا احساس ہوتا ہے۔

پتھر سے بھی شدید ہے ان کی ہر ایک چوٹ | وہ گل خیال خاطر احباب نے چنے
ساحل سے سنا کرتے ہیں لہروں کی کہانی | یہ ٹھہرے ہوئے لوگ بغاوت نہیں کرتے
میں ترے وصل کی تعریف بیاں کرتا ہوں | داستان جر کے مارے کی ہوئی جاتی ہے
یہ بدن اف مگر نہیں کرتا | سہتا رہتا ہے تازیانۂ جاں

خورشید اکبر کے ہنر میں جدت، دلکشی، فکر و نظر کی تازہ کاری، ذاتی اور عصری کرب اور عظمت

انسان جیسی اعلیٰ قدریں پائی جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں وسعت فکر پیدا ہوگئی ہے۔ کیوں کہ انہیں اظہار پر قدرت ہی نہیں بلکہ وہ اظہار میں فنی اثر کو سمونے کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔ جس سے ان کے اظہار میں ندرت پیدا ہوگئی ہے۔ اور ان کی شاعری میں ایک تہذیبی پس منظر آگیا ہے جو مختلف جذباتی اور ذہنی پہلوؤں کی ترجمان کا بیان بھی ہے۔ لیکن ان کے اشعار میں اس سے کہیں زیادہ اس کشمکش کا اظہار بھی ملتا ہے۔ جو آج کے دور کا المیہ ہے جو اس وقت دنیا میں کسی نہ کسی طور سے نمایاں ہے۔ مثلاً نا آسودگی، بے بسی، ہجرت کا کرب، منافرت، نسلی رنگ و مذہب کے المیے کو خورشید اکبر نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں ان تمام کشمکش کا اظہار انتہائی فنکاری اور تازہ کاری کے ساتھ نمایاں ہے۔ جس سے ان کی شاعری بلندی کی طرف سفر کرتی نظر آتی ہے۔

شہر بے آب ہوا جاتا ہے — اپنی آنکھوں میں بسا لوں پانی

پھول کھلتے ہیں کہ بارود خبر بھی دینا — کتنا شاداب ہے اور کتنا چمن آگ ہے آگ

کہیں پتے تو کہیں پیڑ گرائے گی ہوا — اب کے موسم میں عجب دھار چلائے گی ہوا

اس زمیں پر خون کی ہولی ہوئی، ہوتی رہی — تیری دیوالی کہاں، تیرا دسہرا آسماں

ہمارے شہر کی تصویر ہے یہ — قیامت بال کھولے سو رہی ہے

نہ جانے کس خطا پر اپنی بستی — جنازے پر جنازے ڈھو رہی ہے

تہہ بہ تہہ خون سے گلنار رہے رخسار وطن — کوئی منظر پس منظر پہ اٹھائے ہوئے ہے

ہم لوگ مہاجر کی طرح جی نہیں سکتے — اس شہر میں اب آخری اعلان کیا جائے

مری آنکھوں میں کوئی خواب مہاجر ٹھہرے — رات کے پچھلے پہر درد کہانی بولے

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ انسان اپنے ماحول اور معاشرے کے ارد گرد رونما ہونے والے حالات و واقعات سے الگ نہیں ہوسکتا۔ چونکہ شاعر بھی اسی معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے، وہ خود کو کس طرح اپنے کو ماحول سے الگ کرسکتا ہے۔ خورشید اکبر ایک حساس فنکار ہیں۔ انہوں نے اپنے ماحول کا گہری نگاہ سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے درج بالا اشعار ان کے حساس ذہن کے غماز ہیں۔

خورشید اکبر نے اپنے خلوص فن کے ذریعے اپنے شعر رویے ہم تک پہنچائے ہیں جس میں اسلوب کی کارفرمائی اپنی جگہ، لیکن فکر و نگاہ اور خیالات کی ہمہ جہتی نے ان کی غزلوں کو ایک نیا انداز فکر عطا کیا ہے۔

خورشید اکبر میری نگاہ میں اس لیے اور بھی قابل قدر ہیں کہ انہوں نے اپنی فکری توانائی صرف کر کے نئے اسلوب اظہار کے حوالے سے اپنی شناخت قائم کرائی ہے۔

مجاهد آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی:
حقائق کی روشنی میں

ڈاکٹر شفیق اجمل (وارانسی)

زندہ قوموں کی یہ علامت ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنے محسنین کو فراموش نہیں کرتیں۔ بلکہ ان کے کارناموں کو دہراتی رہتی ہیں۔ جو قوم اپنے اکابرین و محسنین کی خدمات کو فراموش کر دیا کرتی ہیں۔ تاریخ اس قوم کو کبھی معاف نہیں کرتی اور ایسی قوم کے نقوش بہت جلد تاریخ کے صفحات سے مٹ جایا کرتے ہیں۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بے شمار علما نے اپنی جان کی قربانیاں پیش کیں۔ ہمارے ان عظیم محسنین اور مجاہدین میں ایک نمایاں شخصیت حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کی ہے جو انقلاب ۱۸۵۷ء میں علما اور مجاہدین کے قائد و رہنما تھے۔

علامہ فضل حق خیر آبادی علما متاخرین میں ممتاز ترین مقام رکھتے تھے۔ ان کے معاصر علما اور تذکرہ نگاروں نے ان کے بارے میں جن تاثرات کا اظہار کیا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے عہد میں کتنے مقبول تھے اور لوگوں کی نظروں میں ان کی علمیت اور مختلف علوم خاص طور پر فلسفہ پر ان کی بصیرت افروز نظر مخفی نہیں تھی۔ وہ ایسا ماہتاب تھے کہ معاصرت کا حجاب بھی ان کے علمی مقام کو محجوب نہ کر سکا اور ان کے معاصرین بلکہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے بارے میں بڑے عقیدت مندانہ انداز میں لکھا ہے۔ ان کے بارے میں سرسید احمد خاں نے ایک تفصیلی مقالہ لکھا ہے۔ چند جملے یہ ہیں:

> ”مجمع کمالات صوری ومعنوی، جامع فضائل ظاہری و باطنی، بناء بنائے فضل و افضال، بہار آرائے چمنستانِ کمال، متکی ارائیک اصابت رائے، مسند نشین دیوان افکار رسا، صاحب خلق محمدی، مورد سعادات ازلی و ابدی، حاکم محاکم مناظرات، فرماں روائے کشورِ محاکمات، عکس آئینۂ صافی ضمیری، ثالث اثنین بدیعی وحریری، مبطل باطل ومحقق حق، مولانا محمد فضل حق۔“

(آثار الصنادید، ص:۸۸)

امیر مینائی انتخاب یادگار میں لکھتے ہیں:

''افضل الفضلا، باکمل الکملا، فضائل دستگار، فواضل پناہ، جناب مولوی فضل حق صاحب فاروقی، فنون حکمیہ میں مرتبہ اجتہاد، بڑے بڑے ادیب، منطقی، نہایت ذہین، نہایت ذکی طلیق و ذلیق، انتہاء کے صاحب تدقیق وتحقیق اپنے والد ماجد مولانا فضل امام کے شاگرد رشید۔''

(انتخاب یادگار، ص۲۶۱)

علامہ عبدالحیٔ لکھنوی نے نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے:

''شیخ امام، عالم کبیر علامہ فضل حق بن فضل امام الحنفی، الماتریدی، الخیرآبادی کا شمار مشہور اساتذہ میں ہوتا ہے۔فنون حکمیہ اور علوم ادبیہ میں آپ بے نظیر تھے۔''

(نزہۃ الخواطر، ص۷/۳۷۴)

علامہ جعفر تھانیسری نے لکھا ہے:

''مولوی فضل حق معقولی خیرآبادی جو اس زمانے میں حاکم اعلیٰ شہر دہلی سر رشتہ دار اور علم و منطق کے پتلے اور افلاطون و بقراط وسقراط کی غلطیوں کی تصحیح کرنے والے۔''

(حیات سید احمد شہید، ص۳۰۴)

علامہ کے صاحب زادے مولانا عبدالحق خیرآبادی نے ایک مرتبہ فرمایا:

''دنیا میں ساڑھے تین حکیم (فلسفی) ہوئے ہیں۔ایک معلم اول ارسطو، دوسرے معلم ثانی فارابی، تیسرے والد ماجد مولانا فضل حق خیرآبادی اور نصف بندہ۔''

(ذکر علماء)

علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

''مولانا فضل حق خیرآبادی جن کے دم عیسوی نے معقولات میں روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت مشہور ہوئے دیار واطراف سے طلبہ نے ان کی طرف رجوع کیا اور منطق وفلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا۔مولانا فضل حق خیرآبادی کے تلامذہ ور تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم

معقول کو بڑی رونق بخشی اور بڑے کمال کے مدرس ثابت ہوئے۔''

(حیات شبلی، ص ۲۲)

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے ان کے انتقال پر اس طرح اظہار عقیدت کیا:

''فخر ایجاد و تکوین مولانا فضل حق ایسا دوست مر جائے اور غالب نیم مردہ، نیم جاں رہ جائے۔''

(غالب کے خطوط)

ان چند اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ فضل حق خیر آبادی کو ان کے زمانے میں اور ان کے بعد بھی کیا مقام حاصل تھا اور ان کے معاصر اور بعد کے تذکرہ نگاروں نے ان کی علمیت اور فضیلت کا کس کھل دل سے اعتراف کیا ہے۔

علامہ فضل حق خیر آبادی ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں خیر آباد ضلع سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد فضل امام خیر آبادی اپنے دور کے ممتاز علما میں تھے۔ منطق و فلسفہ میں تبحر تھا اور دارالحکومت دہلی میں ''صدر الصدور'' کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔ ۳۲ رواسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

علامہ فضل حق خیر آبادی نے جملہ علوم وفنون کی تعلیم اپنے والد مولانا فضل امام سے حاصل کی علوم نقلیہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کی شاگردی نے انہیں یگانۂ روزگار بنا دیا۔

آپ کی تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے تیرہ برس کی عمر میں آپ نے جملہ علوم مروجہ عقلیہ ونقلیہ کی تکمیل کی۔ چار ماہ اور کچھ روز کی مختصر سی مدت میں قرآن مجید کا حفظ کیا۔ آپ کے دور کے اکثر علما آپ کی ذہانت کے مداح تھے۔ اس واقعہ سے ان کی ذہانت کا خوب اندازہ ہوتا ہے کہ جب حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے شیعوں کے رد میں ''تحفۂ اثنا عشریہ'' تحریر فرمائی تو ہندوستان کے علاوہ اہل تشیع کے ایرانی علما میں ایک زبردست ہیجان برپا ہوا۔ چنانچہ وہ مناظرہ کے لیے اونٹوں پر کتاب لیے دہلی پہنچے۔ شاہ صاحب نے میزبانی کرتے ہوئے قیام کا انتظام کروایا۔ علامہ فضل حق شام کو وہاں پہنچے ایرانی مجتہد سے کچھ گفتگو ہوئی ''پوچھا صاحبزادے کیا پڑھتے ہو؟'' علامہ نے جواب دیا کہ ''شرح اشارات، شفا اور افق مبین وغیرہ پڑھتا ہوں۔'' مجتہد نے افق مبین کی کسی عبارت کا مطلب پوچھا تو علامہ نے اس پر مدلل تقریر فرمائی اور پھر ایسا معارضہ قائم کیا کہ ان کا جواب دینا دوبھر ہو گیا۔ آخر میں علامہ نے یہ کہتے ہوئے رخصت طلب کی کہ میں حضرت شاہ صاحب کا ادنیٰ شاگرد اور کفش بردار

ہوں۔ علمائے ایران نے اندازہ کرلیا کہ اس خانقاہ کے بچوں کے علم وفضل کا جب یہ عالم ہے تو خود شیخ کے علم وفضل کا کیا حال ہوگا چنانچہ رات ہی میں وہ افراد راہِ اختیار کر گئے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی نے ہندوستان میں فلسفہ کی روایت کو زندہ رکھا اس فن میں انہیں کافی مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے فلسفہ کے مسائل کو نہایت سہل زبان میں بیان کیا، جس کی وجہ سے بھی فلسفہ کی تعلیم کو یہاں نئی زندگی ملی۔ مولانا کی متعدد کتابیں ہیں۔ ان میں سب سے مشہور ہدیہ سعیدیہ ہے، جو فلسفہ کے لیے بالکل درسی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ دراصل یہ کتاب انہوں نے اپنے بیٹے مولوی عبدالحق کی تعلیم کے لیے لکھی تھی۔ بعد میں کچھ اضافوں کے بعد اس کو کتابی شکل میں شائع کردیا جواب بیشتر دینی مدارس کے نصاب کا حصہ ہے۔

حضرت علامہ اپنے دل میں حمایت اسلام کا خاص جذبہ رکھتے تھے۔ مولوی اسماعیل دہلوی نے امتناع النظیر، امکان نظیر، رفع یدین، آئین بالجہر کی بحثیں چھیڑیں اور بات بات پر مسلمانوں کو مشرک ومرتد کہنا شروع کیا۔ تو پہلے حضرت علامہ نے انہیں خوب سمجھایا، لیکن وہ نہ مانے تب علامہ نے تحریری وتقریری رد فرمایا اور ان کے رد میں ''تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ'' اور ''امتناع النظیر'' تحریر فرمائی۔

حضرت علامہ کو عربی زبان پر کافی مہارت حاصل تھی۔ آپ ایک قادرالکلام عربی شاعر تھے چار ہزار سے زائد عربی اشعار کہے۔ اپنے زمانۂ اسیری ''کالا پانی'' کے دوران فصاحت و بلاغت اور درد انگیز پیرایۂ بیان میں جو ''الثورۃ الہندیہ'' تحریر فرمائی ہے اس سے ان کی عربی زبان پر عبور اور قدرت کاملہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں دہلی میں ریزیڈنٹ ہوتا تھا۔ علامہ فضل حق خیرآبادی اس محکمہ کے پیشکار تھے۔ ایک عرصہ تک ریاست جھجر، الور، ٹونک اور رامپور کے درباروں کی رونق وزینت رہے۔ پھر آپ لکھنؤ چلے آئے اور وہاں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز رہے۔ زمانۂ ملازمت میں علامہ نے نہایت دیانتداری اور انصاف پسندی سے کام لیا۔ جس کے سبب حکام اور رعایا دونوں آپ سے خوش رہتے تھے اور اپنے انصاف پروری کی بنا پر آپ لوگوں کے درمیان ہردلعزیز تھے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کی علمی حیثیت تو مسلم تھی ہی سیاسی اعتبار سے بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ جنگ آزادی میں مجاہدین کے قائد و رہنما تھے۔ آپ نے برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستانیوں کا جذبۂ حریت بیدار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں مولانا نے بہت مؤثر کردار ادا کیا۔ جب یہ ہمگامے شروع

ہوئے تو علامہ اس وقت الور میں تھے۔علامہ وہاں سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔راستے میں لوگوں کو جہاد آزادی کی ترغیب دیتے رہے۔منشی جیون لال نے ذکر کیا ہے کہ ۱۶ اراگست ۱۸۵۷ء کو مولانا دربار میں پہنچے۔اس کے بعد متعدد مرتبہ دربار میں حاضری دی، جس کا تذکرہ ۱۸۵۷ء کے تاریخی روزنامچے میں ہے۔دہلی میں علامہ نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔علامہ کا یہ فتویٰ جامع مسجد دہلی میں جمعہ کی نماز کے بعد سنایا گیا۔اس کے بعد تحریک آزادی نے مزید زور پکڑا۔لیکن علامہ اور ان جیسے ہزاروں سرفروشوں کی سعی بسیار کے باوجود یہ سعی انقلاب کامیابی سے ہم کنار نہ ہوسکی اور مجاہدوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔انگریز فوج اپنے حامیوں کی مدد سے غالب آگئی اور دہلی پر ان کا قبضہ ہوگیا۔اس کے بعد داروگیر کا سلسلہ شروع ہوا۔علامہ بھی گرفتار ہوئے اور لکھنؤ میں ان پر مقدمہ چلا۔مقدمہ کی بنیادی دفعات میں مولانا کا مغلیہ دربار میں جانا، ایک باغی سردار موخاں کی کونسل میں شریک ہونا اور بغاوت اور انگریزوں کے قتل میں لوگوں کی مدد کرنا شامل تھے۔

علامہ فضل حق بادشاہ کی مشاورتی ''کنگ کونسل'' میں شامل تھے۔انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دینا، بادشاہ کی کنگ کونسل میں شامل ہونا، تحریک آزادی کی جملہ سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہوئے بادشاہ اور مجاہدین سے مسلسل رابطے میں رہنا۔یہ سارے وہ نکات ہیں جن سے علامہ کی تحریک آزادی میں عملی شرکت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔بہرحال ان ''جرائم'' پر لکھنؤ کی عدالت نے علامہ کو ''مجرم'' گردانتے ہوئے عمر قید اور کالے پانی کی سزا سنائی۔اور انگریز انتظامیہ نے اس سزا کو بعجلت تمام نافذ کردیا۔علامہ نے جس طرح کی شاہانہ زندگی بسر کی تھی ان کے لیے یہ قید و بند کی صعوبت اور دیار غیر میں بے سروسامانی میں سکونت نہایت شاق تھی لیکن علامہ نے عزیمت بن کر اس فیصلے کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور زبان سے ایک حرف شکایت نہ نکالا۔اگرچہ علامہ کے احباب و متوسلین اپنے طور پر علامہ کو اس قید و بند سے رہائی کے لیے کوشش کرتے رہے اور وہ کامیاب بھی ہوئے۔لیکن جب تک پروانۂ رہائی ان تک پہنچتا وہ اس دارفانی سے کوچ کرچکے تھے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کی زندگی میں سعی انقلاب ۱۸۵۷ء کا واقعہ کسی طوفان کی طرح آیا اور علامہ کو اپنے ہمراہ لے گیا۔اس حادثہ سے مولانا کی حب الوطنی، عزیمت اور جاں نثاری کی ایک مثال قائم ہوئی۔

علامہ فضل حق خیرآبادی ایک عظیم دانشور، فلسفی، شاعر اور عربی زبان کے مزاج شناس ہونے کے ساتھ عربی کے بہترین نثرنگار اور شاعر تھے۔اس کے ساتھ وہ عظیم مجاہد آزادی بھی تھے۔تاریخ ہند کے صفحات مولانا کو نہ صرف ان کی علمیت اور فضل و کمال کے لیے یاد رکھیں گ بلکہ وہ اپنے

عظیم مجاہدانہ کارناموں اور اپنی عزیمت وایثار کے لیے بھی یاد رکھے جائیں گے۔

ابر رحمت ان کی مرقد پر گہر باری کرے
حشر تک شانِ کریمی ناز برداری کرے

فنا کے بعد بھی باقی ہے شانِ رہبری تیری
خدا کی رحمتیں ہو اے امیر کارواں تم پر

C/o Hakim Fabrics, B. 16/74-A, Pandey Haveli, Madanpura,
Varanasi-221001 (U.P.) Cell: 09839655808
email: sajmalqadri@gmail.com

یٰسین احمد۔۔۔۔دھار کے آئینے میں

بلراج بخشی (ادھم پور)

یٰسین احمد کے افسانوں کا مجموعہ 'دھار' پڑھ ایک حیرت زا مسرت ہوئی کہ ان کا کوئی طے شدہ ایجنڈا نہیں ہے۔ آج جبکہ اردو کے بیشتر قلمکار قبیلیائی، گروہی اور علاقائی تحفظات و عصبیتوں کی حمایت میں قلم کو لٹھ کی طرح پکڑ کر کھڑے ہو گئے ہیں اور صارفی سطح پر کسی نہ کسی نظریے کی اشاعت میں مغلوب الغضب ادب مینوفیکچر کر رہے ہیں، یٰسین احمد ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں نظر آتے ہیں جنھوں نے عصری سیاسی و معاشرتی مسائل کی صحافیانہ ترجمانی پر کہانی کے فن کو ترجیح دے کر کہانی کو زندہ رکھا ہے۔ فنکار کبھی بھی اپنے عصر سے بے خبر نہیں ہوتا۔ دوسروں کی طرح وہ بھی اپنے معاشرے کے سروکاروں سے متاثر ہوتا ہے اور دوسروں سے کچھ زیادہ ہی۔ لیکن وہ فوری طور پر مشتعل ہو کر خشت باری نہیں کرتا اور نہ ہی دیوانہ وار رقص کر کے اظہار مسرت کرتا ہے۔ بلکہ غیر شعوری طور پر کسی واقعے کو حک و ترمیم کے طویل عمل سے گزار کر اس کی قلب ماہیت کرتا ہے اور تب جا کر اس کا کوئی تجربہ تخلیق کی صورت میں ڈھلتا ہے۔ فن اور طباخی میں یہی فرق ہے۔

ترقی پسندی کے دور میں بھی افسانے کے موضوعات بڑے نہیں تھے۔ دراصل ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب نے ہندوستانی مفکرین کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ لہٰذا معاشرتی پسماندگی کے اس دور میں معاشرتی طبقہ بندی، مرد محکوم معاشرے میں عورتوں سمیت زیردستوں کا استحصال، ظلم، اور زیردستوں کی رضا کارانہ اور معصومانہ قربانی جیسے سروکاروں نے انسانیت کے ارفع ترمرحلے سر کرنے کی کوشش کی۔ ایک مساوات آگیں معاشرے کا قیام ترقی پسندوں کا نصب العین تھا مگر یہ ارفع تر مقصد بھی ان سے بڑے افسانے نہیں لکھوا سکا اور اس کے باوجود اگر یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ اس دور میں بہترین افسانے لکھے گئے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ افسانے کے فن سے واقف تھے۔ زبان و بیان کی گلکاری اور سحر انگیز انداز بیان کے ساتھ وہ لوگ واقعات کی بنت اس طرح کرتے کہ قاری ان کی انگلی پکڑ کر بلا مزاحمت چل پڑتا تھا۔

آج حالت یہ ہے کہ معاصر سیاسی اور معاشرتی محاذ آرائیوں کی صحافیانہ ترجمانی شعروادب

کی معراج قرار پا گئی ہے اور اخباروں کی سرخیوں کو موضوعِ ادب بنایا جا رہا ہے۔

لیکن عالمی کشاکش، تہذیبی پنجہ کشی اور عصری معاشرتی صف بندیاں یٰسین احمد کے افسانوں کا موضوع نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں فلسفہ یا نظریہ یا تجاہلِ عارفانہ نہیں بلکہ زندگی کی بوقلمونی دکھائی دیتی ہے۔ لاتعداد چھوٹی چھوٹی متنوع جزئیات جن سے زندگی مملو ہے، ان کے افسانوں میں جابہ جا نظر آتی ہیں جو قاری کا مانوس منظر نامہ ہیں اور قاری خود کو ان سے ہم آہنگ کر کے اگر یٰسین احمد کے ہمراہ ہو لیتا ہے تو اس لئے کہ یٰسین احمد کوئی اِزم نہیں بیچ رہے ہیں اور نہ ہی تختۂ اشتہار بنے ہوئے ہیں، بلکہ کہانی سنا رہے ہیں اور کہانی سننا انسان کا قدیم ترین مشغلہ ہے۔

عہدِ قدیم کی قصہ گوئی اور آج کے افسانے میں کوئی فرق نہیں۔ پہلے قصہ بیان کیا جاتا تھا مگر چھاپہ خانہ وجود میں آجانے سے پڑھنے کی روایت بن گئی۔ جدید افسانہ اسی روایت کی توسیع ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا کا ہر شخص کہانی کہتا ہے اور کہانی سنتا ہے۔ ہر صبح جب ہر شخص تلاشِ معاش میں دہلیز سے باہر جاتا ہے تو دن بھر مختلف معاشرتی اور جذباتی تغیرات، واقعات اور تجربات سے دوچار ہوتا ہے اور گھر واپس آکر اپنے اقربا سے اپنے تجربات شیئر کرتا ہے۔ یہ تجربہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی واقعہ، کوئی کردار، کوئی خیال، کوئی ڈر، کوئی جذباتی کیفیت، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ افسانے کے موضوعات کی فہرست بندی نہیں کی جا سکتی۔ یٰسین احمد بھی قاری سے اپنے تجربات صرف شیئر کرتے ہیں، کوئی پیغام نہیں دیتے اور اسی لئے ان کا انداز والہانہ اور تصنع سے عاری ہے۔

امریکہ میں دس ہزار الفاظ تک کی کہانی کو مختصر کہانی کہا جا سکتا ہے، اِنگلینڈ میں پانچ ہزار اور آسٹریلیا میں ساڑھے تین ہزار الفاظ پر مشتمل کہانی کو مختصر افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یٰسین احمد کی بیشتر کہانیاں الفاظ کے اعتبار سے آسٹریلیائی سانچے میں ڈھلی لگتی ہیں۔ ان کی کئی کہانیاں ڈیڑھ سے دو ہزار الفاظ تک ہیں۔ دھار کی کہانیوں کا جامع اختصار ہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔

دراصل بڑا موضوع بڑا ادب نہیں بناتا۔ عالمگیر مسائل کے تذکرہ سے بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ دھار کے موضوعات بڑے نہیں ہیں بلکہ عام زندگی سے ماخوذ ہیں۔ ان کے کئی افسانوں کے واقعات غیر اغلب لگتے ہیں لیکن فن کسی تھانے کا روزنامچہ نہیں ہے اور فن پارہ حقیقی واقعات کا محض رپورتاژ نہیں ہے۔ بلکہ ان حقیقی واقعات میں جب نہ صرف امکانات بلکہ ناامکانات اور غیر ممکن ممکنات بھی در آتے ہیں تو قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور راست اندازی، عشقیہ واردات، جنسی کشش، نیکی بدی، جذباتی پاکیزگی، ہمدردی، خلوص، عقیدت وغیرہ کی اعلیٰ صداقتوں کی تجدید ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فروعیات کی آلائشوں سے مبرا یٰسین احمد کے افسانوں میں شروع سے آخر تک

اس حد تک تسلسل اور ربط رہتا ہے کہ قاری نظر نہیں ہٹا سکتا۔ افسانہ ختم ہونے کے مقام پر آجاتا ہے پر تجسس اور تحیر برقرار رہتا ہے کہ آخر کیا ہوگا۔ لیکن آخری چار پانچ سطروں میں اور کئی بار تو آخری جملے ہی میں یٰسین احمد قاری کو چونکا دیتے ہیں اور قاری سوچتا رہ جاتا ہے کہ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔

دھار کے افسانوں کے کردار و واقعات ہمارے اردگرد کی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ افسانہ ونکم بے اختیار ہی فلمی اداکاراؤں منداکنی، کرشمہ، کرینہ اور ان کے دادا راج کپور کی یاد دلا دیتا ہے۔ درماں میں Live in relationship کی بات تو کی گئی ہے لیکن یٰسین احمد کسی اصلاحکار کی طرح عورت مرد میں اس طرح کے تعلق کو اچھا یا برا نہیں کہتے بلکہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں اور حالات و واقعات کے پیش نظر قاری بھی کوئی فیصلہ نہیں دے پاتا۔ اسی طرح سمتوں کا تعین میں بھی وہ بین المذہبی شادی سے پیدا ہونے والے مسائل کا اشاریہ تو ہیں پر کسی مفتی کی طرح کوئی حل فراہم نہیں کرتے۔ ساڑھے تین صفحات کے افسانے کسے اپنا سمجھیں میں وہ بڑی سلاست سے ذہن میں خلش پیدا کر دیتے ہیں کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی اپنے باپ کو اپنے دوستوں میں نوکر کی حیثیت سے متعارف کروائے۔ دو صفحات پر مشتمل افسانہ مغفرت میں ایک شخص اپنے لئے پیشگی قبر بنوا کر ہر جمعے کو اپنے لئے فاتحہ پڑھتا ہے، دراصل اولاد پر کامیاب طنز ہے۔ اسی طرح بدعائیں، آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اچھے افسانے ہیں۔ سات نمبر کی سینڈل، سر اور چابی میں آخر تک تجسس اور سسپنس رہتا ہے لیکن یٰسین احمد آخری چار پانچ سطروں میں حسب عادت چونکا دیتے ہیں۔ کچھ نہیں، میں واقعی کچھ نہیں ہے لیکن یہ افسانہ نگار کی فنی چابکدستی کا ثبوت ہے کہ کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی افسانہ ایک خوشگوار تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ اسی طرح افسانہ کوئی گناہ نہیں کیا، میں حامد بھائی قاری کی نظروں میں ایک قابلِ نفریں شخص کی حیثیت میں اُبھرتا ہے لیکن یٰسین احمد کا کمال ہے کہ آخری تین سطروں میں وہ قاری سے تمام تر ہمدردی بٹور لیتا ہے۔ عنوانی افسانہ دھار دراصل نفسیاتی افسانہ ہے۔ کسی کا مسلسل ناپسندیدہ عمل ناہید کے ذہن میں شدید نفرت کا مہیج بن کر اس کے رخسار پر جلن کا ردِعمل پیدا کرتا ہے۔ یہ بے ضرر مگر اچھا افسانہ قاری کے ذہن میں کئی اقسام کی خلشیں پیدا کر دیتا ہے۔

یٰسین احمد کے افسانوں کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ کسی مسئلے، کشاکش یا طبقاتی اور قبیلیائی آویزش کا یقینی حل پیش نہیں کرتے اور نہ ہی کسی قسم کی عصبیت انگیزی اور تخلیقی یا ادبی کثافت کی افزودگی کرتے نظر آتے ہیں اور یہی یٰسین احمد کی روشن فکری اور ان کے صحتمند ادبی رجحان کا ثبوت ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں کوئی ماورائے ارض دنیا خلق نہیں کرتے بلکہ ان کے افسانوں کی فضا قرب وجوار کا جانا پہچانا منظر نامہ ہے۔ دھار میں یٰسین احمد عدم تشاکل کے داعی بن کر ابھرے ہیں۔ نہ تو وہ

افسانے اور قاری کے درمیان تقریر کرتے نظر آتے (صرف دو ایک جگہ پر یہ نادانستہ یک جُملی تسامحات نا قابل اعتنا ہیں)اور نہ ہی وہ استنباط کا مرتکب ہوتے ہیں۔دھار کے افسانے ژولیدہ فکری اور ماضی کے جبر سے ایک خوشگوار استثنےٰ ہیں۔دھار...اردو کے افسانوی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔میں نے دھار کو فنی سطح پر اِنجوائے کیا ہے۔

3/13, Eidgah Road, Adarsh Colony, Udhampur-182101 (J&K)

Mob: 09419339303   email: balrajbakshi1@gmail.com

ھند کے افسانوی ادب میں داستان کا مقام

ذاکر حسین ملک بھلیسی (جموں و کشمیر)

داستان اردو افسانوی ادب کی قدیم ترین صنف ہے۔ واقعات کو قوت متخیلہ کے سہارے بیان کرنے ہی کو افسانہ گوئی کہتے ہیں۔ اگر چہ افسانہ کے لغوی معنی جھوٹی اور فرضی کہانی ہے لیکن ہر افسانے کے پیچھے کوئی واقعہ ہوتا ہے اور ہر واقعہ بیان ہوتے ہوئے کہانی بن جاتا ہے۔ کہانی اصناف ادب کی کئی قسموں میں منقسم ہے۔ داستان، قصہ، حکایت، ناول اور مختصر افسانہ۔ سب کہانیوں ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ہر ایک کے اندر کوئی نہ کوئی کہانی یا کوئی واقعہ ضرور ہوتا ہے۔

داستان کی روایت ان چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور روایتوں سے جڑی ہوئی ہے جن کا جنم انسانی تہذیب کے ساتھ ہوا۔ انسان کی فطری خواہش اور معاشرتی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے آلام و مصائب سے دور کسی فردوس میں رہ کر تمام شادمانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے اور اپنے فرصت کے لمحات میں دل و دماغ کی راحت کے لئے کوئی ذریعہ پیدا کرے۔ داستان اس کے لئے دل بہلانے کا ذریعہ بن گئی۔ غالب نے ایک دیباچہ میں لکھا ہے۔

'داستان طرازی منجملہ فنون سخن ہے، سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لئے اچھا فن ہے۔'

دراصل داستان ایسی ذہنی آسودگی کا نام ہے جو پریشانیوں کے احساس کو ختم کر کے نیند کی پر سکون وادی میں پہنچا کر حسین خوابوں کے جھروکے کھول دیتی ہے۔ داستان فرضی اور فرسودہ کہانیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ کہانی کی طویل اور پیچیدہ صنف کو داستان کہا جاتا ہے۔ کہانی قصہ در قصہ ہو کر داستان بنتی ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کتاب فن داستان گوئی کے صفحہ نمبر 14 پر لکھتے ہیں۔

''داستان کہانی کی طویل اور پیچیدہ بھاری بھرکم صورت ہے''

قصہ میں حسن وعشق کی خوش نمائیوں، خیر و شر کی لڑائیوں اور مافوق الفطرت عناصر کو شامل کر کے حیرت و استعجاب کی فضا پیدا کر کے پیش کرنے کا نام داستان ہے۔ داستان کے فن کا بنیادی عنصر اس کی طوالت ہے۔ داستان اس ماحول کی پیداوار ہے جہاں لوگوں کے پاس فرصت اور اطمینان کی

افراط تھی۔غم روزگار سے بے نیاز تھے۔ظاہر ہے ایسی صورت میں وقت گزارنے کے لئے رقص وسرود کے علاوہ سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ داستان سننا ہوسکتا تھا جس کے سننے سے دونوں کا مزہ بیک وقت حاصل ہو جاتا تھا۔اسی لئے داستان گوایک کہانی میں بہت سی کہانیاں شامل کرکے داستان کوطول دینے کی کوشش کرتا تھا لیکن ہر کہانی بنیادی قصہ کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔داستان گو دوسری کہانی اس فنکارانہ حسن کے ساتھ شریک داستان کرتا تھا کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی تھیں۔بات سے بات اس طرح پیدا کی جاتی تھی کہ سننے والے کو بے ربطی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔داستان کی طوالت اور سامعین کے اشتیاق کا اندازہ ان واقعات سے لگایا جاسکتا ہے جولکھنؤ کی داستان گوئی کے بارے میں مشہور ہیں۔کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے کسی امیر کے یہاں ایک داستان گوقصہ گوئی کے لئے ملازم تھا۔وہ ایک داستان بیان کررہا تھا کہ جس میں کسی شہزادے کی بارات کا ذکر تھا کہ بارات سسرال کے دروازے تک پہنچ چکی ہے۔اسی دوران داستان گوکوکسی اشدضروری کام سے باہر جانا پڑ گیا۔امیر کے کہنے پر داستان گوداستان سنانے کے لئے شاگردکومقرر کرگیااوراس سے کہہ گیا کہ جلد واپس آؤں گا تب تک تم داستان کوسنبھالے رکھنا۔داستان گو پندرہ دن بعد جب لوٹ کرآیا تو معلوم ہوا کہ بارات ابھی وہیں کھڑی ہے جہاں وہ چھوڑ کر گیا تھا یعنی شاگرد نے پندرہ دن بارات کی شان وشوکت اورسسرال والوں کے خیر مقدم کے انتظامات میں گزاردئے۔شاگرد کے پندرہ دن کے بیان کے بعد استاد نے مزید پندرہ دن بارات کی آرائش کو بیان کرکے بارات کودروازے پر کھڑا رکھا۔ طوالت بے ربطی اور پیچیدگی کی موجودگی میں داستان سے توقع رکھنا کہ اس میں کوئی مربوط پلاٹ ہوگا، عجیب سی بات لگتی ہے۔پلاٹ کے دواقسام ہیں۔ایک سادہ اور دوسرا پیچیدہ۔سادہ پلاٹ کا مطلب یہ کہ کہانی سیدھے سادے انداز میں بیان کردی جائے یعنی کہانی کی ابتداء ہوایک درمیان اور پھر اختتام لیکن پیچیدہ پلاٹ میں ابتدااوراختتام تو ہوتا ہے لیکن درمیان میں کہانی ادھراُدھر بھٹکتی رہتی ہے۔بیشتر داستانوں کا پلاٹ پیچیدہ ہوتا ہے داستان گوایک خاص طے شدہ آغاز وانجام کوسوچ کرشروع کردیتا ہے لیکن درمیان میں قصے پیدا ہوتے جاتے ہیں اور داستان ایک وسیع دائرے میں پھیل جاتی ہے۔ ایک کہانی میں کبھی کبھی سینکڑوں کہانیاں شامل ہوجاتی ہیں اور ہر کہانی کا تعلق داستان کی بنیادی کہانی سے ہوتا ہے''بوستان خیال''اس کی واضح مثال ہے کہ جس میں بے شمار ضمنی کہانیاں شامل ہیں۔

داستان میں پیچیدہ پلاٹ کی موجودگی اس میں فنی حسن پیدا کرتی ہے۔اگر داستان گوصرف اتنا بیان کردیں کہ ایک شہزادہ تھا۔چودہ برس کی عمر میں اس نے خواب میں ایک شہزادی کی تصویر دیکھی ،عشق کا جذبہ بیدار ہوا، تلاش یار میں اپنے وطن سے نکل پڑا، کچھ دن کے سفر کے بعد شہزادی مل گئی،

شہزادی نے جس گھڑی شہزادے کو دیکھا بے اختیار عاشق ہوگئی۔ دونوں مل گئے، داستان ختم ہوگئی۔
جس طرح انہیں وصال نصیب ہوا خدا سب کی امیدیں برلائے اس میں بات پوری تو ہو جاتی ہے لیکن داستان نہیں بنتی۔ داستان مدت دراز کے بعد اختتام چاہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شہزادے کے اوپر آفاتِ زمانہ نازل کی جاتی ہیں، اسے راہ عشق میں حیران و پریشان دکھلایا جاتا ہے۔ اس صحرانوردی میں نئے نئے قصے جنم لیتے ہیں۔ جس سے داستان کے پلاٹ میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اور پیچیدگی داستان میں دلچسپی اور فنی حسن پیدا کرتی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ داستان میں ایک بے ترتیب اور بے قاعدہ پلاٹ ہوتا ہے جسے داستان گو کہانی کے ساتھ ساتھ مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔

ہر قصے کی بنیاد کرداروں پر ہوتی ہے۔ کرداروں ہی کے ارد گرد کہانی بنائی جاتی ہے، کردار ہی قصہ کو لے کر آگے بڑھتے ہیں اور کرداروں ہی کے سبب قصہ میں نشیب و فراز پیدا ہوتے ہیں لیکن داستانوں کے کردار ناول افسانے کے کرداروں کے مقابلے بہت مختلف ہیں۔ داستانوں کی کردار نگاری اس لئے دوسری افسانوی اصناف کی کردار نگاری سے مختلف ہے کہ اس کے کردار سبھی داستانوں میں تقریباً ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ داستانوں کے کردار کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ایک وہ جو خیر کی نمائندگی کرتے ہیں اور دوسرے شر پسند کردار جو جنگ و جدال میں مصروف رہتے ہیں ۔سبھی داستانوں میں خیر شر کے بیچ جنگ ہوتی ہے، اسی لئے کچھ اچھے کردار ہوتے ہیں اور کچھ برے۔ داستان کے کرداروں میں انسانی فطرت کی طرح تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ ابتدا تا آخر یکسانیت رہتی ہے۔

داستان کا مرکزی کردار یعنی شہزادہ تمام صفات کا مالک ہوتا ہے۔ حسن میں یوسف، بہادری میں رستم، عقل و دانش میں افلاطون وارسطو کو پڑھا سکتا ہے۔ تمام طلسمات توڑنے کی طاقت رکھتا ہے۔ عشق میں دیوانگی دیکھ کر مجنوں و فرہاد شرمندہ ہوں۔ یہی صورت شہزادی کی ہوتی ہے۔ ناز و نعم سے پلی اتنی نازک مزاج کہ غیر مرد کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتی ہے۔ خیر کی نمائندگی کرنے والے تمام کردار انتہائی متقی پرہیز گار دکھائے جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ عشق اور تنہائی میں سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ داستان کے برے کرداروں میں دنیا کی تمام برائیاں موجود ہوتی ہیں۔ یہ سب شہزادے کے منزل تک پہنچنے میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ کبھی جادو کے ذریعہ اور کبھی براہ راست جنگ کر کے شہزادے کو موت دینا چاہتے ہیں۔ اُن برے کرداروں میں انسانوں کے ساتھ ساتھ دیو اور جنات وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ دوسری طرف پریوں کے کردار کی صفات یکساں ہوتی ہیں۔ یہاں زیادہ تر بادشاہ، شاہزادے، شہزادیاں، وزیرزادے، جن دیو اور پریاں دیکھائی دیتے ہیں۔ داستان میں

عام طور پر کرداروں کے نام علامتی رکھے جاتے تھے۔ ان میں آخر تک تبدیلی نہیں ہوتی۔ لیکن ''سب رس'' کے کردار خاصے متحرک کردار نظر آتے ہیں۔ وہ بے جان کٹھ پتلی کی طرح نہیں ہیں۔ ہر کردار کی الگ شخصیت اور اہمیت۔ اس کے مرکزی کردار حسن اور دل ہیں لیکن قصے کو آگے بڑھانے میں سبھی کرداروں کا تعاون حاصل ہے۔ وجہی نے مرد اور عورتوں کے کرداروں کی الگ الگ صفات کو حقیقی انداز میں بیان کیا ہے۔ مردوں میں شجاعت اور بہادری دکھائی گئی ہے۔ عورتوں میں شرم و حیا اور نزاکت جیسی خوبیاں بتائی گئی ہیں۔ رقیب اور غیر کے کردار برائی کو ظاہر کرتے ہیں، انتہائی بدخصلت اور بدہیت ہیں۔ ''عجائب القصص'' میں چار مرکزی کرداروں کے گرد جن و پری کی شکل میں بے شمار کردار نظر آتے ہیں۔ ''باغ و بہار'' میں چاروں درویشوں اور آزاد بخت کے علاوہ خواجہ سگ پرست کا کردار ایک ناقابل فراموش کردار ہے۔ ''فسانہ عجائب'' کا مرکزی کردار جانِ عالم روایتی ہیرو کی مثال ہے۔ اس میں انسانی خوبیاں اور کمزوریاں سب نظر آتی ہیں۔ ملکہ مہر نگار کا کردار حسین و جمیل ہونے کے ساتھ متحرک، عقل مند اور موقع شناس بھی ہے۔ کرداروں کی بہتات داستانِ امیر حمزہ اور بوستان خیال میں ہے۔ یہ داستانیں سینکڑوں کرداروں پر مشتمل ہیں۔ موضوع اور کردار کے اعتبار سے بہت کم داستانیں مختلف ہوتی ہیں۔ عموماً سبھی داستانوں میں بزم رزم اور عشق موضوع ہوتا ہے، شہزادے، شہزادیاں، دیو، جن، پری وغیرہ کردار ہوتے ہیں۔

داستان کی دنیا عام دنیا سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں عجیب وغریب مخلوق نظر آتی ہے۔ یہاں دیو جن اور پریاں ہوتی ہیں۔ یہاں نجومی اور جادوگر جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ طلسمات کا جال بچھا ہوتا ہے۔ داستان کو دلکش بنانے اور اس میں حیرت انگیز فضا پیدا کرنے کے لئے مافوق الفطرت عناصر کو شامل کیا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر کی شمولیت ہی داستانوں کو دلکش بناتی ہے۔ عام زندگی کے واقعات کو سننے سے سامعین محظوظ نہیں ہوتے۔ وہ ناقابل یقین حادثات اور غیر فطری واقعات کی داستان گو سے توقع رکھتے ہیں۔ اجنبی مخلوق کے بارے میں بیان کر کے سامعین کا اشتیاق بڑھایا جاتا ہے۔ آج کے مقابلے میں پچھلی صدیوں کے لوگ نسبتاً زیادہ توہم پرست تھے۔ دیو، بھوت، پریت اور پریوں پر بہت کچھ یقین تھا اور اس یقین کی وجہ مذہبی اور معاشرتی اعتقادات تھے۔ ہر مذہب میں فوق الفطرت مخلوق کا تصور موجود ہے۔ اس لئے ہر ملک کے ابتدائی ادب میں فوق الفطرت عناصر ملتے ہیں۔

داستان ہمیشہ اس طرح شروع کی جاتی ہے کہ بہت پہلے کی بات ہے فلاں ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ زماں و مکاں کا فاصلہ پیدا کر کے داستان گو سامعین کا اشتیاق بڑھاتا

ہے۔ صدیوں پہلے کسی دوردیس میں، کہہ کر داستان گو کو بہت کچھ کہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ وہ ہر ناقابل یقین بات کو زماں ومکان کے فاصلے کی آڑ میں حقیقت کا روپ دے کر بیان کر سکتا ہے اور داد وتحسین پا سکتا ہے۔ داستان میں دوردراز ممالک کے نام لئے جاتے ہیں مثلاً ختن، چین، یمن، روم، دمشق، شام وغیرہ۔ یہ علاقے اس زمانے میں جب داستانیں لکھی جارہی تھیں، بہت دور سمجھے جاتے تھے اور اس عہد کے لوگ آج کی طرح دوسرے ملکوں کے حالات سے واقف نہیں تھے۔ اس لئے دوسرے ملک کی ہر بات ان کے لئے قابل یقین ہوتی تھی اور یہ بات داستان کے فن کی خوبیوں میں ہے کہ فرضی اور بے بنیاد قصہ بھی حقیقت کا لطف دے۔

''سب رس'' میں ایک شادی کا منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے ''بیاہ کا کاج 'مانڈے ڈیرے ٹھائیں ٹھار دے' گھر سنوارے' جاگا جاگا نقش نگارے' صدر بچھائے' پاچے رنبھا اُربسی میکا پاتراں آکر ناچے۔ ٹھاریں ٹھار آرائش کیے''۔

اسی طرح ''قصہ مہر افرز دلبر'' میں اس جشن کا بیان اس طرح ہے:

''سو کہیں ہر کنیاں ناچتیں کہیں رامجنیاں ناچتں ہیں۔ کہیں لولیاں، کہیں کنچنیاں، کہیں چولے والی ہیں، کہیں بھانڈ ہیں، کہیں بھگتے ہیں، کہیں نٹوے ہیں، کہیں ہیجڑے ہیں........کوئی ڈھولک بجاتی ہیں، کوئی دائرہ کوئی عود کوئی بربط اور طرح طرح کے باجے بجاویں ہیں۔''

بوستان خیال میں یہ عبارت دیکھ لیجئے:

''اور دامن کوہ میں ایک صحرائے پُر بہار اور جا بجا چشمہائے شریں جاری تھے، غرض کہ جس طرف نظر جاتی تھی بجز گلہائے رنگارنگ اور آب کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔''

اسی کتاب میں جلد 2 اور صفحہ 39 پر یہ عبارت درج ہے:

''گلہائے رنگارنگ بوقلموں کھلے ہوئے' حوض گلاب اور عرق کیوڑہ سے لبریز ہیں' ہزار ہا درخت کثرت بار اثمار سے مثل مردمان منکسر کے جھکے ہوئے ہیں' بلبلان خوش تقریر نغمہ سرائی کر رہے ہیں۔ غنچے شگفتہ ہو رہے ہیں نسیم عنبر شمیم چل رہی ہے۔ سرولب جو سبب تازگی اور خوشی کے اکڑ رہے ہیں، مرغان خوشنوا چہچہا رہے ہیں قمریوں کا شور ہے۔ طاؤس ہر جانب مانند معشوقان خرام ٹہل رہے ہیں، فوارے چھوٹ رہے ہیں۔''

غرض کہ مناظر کی تفصیلی پیش کش نہ صرف داستانوں کی فضا کو خوشگوار بناتی ہے بلکہ داستان کو طول دیتی ہے۔

دراصل داستانوں میں ایک سے ہی واقعات ہونے کے سبب اسے قدر دلچسپ اور پر اثر بنانا ضروری ہے کہ سامعین یا قارئین کی طبیعت تکرار کی وجہ سے مکدّر نہ ہو۔ ہر داستان گو کو زبان و بیان پر قدرت اور لفظوں کی نشست و برخاست کا سلیقہ آنا ضروری تھا۔ عموماً داستانوں میں دو اسلوب اختیار کیے گئے ہیں، ایک پر تکلف اور شکوہ انداز بیان اور دوسرا سلیس اور سادہ۔ اول الذکر کی مثال کے لئے ''نوطرز مرصع' اور ''فسانہ عجائب'' کو پیش کیا جا سکتا ہے اور دوسرے کے لئے ''قصہ مہر افروز و دلبر'' اور ''باغ بہار'' کو سامنے رکھ سکتے ہیں۔ کوئی بھی داستان عام طور پر اپنے موضوع کے اعتبار سے اہم نہیں ہوتی بلکہ اسے اہم بناتا ہے اس کا اسلوب، واقعات کی ترتیب اور جزئیات کا بیان۔ ''سب رس'' سے لے کر ''بوستان خیال'' تک سبھی داستانیں اپنے اسلوب کی وجہ سے علاحدہ شناخت رکھتی ہیں۔ ''سب رس'' کا زمانہ تصنیف اگر چہ اردو کا ابتدائی زمانہ ہے اور یہ فارسی کی کتاب کا چربہ ہے، اس کے باوجود فارسی الفاظ و تراکیب سے بوجھل نہیں ہے۔ جیسے ''نوطرز مرصع'' اور ''فسانۂ عجائب'' ہیں وجہی نے فارسی کو ہندوستانی زبان کا رنگ دے دیا ہے۔

General Secratory Tahreek Baqa-e-Urdu
C/o Irfan Arif
Cell: 09858225560, 09419627220

عظیم الشان فلم 'مغل اعظم'

ڈاکٹر کرشن بھاوک (پٹیالہ)

ہندوستان کی بے مثال سرزمین پر مغلوں نے ایک طویل دور تک حکومت کی تھی اور انہوں نے تہذیب وتمدن کے نقطۂ نظر سے ہمارے ملک پر ایک دیرپا و دوررس اثر چھوڑا ہے۔ ممبئی کی فلم نگری کی انڈسٹری میں فلم سازوں کے تئیں فلموں کے اسکرین پلے کے موضوع کے لیے سنہ 1931 تا 1966 تک کا دور خاص کر اپنی جانب راغب کرتا رہا ہے۔ فلم سازوں نے مغلیہ سلطنت کے متعدد عالیشان کرداروں میں بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، نور جہاں، جہاں آرا، ممتاز محل، انار کلی، شیر افگن، بہادر شاہ ظفر جیسے مشاہیر کرداروں اور انکی حیاتوں کے گونا گوں پہلوؤں کی نایاب تصویر کشی کی ہے۔ سنہ 2008 میں ایک بار پھر عوام نے فلم 'جودھا اکبر' کے توسط سے ایک پارینہ قصہ کی بازیافتگی کر کے اپنے ملک کے ماضی کے ایک مخصوص حصے کییاد کرنے کروانے کا شرف حاصل کیا تھا۔ ان فلموں نے بیشتر کامرانی ہی حاصل کی تھی۔

ایسی فلموں کی ایک طویل فہرست ہے، منجملہ ایک فلم 'پکار' اول تھی اور اسکے ہدایت کار نادرو برتر ایکٹر سہراب مودی تھے۔ یہ فلم اصل میں وہ سنگ میل تھا، جس نے مستقبل میں بننے اور از حد مقبول ہونے والی فلموں کے لیے بروقت صحیح رہنمائی کی تھی۔ اسی ضمن میں محترمہ وصیہ عرفانہ کا ایک قول اس فلم کے متعلق یہ ہے کہ 'پکار' فلم سہراب مودی کی کامیاب ترین تخلیق ہے۔.... مغلیہ سلطنت سے متعلق فلموں میں 'نور جہاں'، 'انار کلی'، 'جہاں آرا' اور 'تاج محل' خاص اہمیت اور مقبولیت کی حامل ہیں۔'' بہت سال قبل اپنے مطالعے سے خاکسار کو اس بات کی واقفیت ہوئی تھی کہ فلم 'پکار' سے ہی شاہی درباروں میں چوبدار کی زبانی یہ خطاب آئندہ فلموں میں مروجہ ہوا تھا۔ ''با ادب با ملاحظہ ہوشیار، ضلع الٰہی...'' وغیرہ۔ مندرجہ بالا فلموں میں لازوال و قابل رشک جو مقبولیت شہرۂ آفاق فلم 'مغل اعظم' کو ہی مل پائی تھی، وہ آج تک دیگر کسی بھی فلم کو نہیں ملی ہے۔ اسکے ہدایت کار کے. آصف کی شہرت اس فلم کے بعد ساتویں عرش پر پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ نور جہاں، انار کلی، جہاں آرا اور تاج محل کے ناموں سے ہی ایک سے زیادہ فلمیں بنائی گئی تھیں، تاہم سنہ 1960 میں فلم 'مغل اعظم' نے کامیابی کا ایک 'یسا ریکارڈ

بنایا، جسے آج تک کوئی بھی توڑ نہیں پایا ہے۔ اس نے فلم سازی کے میدان میں ایک ایسا پرچم لہرایا ہے، جسے تا حال کوئی بھی فلم ساز سرنگوں نہیں کر پایا ہے۔

اول الذکر محترمہ اپنے مضمون میں آگے یوں رقم طراز ہوتی ہیں:۔ ''آج بھی یہ فلم شائقین کی بھیڑ اکٹھا کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ فلم کی عالمی سطح پر ہندوستاں کو فلم 'مغل اعظم' کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ شہزادہ سلیم اور انارکلی کے عشق کی اس فانی، لیکن لاثانی داستاں نے محبت کرنے والوں کو ایک نیا فکر وفلسفہ عطا کیا ہے۔ محبت کسی بھی رنگ، نسل، سرحد، ملک اور زمان ومکان کی حدود وقیود سے ماورا ہے۔ محبت کی یہ باغیانہ لے زمان ومکاں سے پرے آفاقیت کا استعارہ بن گئی 'مغل اعظم' فلمی تاریخ مین ہر اعتبار سے ایک شاہکار فلم تسلیم کی گئی ہے۔ اس فلم کی شان وشوکت، منظر نامہ، مکالمہ نگاری، نغمے، موسیقی، رقص، صوتی تاثر ہر ایک اپنی مثال آپ ہے۔''

اس اقتباس سے ہی متذکرہ بالا بے مثال فلم کی اہمیت کا ز اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اردو زبان کا رول: فلموں میں اردو زبان کا ایک اہم رول ابتدا سے ہی رہتا آیا ہے۔ آج سے بہت سال قبل ایک قومی اہمیت کے فلمی اجلاس میں ایکٹر منوج کمار (جن کی فلموں میں انکا نام بیشتر بھارت ہی رہا ہے) نے اسٹیج پر صرف ایک منٹ کے لیے آکر مائک پر فقط یہ ایک فقرہ کہا اور نیچے اتر آئے تھے۔ ''آپ سب لوگ اردو زبان کی فقط باتیں ہی کرتے ہیں، جب کہ ہم فلم والے اصل میں اردو زبان کو جیتے ہیں۔'' اردو زبان کی اہمیت کی بابت ٹھیک اسی نوعیت کے جذبات ڈاکٹر امام اعظم نے بھی اپنی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ 'تمثیل نو' میں آج سے دو سال پہلے فلم 'مغل اعظم' کے ضمن میں یوں ظاہر کیے تھے۔ ''مکالمے کا ایک ایک لفظ اپنی معنویت اور تہداری میں بے مثال ہے۔ الفاظ کے دروبست سے جو فضا تیار ہوتی ہے، اس کی گھن گرج دور دور تک سنائی دیتی ہے۔ اس زوردار مکالمے کے خوبصورت الفاظ کا متبادل پیش کرنا کسی بھی دوسری زبان کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ ہے اردو اور یہ ہے اردو کا اٹوٹ رشتہ فلم انڈسٹری سے۔''

اسی طرح احمد جاوید نے بھی اپنے شاندار مقالے 'ہندوستانی سنیما کے ارتقا میں اردو کا کردار' میں کہا ہے کہ ''اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے بالی ووڈ کو اپنا کتنا خونِ جگر پلایا اور کس طرح فن کی بلندیوں سے ہمکنار کیا، اس کی طرف ایک مثال میں یہاں 'مغل اعظم' سے پیش کرنا چاہونگا۔ سید امتیاز علی تاج کے مشہور ڈرامہ 'انارکلی' سے لی گئی محبت کی ایک لازوال کہانی کو فلم کے قالب میں زندہ جاوید بنانے کے لیے کے۔ آصف، کمال امروہی، شکیل بدایونی، امان علی، وجاہت مرزا اور امان (پورا نام امان اللہ خاں) ہر کردار کے مکالمے اور مناظر الگ الگ لکھتے، پھر وہ کے۔ آصف کے

سامنے پیش کرتے۔ پھر ان میں سے انتخاب کیا جاتا کہ کس موقعہ کے لیے کیا رکھا جائے اور کیا چھوڑ دیا جائے۔ شکیل بدایونی نے ایک ایک گانے کو کئی کئی بار لکھا تھا۔ 'پیار کیا تو ڈرنا کیا' کو موسیقار نوشاد کی منظوری سے قبل سو بار سے زیادہ مرتبہ لکھا گیا۔ گویا ایک ایک منظر، ایک ایک مکالمہ اور ایک ایک لفظ کو ہیرے کی طرح تراشا اور موتیوں کی طرح جڑا گیا۔ یہ ہندوستانی سنیما میں خونِ جگر سے فن کی نمود کی وہ مثال ہے، جو آج تک اپنا خراج وصول کر رہی ہے۔"

اردو آجکل دنوں دن ترویج و ارتقا کے زینوں پر جس طرح سے چڑھتی چلی جا رہی ہے، اس میں مغل اعظم جیسی فلموں کے رول کو کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکے گا۔

عمدہ ترین مکالمہ نگاری: ڈاکٹر عالمگیر شبنم کے اس خیال سے ہم صد فی صد متفق ہو سکتے ہیں کہ "ڈائلاگ فلم کی جان ہے۔ کئی فلموں نے صرف ڈائلاگ کی وجہ سے مقبولیت حاصل کی۔ ان میں 'مغل اعظم' اور 'شعلے' شامل ہیں"۔ اسی مقالے 'ہندوستانی فلموں پر اردو کے احسانات' میں یہ فلم "مغل اعظم" کے ضمن میں ایک مکالمہ دیتی ہیں۔ فلم میں جب بادشاہ اکبر انارکلی سے یہ سوال کرتے ہیں کہ بذاتِ خود ایک کنیز ہوتے ہوئے بھی اسنے سلطنت کے ولی عہد شہزادہ سلیم (دلیپ کمار) سے محبت کرنے کی جرآت کیوں کی، تب انارکلی (مدھو بالا) کہتی ہے۔ "ظلِ الٰہی! میں دیکھنا چاہتی تھی، کہ افسانے کس طرح حقیقت میں بدلتے ہیں۔"

وصیہ عرفانہ کی اس رائے سے متفق ہی ہوا جا سکتا ہے کہ "اس فلم کے مکالمے بھی عوامی یاد داشت کا حصہ بنے رہے۔ وجاہت مرزا، کمال امروہی، امان اللہ خاں اور احسن رضوی نے اپنے مکالمے کے ذریعہ اس فلم کو مقبولیت کے بام عروج پر پہنچا دیا۔ 'مغل اعظم' کے مکالمے اردو کی تہ دار معنویت، اثر آفرینی اور سحر انگیزی کی بہترین مثالیں ہیں۔ شہنشاہ اکبر کی بلند آہنگی، شہزادہ سلیم کی رومانیت، انارکلی کی نزاکت، بہار کی ہوشربا فتنہ پردازیاں مکالموں کے توسط سے کمال خوبی کے ساتھ نمایاں ہوئی ہیں۔ اس کمال کے اظہار کے لیے اردو کے سوا کوئی دوسرا متبادل ممکن نہیں تھا۔"

جناب فیاض احمد وجیہہ نے اپنے مقالے 'ہندوستانی فلموں میں ادبی عناصر' کے آخر میں معاصر شاعر اور فلمی نغمہ نگار ندا فاضلی کے اس پر دلیل خیال کا صحیح حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ "فلم انڈسٹری میں نہ کتابی اردو چلتی ہے، نہ کتابی ہندی۔ فلموں نے عام آدمی کی زبان کو فروغ دیا ہے۔ یہ زبان امیر خسرو اور کبیر سے چلتی ہوئی آرزو کی سریلی بنسری سے ملتی ہوئی ابن انشا اور ناصر کاظمی تک آتی ہے۔ ان شعرا کے یہاں جو زبان ہے، وہی زبان فلموں کی زبان ہے۔"

احتشام الحق کے بھی ان خیالات سے "مغل اعظم" فلم کی عظمت اور شہرت کی ہی نشان دہی

ہوتی ہے۔ ''فلموں کی تاریخ میں کے۔ آصف نے بڑی اونچی جگہ پائی ہے۔ وہ بڑے ہی فیاض اور دلیر آدمی تھے۔ انہوں نے 'ہلچل' اور 'مغل اعظم' بنائی۔ اس وقت جب کہ پچیس تیس لاکھ میں ایک عمدہ فلم مکمل ہو جاتی تھی، مگر کے۔ انہوں (اس کی جگہ 'آصف' لفظ چاہیے) نے ایک کروڑ کی لاگت سے 'مغل اعظم' بنائی۔ اس فلم کا ہر کردار انگوٹھی میں نگینہ کی طرح فٹ تھا۔ مغل شہنشاہ اکبر کے رول میں پرتھوی راج کپور رعب و دبدبہ میں اصلی شہنشاہ معلوم پڑتے تھے۔ شہزادہ سلیم کے رول میں دلیپ کمار، انارکلی کی ('کے' لفظ چاہیے تھا) رول میں مدھو بالا اور مہارانی کے رول میں درگا کھوٹے، وزیر اعظم راجہ مان سنگھ کے رول میں مراد اور درجن سنگھ کے رول میں اجیت اور سنگ تراش کے رول میں کمار تھے۔ امتیاز علی تاج کے ڈرامہ پر مبنی اس فلم کی نوک و پلک کو سنوارنے کے لیے ادیبوں کی ایک ٹیم تھی، جن میں امان اللہ خاں، وجاہت مرزا، اختر الایمان، کمال امروہی اور احسن رضوی شامل تھے۔ جبکہ ان میں سے ہر ایک رایٹر اپنی فلم کی کامیابی کے لیے اکیلا ہی کافی تھا۔ ایک ہی سین کو ہر رایٹر اپنے اپنے ڈھنگ سے لکھتا اور جو سب سے اچھا اور مناسب ہوتا بہ اتفاقِ رائے اسے منتخب کر کے فلم میں شامل کیا جاتا۔ اس فلم کے سارے نغمے شکیل بدایونی نے لکھے تھے اور موسیقی نوشاد نے ترتیب دی تھی۔ اس میں شامل نعت شریف ''بے کس پہ رحم کیجیے سرکارِ مدینہ'' اور قوالی ''تیری محفل میں قسمت آزما کر ہم بھی دیکھیں گے''۔ اس کے علاوہ سارے نغمے فلم ریلیز ہونے سے قبل ہی مقبول ہو چکے تھے۔'' آگے لکھتے ہیں کہ ''اس فلم کی تکمیل میں کے. آصف نے سود خور فنانسر شاپور جی کے علاوہ (یہاں 'پاس' لفظ درکار تھا) اپنا مکان تک گروی رکھ دیا تھا۔ لیکن فلم کی کامیابی نے ان کے سارے قرضے چکا دیے تھے۔ اس کے مکالمے اپنی فارسی زدگی کے باوجود جس طرح مقبول ہوئے وہ اردو کی چاشنی (یہاں 'کی' اس ایک اور لفظ کا اضافہ ہونا چاہیے تھا) ہی کرامت تھا۔''

انسانیت پسندی کے جذبات: فلموں میں انسانیت اور رجعت پسندی کا مثبت جذبہ بارہا دہرایا جاتا رہا ہے اور اس ضمن میں فلم 'مغل اعظم' بھی کوئی استثنا نہیں ہے۔ سنہ 1939 میں بنی فلم 'پکار' میں بھی سنگرام سنگھ کا خوبصورت رول سہراب مودی نے نبھایا تھا۔ ایک ڈائلاگ سنئے۔ ''چھما، انن (ان' لفظ چاہیے تھا) داتا! لیکن عالم پناہ کی زندگی سے تمام رعایا کو زبردست واسطہ ہے، شہنشاہ اپنے لیے نہیں ہے، رعایا کے لیے ہے اور رعایا کو اپنے شہنشاہ کے کے لیے چلانے کا حق ہے۔'' اس فلم 'مغل اعظم' میں بھی کردار، خصوصاً سلیم اور انارکلی اپنے عشق پر بادشاہ سلامت کی منظوری کی شاہی مہر چسپاں کروانے کے لیے انسانیت اور عام عوام کی ہی نمائندگی کرتے ہیں۔

حقیقت اور فنی افسانوی عنصر کی دلآویز آمیزش کا جواز: فلموں کے ٹریجڈی کنگ مانے

جانے والے اور جذبات کی عکاسی میں بے مثال، نادرو برتر اداکار دلیپ کمار صاحب نے ایک انٹرویو میں ڈاکٹر امام اعظم سے کہا تھا کہ ”پہلے تو انسان، سچ پوچھیے، تو خود ہی کچھ ڈر جاتا ہے لوگوں کا خلوص دیکھ کر، شفقت دیکھ کر اتنا متاثر ہو جاتا ہے دل! اور تھوڑی consciousness guilt بھی اس میں آجاتی ہے۔ معلوم ہوتا یہ ہے دانستہ ہم نے ایک Plan بنا کے دھوکا دیا۔ حالاں کہ نہ تو لیلیٰ تھی، نہ مجنوں تھا، نہ کوئی جدائی کی بات تھی۔ نہ کوئی سلیم تھا، نہ انارکلی تھی۔ نہ کوئی شہنشاہ تھا، جو انکے بیچ حائل تھا، مگر لوگ جو تاثرات لے کر آتے ہیں، تو میں نے اکثر دیکھا ہے کہ وہ حقیقت بن کر انکے دل میں برسوں رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، جیسے ہم نے شاید فریب دیا سبھی کو۔ اور کچھ اسٹوڈنٹ تھے، ان سے میں مخاطب تھا۔“

اصل میں فلم 'مغل اعظم' میں اسی روایت کا اتباع کرتے ہوئے تقدیر، زمانہ، تہذیب، تاریخ۔ شہنشاہت وغیرہ پر سچے عشق کو ہی فوقیت دی گئی ہے۔ مثلاً اس فلم میں سلیم (دلیپ کمار) کا ہی کہنا تھا کہ ”تقدیریں بدل جاتی ہیں، زمانہ بدل جاتا ہے، ملکوں کی تاریخیں بدل جاتی ہیں، شہنشاہ بدل جاتے ہیں مگر محبت جس انسان کا دامن تھام لیتی ہے، وہ انسان نہیں بدلتا۔“ اس پر بادشاہ اکبر ڈرامائی انداز میں کہتے ہیں۔ ”مگر تجھے بدلنا ہوگا، سلیم! تجھے بدلنا ہوگا۔“

مغلیہ تاریخ اور دیگر تمام خاندانوں کی تاریخوں پر مبنی فلموں میں تخیل کی مدد سے بنائے گئے کرداروں کو تاریخیں بھی کسی دور میں زندہ جاوید ہونے کی قطعی تائید نہیں کرتی ہیں اور کر بھی نہیں سکتی ہیں، مثلاً وہ اکبر اور سلیم کو چھوڑ کر انارکلی، شرارتی طبیعت کی انارکلی کی ہمجولی شوخ طبیعت نازنین بہار وغیرہ کرداروں کے حقیقی ہونے کا ٹھیک اسی طرح سے کوئی بھی جواز پیش نہیں کرتی ہیں، جس طرح سے ہندو مایتھولوجی میں کرشن کی محبوبہ رادھا کی ہستی کے حقیقی ہونے کی کوئی بھی مستند دلیل آج تک پیش نہیں کی جاسکی ہے اور اسی بموجب اسکے کردار کو مشکوک ہی ٹھہرایا جاتا رہا ہے۔

آج بھی نقادروایت اور دورِ حاضر میں مروجہ نئی سائنٹفک آؤٹ لک 'ان دونوں کے معرض میں باہم ہمیشہ ایک ٹکراؤ کی حالت میں پس و پیش سے گزرتے دیکھے جاسکتے ہیں، اِس ضمن میں کسی پاکستانی شاعر کا سوہنی اور مہی وال کے عشق کے روایتی قصے اور انکے ساتھ ہونے والے المیہ کی بابت یہ ایک شعر پارینہ ذہنیت کی نمائندگی کرنے والا ہے۔

”کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی / مضبوط کشتیوں کو کنارا نہیں ملا۔“

تخیل کی بنیاد پر مروجہ عوامی قصے پر مبنی اس شعر کے جواب میں ہی شاید زبیر رضوی نے یہ شعر کہا ہوگا۔

''یہ اس کے پیار کی باتیں فقط قصے پرانے ہیں،ورنہ کچے گھڑے پر کون دریا پار کرتا ہے۔''
سائنس کے اس دور میں رہنے والے ہم باشندے بلا شرط دوسرے نمبر کے عقیدے یا مسلک کی ہی جانبداری و تائید کرنا مناسب سمجھیں گے۔ٹریجڈی کنگ دلیپ کمار (اصلی نام یوسف خان) صاحب کو خدشہ اسی وجہ سے رہا ہوگا۔انہوں نے اپنے اول الذکر انٹرویو میں ایک مثال دیتے ہوئے یہ کہا بھی تھا۔''پچھلے سال؛ تو یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے۔میں نے Guilt Complex کا اعتراف کیا تھا۔وائس چانسلر نے کہا تھا کہ یہ فریب ہے،تو اسے رہنے دیجیے۔یہ فریب ہی اچھا لگتا ہے۔آپ زیادہ چھلکے مت اتاریئے،کہ اسکے پیچھے ایک کہانی تھی اور اس کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں تھی۔جو تھا،ٹھیک ویسے ہی ہے اور ویسے ہی یہ دنیا بھی،یہ کائنات بھی،تو اوپر والے کا بنایا ہوا ایک کھیل ہے۔یہ بھی ایک فریب ہے،یہ بھی ایک تماشا ہے۔ہم بھی وہ بازیگر ہیں،جو تماشہ کرتے ہیں۔اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے اتنا نوازا۔لوگوں کے دلوں میں شفقت بھر دی،جس کے ساتھ ایک عجز اور انکساری بھی دی۔''

یہاں جناب دلیپ کمار صاحب نے گویا کوزے میں سمندر بھرنے کے مصداق اپنے خیالات کا چیدہ چیدہ خوبصورت الفاظ میں اظہار کر کے اپنے محبوب پرستاروں اور نقاد وغیرہ کی بھی ایک ذہین مفکر کی مانند رہنمائی کرنے کی کامیاب سعی کی ہے،جو کہ قابل ستائش ہی ٹھہرتی ہے۔

کے.آصف اور اکبر بادشاہ کی بلند ترین کردار نگاری: فلم 'مغل اعظم' کے تمام نغمات مشہور نغمہ نگار شکیل بدایونی نے قلم بند کئے تھے۔لہٰذا انکا مقبول و معروف ہونا تو لازم ہی تھا۔پروفیسر سید منظر امام نے کہا ہے کہ اس کے پروڈیوسر اسٹرلنگ الوسٹمنٹ کارپوریشن تھی۔

ڈاکٹر امام اعظم نے اپنی ترتیب و تدوین شدہ کتاب کے 'ابتدائیہ' میں صاف الفاظ میں یہ فرمایا ہے کہ ''کے.آصف 'مغل اعظم' بنانے کے سلسلہ میں جب آخری مرحلہ پر پہنچے،تو ذاتی طور پر اس کشمکش سے گزرنے لگے،کہ مغل اعظم اور بادشاہ کو ویلین کی حیثیت سے پیش کرنا انہیں پسند نہیں آیا اور کچھ دنوں تک فلم کی شوٹنگ روک دی گئی اور بڑی کدوکاوش کے بعد آپسی مشورہ سے یہ طے پایا کہ اس کا انٹی کلائمکس اکبر اعظم کی فراخ دلی اور عدل کی مثال بن جائے،اس لیے آخری حصہ کی کہانی کا اضافہ کیا گیا۔''

فلم میں ہدایت کار کے.آصف کے ساتھ موسیقار نوشاد تھے اور نمایاں کردار نبھانے والے تھے دلیپ کمار،مدھوبالا،پرتھوی راج کپور اور درگا کھوٹے۔

اسی طرح فلم کے نغمات وغیرہ کے بارے میں متعدد مضامین تا حال تخلیق کیے جا چکے

ہیں۔رشید انجم نے بتایا ہے کہ ''فلم 'پھول' (1945) (یہاں 'تھی' لفظ جوڑنا چاہئے تھا)، جس میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلم ڈاکٹر کو عین نکاح کے موقعہ پر شادی سے انکار کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا، جو تحریک خلافت میں شامل ہو کر وطن پرست نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔''

جیسے پوت کے پاؤں پالنے (گہوارے) میں ہی نظر آجانے کا ضرب المثل مروجہ ہے، اسی کے مصداق کے. آصف صاحب کی قابلیت تو اُسی فلم سے نشان زد ہونے لگی تھی، صرف اس کے لیے شدنی (destiny) ہی کوئی گل کھلانے کے لیے معقول اور واجب وقت کا گویا پندرہ سالوں سے ہی انتظار کر رہی تھی۔ آخر 'تھا جسکا انتظار وہ شاہکار آگیا' مثل کے مطابق بعدازاں 1960 میں بنی فلم 'مغل اعظم' نے کامیابی کے پچھلے تمام ریکارڈ ہی توڑ ڈالے تھے۔ یہ ایک شہرۂ آفاق اور یادگار فلم تھی، جو مستقبل میں نہ جانے کتنی صدیوں تک لوگوں کو اپنا گرویدہ بناتی رہے گی اور اپنی حقیقت و تخیل آمیختہ داستان، فن و تخلیقیت سے معمور زبردست مکالموں کی ادائیگی، امیجری سے لدی پھدی منظر نگاری، مصنوعی ہونے کے باوجود حقیقی سے بھی کہیں زیادہ حقیقی صرف محسوس ہونے والے والہانہ بلند بالا کرداروں وغیرہ کے موجب دنیا بھر کے لوگوں کے دل و ذہن پر نہ جانے کب تک یہ فلم اپنا قبضہ جمائے رہے گی، یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ ایسی فلم اور کے. آصف جیسا دیدہ ور فلم ساز ہزاروں سال بعد ہی پیدا ہوا کرتا ہے اور فلم سازی کی نرگس نہ جانے کب تک اپنی دائمی بے نوری پر زار زار روتی رہے گی؟ ہماری دلی خواہش اور خدا سے دعا بھی ہے کہ جلدی ہی کے. آصف جیسا کوئی اور دیدہ ور پیدا کرے تاکہ ہمیں فلم 'مغل اعظم' کی مانند اور بھی تاریخی فلمیں دیکھنی نصیب ہو سکیں۔ آمین!!

201-A, Gurunanak Nagar, Gali 18-K, Patiala-147003 (Punjab)

Cell: 09815165210 e-mail: kbshabad201@gmail.com

پروفیسر ابوالکلام قاسمیؔ کا تنقیدی شعور

(’مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت‘ کے حوالے سے)

محمد مکمل حسین (رانچی)

اردو تنقید کے آغاز وارتقاء پر اگر ایک نگاہ ڈالی جائے تو اس نکتے کا انکشاف ہوتا ہے کہ دیگر اصناف سخن مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی کی طرح اردو تنقید کے بھی ابتدائی نقوش کے ڈانڈے ہماری مشرقی روایات سے ہی ملتے ہیں گر چہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو تنقید اپنے ابتدائی دور سے ہی مغربی افکار سے مسلسل استفادہ کرتی رہی ہے۔ مولانا حالی جن کی حیثیت اردو تنقید نگاری میں بابائے آدم کی ہے ان کے یہاں بھی مغربی تنقید کے حوالے جا بجا ملتے ہیں۔ بعد کے آنے والوں میں نقادوں کی جو فہرست بنتی ہے وہ بہت ہی طویل ہے جس کا سلسلہ ترقی پسند تحریک تک پہنچتا ہے۔ اس تحریک نے اردو تنقید کو ایک نئی جہت بخشی لیکن یہ بھی ایک تاریخی صداقت ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اپنے مخصوص نظریات کی تبلیغ واشاعت کو جس جارحانہ انداز میں پیش کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نظریات سے دور ہوتی چلی گی اور ادب وصحافت میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ پھر یہ کہ اپنے نظریات سے دور ہونے اور کچھ اندورنی تضادات کا شکار ہونے کی وجہ سے ترقی پسند تحریک بے اثر ہو گئی۔ جدید تنقید کا حال بھی زیادہ اچھا نہیں۔ جدیدیت جو اصلاً باغیانہ رویے کی دین تھی، سارا زور ترقی پسندی کے رد میں صرف کر کے زندگی اور ثقافت کی تحریک سے بڑی حد تک کٹ چکی ہے۔ جہاں تک مابعد جدید تنقید یا ساختیاتی تنقید کا معاملہ ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے توسط سے نئی بصیرتیں سامنے آئی ہیں۔ یہ تنقید روایتی تنقید کے معاملے میں نئے علوم انسانیہ اور نئ فکر سے گہرے طور پر جڑی ہوئی ہے۔ یہ تنقید وفورِ تخلیقیت اور تکثیر معنی کا نظریاتی جواز فراہم کر کے متن کی طرفوں کو کھول دیتی ہے۔ چونکہ یہ قرآت کے عمل اور قاری کے تفاعل پر زور دیتی ہے لہٰذا اس سے قاری پر مرتب ہونے والا اثر بھی در آتا ہے اور اس مبحث سے ادب میں سیاسی سماجی معنویت کی راہ بھی کھل جاتی ہے۔ آج مابعد جدید نقادوں میں گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی، شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی کے تنقیدی رویوں نے ایک فکری سفر شروع کیا ہے جس کا ثمرہ ہے کہ مابعد جدیدیت کی فکر اور خیالات کو اردو تنقید میں استحکام نصیب ہوا ہے۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کا شمار عہد حاضر کے ان نقادوں میں ہوتا ہے جن کی تنقیدی بصیرت اور ناقدانہ شعور وآگہی نے اردو تنقید نگاری کو وقار عطا کیا ہے۔ مابعد جدیدیت کے رجحان کے علمبرداروں میں ایک اہم نام پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کا ہے۔لہٰذا انہوں نے مابعد جدید شعریات کے اطلاقی پہلو، اس کی جہات، معنویت، امکانات، مقامی، تہذیبی اور ثقافتی قدروں کی بازیافت، نوآبادیاتی رویے سے انحراف وغیرہ جیسے موضوع پر کھل کر بحث کی ہے اور اپنے نظریات کو سمجھنے اور سمجھانے میں تنقیدی بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اب تک موصوف کی ایک درجن سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں جن میں ''مشرقی شعریات''، ''شاعری کی تنقید''، ''معاصر تنقیدی رویے''، ''تخلیقی تجربہ''، ''مشرق کی بازیافت'' کافی مقبول ہوئیں۔ان نگارشات کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کا تنقیدی وژن کافی اعلیٰ وارفع ہے۔ان کا تنقیدی طریقۂ کار کافی منضبط، متوازن اور معروضی ہے، ان کی تحریر میں استدلال کی جو پائیداری ہے ،مطالعے میں جو وسعت ہے، فن پارے کی پرکھ کا جو شعور ہے اور اسلوب میں جو عالمانہ وقار ہے، وہ مصنف کے تبحر علمی کا پتہ دیتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کی تنقیدی نگارشات کے توسط سے ہم ان کے تنقیدی تصورات کا تجزیہ کریں۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب کی تنقیدی کاوشوں کے مطالعے سے اس کا انکشاف ہوتا ہے کہ موصوف اردو تنقید کو معیار اور جہت عطا کرنے میں اپنی سعی مسلسل اور تنقیدی بصیرت کا ثبوت فراہم کررہے ہیں۔ نیز اردو تنقید کی تاریخ وروایت میں مشرقی شعریات کے عمل دخل سے انکار نہیں کیا جاسکتا بالخصوص عربی وفارسی شعریات اردو تنقید کی اساس ہیں اگرچہ بعد میں مغرب کے زیر اثر اردو میں تنقید کے اصولوں کو اپنایا جانے لگا لیکن پھر بھی مشرقی معیار نقد کے اثرات اب بھی سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ ایسے اردو تنقید کی تاریخ وروایت کو سمجھنے کے لئے مشرقی شعریات سے جانکاری رکھنا ازحد ضروری ہے۔ نیز مشرقی شعریات کی روایت کا احیاء کے بغیر ہم اپنے ادبی ذخیر کی نہ تو قدر وقیمت کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں اور نہ ایسے پورے طور سے سمجھ سکتے ہیں۔

لہٰذا مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت اسی یقین کا ایک عملی ثبوت ہے۔ اور اس کو بات کو موصوف کی ایک کتاب ''مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت'' سے اظہر من الشمس ہوتی ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں عربی وفارسی شعریات کی روایت کے ذیل میں نہ صرف یہ کہ عربی وفارسی شعریات کی پوری روایت کو بنیادی حوالوں کی مدد سے متعین کیا ہے بلکہ ان دونوں زبانوں پر مبنی مشرقی شعریات کے اثرات کی نشاندہی اردو تنقیدی روایت میں بھی کرکے دکھائی ہے۔

''مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت'' یہ کتاب مصنف کا تحقیقی مقالہ ہے جو تقریباً ساڑھے سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس میں پانچ ابواب ہے۔ پہلا باب میں ''عربی شعریات کی روایت'' کے موضوع پر بحث کی گئی ہے اور اس کے ماتحت آمد اسلام کے بعد کی ادبی تنقید، عہد اموی اور عہد عباسی کی ادبی تنقید جیسے ان موضوعات پر تفصیلات اور دلائل و براہان سے بحث کی گئی ہے۔ نیز ابن قتیبہ، قدامہ بن جعفر اور ابن رشیق القیر وانی کے تنقیدی نظریات کو پیش کرنے کے بعد عربی تنقید کے اہم مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ:

> ''عربی کی تنقیدی روایت میں حسن الفاظ، حسن معانی، الفاظ و معانی کے مابین ترجیح صنائع و بدائع، مبالغہ، شاعری اور دروغ گوئی، سرقہ شعری اور اخلاق معائب شعر، حسن تالیف اور شعراء کے درمیان موازنے کے مسائل بہت اہمیت کے حامل رہے ہیں۔''

(مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، صفحہ ۹۱، ۹۲،/ بحوالہ اردو دنیا، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

دوسرا باب میں فارسی شعریات کی روایت کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں فارسی شاعروں کے تنقیدی شعور کو ان کے اشعار کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اس میں قابوس نامہ، کے مصنف امیر کیکاؤس چہار مقام کے مصنف ابوالحسن احمد السمر قندی، حدائق السحر فی دقائق الجم فی معابیر اشعار العجم کے مصنف شمس الدین محمد قیس رازی، معیار الاشعار کے مصنف خواجہ نصیر الدین طوسیؒ، کے علاوہ شرف الدین محمد تبریزی، شمس الدین فخری اصفہانی اور جامی وغیرہ کے تنقیدی نظریات سے بحث کی گئی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے:۔

> ''عربی ہی کے طرح فارسی کی قدیم تنقید بھی معانی بیان اور بدائع کے اگرد گھومتی ہے۔''

(صفحہ ۱۳۸، بحوالہ اردو دنیا، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

غرض ابتدائی دونوں باب میں عربی و فارسی کے تنقیدی روایت کا تعین کیا گیا ہے اور مشرقی تنقید کی روایت کی بکھری ہوئی کڑیوں کو ملا کر بنیادی مباحث اور بنیادی نوعیت کے انتقادی عناصر کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اردو شعراء کے تذکروں میں مشرقی شعریات کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔

بعد کے تین ابواب میں اردو شعراء کے تصور شعر اور تذکروں کے تنقیدی حوالوں اور بیسویں صدی کی ابتدائی اردو تنقید میں مشرقی شعریات کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس میں ان نقادوں کے یہاں عربی و فارسی کی تنقیدی روایت کا تسلسل تلاش و جستجو کیا گیا ہے جن کے تنقیدی شعور و آگہی کی

تربیت واستحکام میں مشرقی روایت کا نمایاں عمل دخل رہا ہے۔ چنانچہ محمد عوفی کے لباب الالباب سے کر محمد حسین آزاد کی کتاب آب حیات تک کے تقریباً تمام تذکروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں عربی وفارسی نقد شعر کے اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم مقصد شعراء کے کلام کا انتخاب تھا۔ تذکروں کے بارے میں مختصر ترین کوئی رائے اگر ہوسکتی ہے تو وہ رائے قاسمی صاحب کے مندرجہ ذیل پراگراف کی طرح ہوگی:۔

"یہ بات ہر ذی ہوش تسلیم کریگا کہ تذکرے دراصل کتب نقد نہیں ہیں۔ اس لئے ان سے تنقیدی شعور اور آج کی ترقی یافتہ ادبی نقد کے مباحث کی امید نہ رکھنی چاہئے؟ یہ حقیقت بھی ناقابل تردیدی ہے کہ تذکرہ نویسیوں نے شاعری کے اسالیب اور خوبیوں یا خامیوں کی پرکھ کے لئے مبہم اور غیر واضح الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تذکروں میں تنقیدی لب ولہجہ موضوعی ہے یا دوسرے لفظوں میں اسے جانب دارانہ رائے زنی کا نام دیا جاسکتا ہے مگر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ قدیم مشرقی تنقید کا مزاج یہی ہے اور تذکرہ نویس صرف قدیم مشرقی تنقید کے مزاج داں اور مزاج شناس ہیں۔"

(مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، صفحہ ۱۴۸)

چوتھا باب میں مشرقی شعریات اور اردو شعراء کا تنقیدی شعور پر بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں کلاسیکی شعراء سے لے کر دور جدید تک کے شعراء مثلاً فائز دہلوی، میر تقی میر، آبرو، حاتم، سودا، باقر آگاہ، انشاء، غالب، حالی، اقبال اور حسرت وغیرہ کے تحریر کردہ دیباچے، مقدمے اور دیگر نثری وشعری تحریروں میں موجود شاعری کے حسن وقبح اور دوسرے فنی تقاضوں پر جس انداز میں گفتگو کی ہے اور اردو انگریزی کے شعراء کے حوالے سے شعری متون میں شاعروں کے ذریعے پیش کئے گئے۔ فن شعراء سے متعلق تصورات کو یکجا کیا ہے اور ان کے تنقیدی تصورات کو خصوصیت کے ساتھ بحث موضوع بنایا ہے۔

کتاب کا پانچواں اور آخری باب میں "مشرقی شعریات اور روایتی اردو تنقید" میں الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، امداد امام اثر، مولوی عبدالرحمٰن، وحیدالدین، مولوی عبدالحق، عبدالسلام ندوی، نیاز فتح پوری، عبدالماجد، مسعود حسن کے ساتھ ساتھ محمد حسین آزاد کے تنقیدی نظریات سے بحث کی گئی ہے۔

بحث کی ابتداء ہی میں محمد حسین آزاد کے ایک محقق ڈاکٹر اسلم فرخی کے حوالے سے بات صاف کردی ہے کہ حالی پر آزاد کا گہرا اثر ہے۔ نیز اس باب میں یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ حالی پر عربی شعریات اور شبلی فارسی شعریات کا اثر زیادہ ہے اور عربی وفارسی شعریات کے تتبع کے باوجود اردو تنقید میں بہت سی ایسی خصوصیات بھی اس عہد میں پیدا ہوگئیں تھیں۔ جو عربی وفارسی شعریات میں موجود نہیں تھیں لیکن مغرب کے سحر میں آنے کے بعد اردو تنقید اتنی رہی سہی انفرادیت بھی کھو بیٹھی۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ''حالی کے اس محاکے سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ان کے تنقیدی خیالات کی اساس یا تو عربی وفارسی کے نظریات شعر سے استوار ہوتی ہے پھر اگر وہ اپنے کسی خیال کی بنیاد پر مغرب سے مستعالئے ہوئے کسی تنقیدی خیال پر رکھتے ہیں تو چار و ناچار اس کی تان ہمیشہ کسی مشرقی تصور شعر پر لا کر توڑتے ہیں۔''

(مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، ۲۰۸)

غرض پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب نے اردو تنقید کی روایت میں مشرقی شعریات بالخصوص عربی وفارسی نقد شعراء کے اثرات کی بے حد مفصل ودلائل وضاحت سے پیش کی ہے جس سے نہ صرف یہ کہ اردو تنقید کی روایت میں مشرقی شعریات کی اہمیت بلکہ نقد شعر کے مختلف کلاسیکی اصولوں اور رویوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

آصف رضا

جنم کا رشتہ

(اپنے بڑے بھائی رضی مجتبیٰ کے نام)

وہ وقت جب مردہ ستارے کو جنم
دیتی تھی شب اور شاخ بن کر پھوٹتا گمبھیر غم
تھا اک شجر کا راز کہ جس کے امیں
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اندوہ گیں
تو اور میں اک دوسرے پر منکشف
دو بے جلا اور سرنگوں موتی.....صدف!

آ سر اٹھا کر مسکرائیں، جھاڑ کے پلکوں کی دھول
ہم سوکھتی اک شاخ کے دو زرد پھول!

افتادگی

چھو لیا تھا ایک دن میں نے بھی چڑھ کر آسماں
وہ سعادت کا سنہرا سا تواں!
آہ لیکن... کس قدر کمزور تھیں وہ سیڑھیاں!
میں گرا.....گرتا گیا... گرتا گیا....

ہو چلے اس حادثے کو....سال....؟ شاید اک صدی!
رک نہیں پایا ہوں....گرتا جا رہا ہوں آج بھی!

شکاری

وہ اپنا سینہ کھولتا ہے
اس میں گڑیا کا برادہ ہے بھرا

یہ وہی انسان ہے
یک درہ جس کے مکاں میں
چار برقی قمقموں کی روشنی
نوچتی تھی رات کا بالوں بھرا سینہ سیہ

بھاپ ہے پانی کے چشمے سے بلند
آسماں کو دھند کا مینار چھاتا ہے
چلے کو اپنے کان تک وہ کھینچ کے لاتا ہے
میدان میں ہے اس کی آنکھوں کے کھڑا
کالی پہاڑی کا ہرن....
اس کا ہواؤں میں بکھرتا ہے بدن!

3519, Colgate Ave, Tyler TX-75701
(U.S.A.) Cell: 001-903-534-1092

انیس انصاری

بارشوں کا نیا موسم

زمین خشک پر بارش کی بوندیں پھر برستی ہیں
ہوا پر نرم بادل ننھے بچوں کی طرح کھیلوں میں الجھے ہیں
کسی نے ریڑھ کی ہڈی پہ جیسے برف کی سِلی بہادی ہے
بدن کے روئیں تازہ دھوپ کی مانند لہرائے
سبھی کچھ دفعتاً نظروں سے اور کانوں سے اوجھل ہو گیا لیکن
سنائی اور دکھائی دے رہا ہے جو وہ سب سے اچھا لگتا ہے
سبھی کچھ نرم، بھیگی بوند میں ڈوبا سا لگتا ہے
حرارت جسم کی آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے
نکلتے سورجوں سی، جاگتی سی یہ بڑی آنکھیں
ابھرتے پیڑ کی آدھی کھلی، ادھ کچی امیاں، سانولی رنگت
مرے تشنہ بدن میں قطرہ قطرہ جذب ہوتی ہیں
ٹپکتی جا رہی ہیں میری مٹی میں ہری بوندیں
مجھے لگتا ہے میری مٹیوں میں کوئی انکر پھوٹنے کو ہے
کوئی ننھی سی کونپل
سرخ یونیفارم میں اسکول جانے کے لیے مشتاق بیٹھی ہے

نازک رشتہ

اس نے مجھے دیکھا تو پلٹ کر نہیں دیکھا
میں نے اسے دیکھا تو نظر اس پہ جمی ہے
وہ ایسا غنی ہے کہ ضرورت نہیں میری
میں بھی نہیں محتاج مگر اس کی کمی ہے

بابو کے نام

بظاہر کھو گئے ہو تم
تو اکثر یاد آتے ہو
مجھے بہتر بنانے کے لیے
جیسی ریاضت اور مشقت تم نے کی
گر میں نے کی ہوتی
تو میں کچھ اور بہتر ہو گیا ہوتا
تمہاری جان سوزی میری ساری خوبیوں اور نیکیوں میں
اب بھی روشن ہے
میں اپنی خامیوں سے اب بھی ڈرتا ہوں
شرارت کے ہر اک لمحے میں یہ احساس رہتا ہے
کہ تم چپکے سے آجاؤ گے
میرے کان کھینچو گے
مجھے ڈانٹو گے اور غصہ میں بولو گے
کہ ''تم دنیا میں کچھ بھی کر نہ پاؤ گے''

بظاہر کھو گئے ہو تم
مگر احساس رہتا ہے
تمہارا نور سایہ بن کے میرے پاس رہتا ہے
''تمہیں کہتا ہے مردہ کون، تم زندوں کے زندہ ہو
تمہاری خوبیاں زندہ، تمہاری نیکیاں باقی''

2/257, Vikas Khand 2, Behind Mayo
Hospital, Gandhi Nagar, Lucknow-226010
Cell: 09839010735

ثروت زہرا

یک بہ یک

یک بہ یک ٹوٹ گئے
آنکھ سے سارے چہرے
یک بہ یک چھوٹ گئے
ہاتھ سے کاسے میرے
یک بہ یک پھیل گیا
خوف کا نمکین مزا
یک بہ یک پھانک گیا
کسی آہٹ کی ادا
یک بہ یک روک لیا میں نے کسی نوحے کو
اور پھر سونپ دیا دل کو!
اسی رستے کو

بے رنگ پروں کی تتلی

یہ جھاڑن کی جھڑ جھڑ میں
میں جھڑ رہی ہوں
یہ پنکھے کی گھوں گھوں میں
میں گھومتی ہوں
یہ بیلن سے چکلے پہ
میں بل رہی ہوں
توے پر پڑی جو
ابھی جل رہی ہوں
یہ کوکر کی سیٹی میں
میں چیختی ہوں
پڑی دیگچی میں کہیں گل رہی ہوں
مگر جی رہی ہوں
مسلسل، مسلسل.......

ہر ایک عورت کی کہانی

زمیں سے مٹی اٹھا کے لائی
بدن کی بھٹی میں دل جلایا
صحیفہ تھا مپھر آسماں کو بلی چڑھایا
نظر ہواؤں کے نام کر کے
اڑی پھری تھی
لگا تھا مجھ کو تو ایک پل کو
سفر کو ہمراہ لے چلی تھی
مگر ہواؤں کا کیا بھروسہ
نہ آسماں نہ کہیں زمیں ہے
صحیفے لفظوں سے ڈر رہے ہیں
یہ پھول پوجا کے مر رہے ہیں
ہمارے ہمراہ لامکانی
ہر ایک عورت کی ایک کہانی

جبر کے نام

گولیاں، وردیاں، سیٹیاں لاٹھیاں
جبر کے شہر میں تشنگی الاماں
ہونٹ پر سوکھتی خوف کی پپڑیاں
آنکھ میں کچھ لرزتی سی خاموشیاں
خارداری نظر میں گھرے آسماں
ہوک میں دفن ہیں زندگی کے نشاں
خون نمکین سے بھیگتی یہ زبان
شہر بارود میں، منجمد بالیاں
خالی تنہا منڈیروں پہ بندوقیں ہیں
اسلحے سے بھرے سارے صندوق ہیں
بکتروں میں بندھی اپنی تقدیر ہے
کیا یہ دھرتی کسی اک کی جاگیر ہے؟

Dubai (U.A.E.)
Cell: 00971-50-8256132

سجاد حسین

سوچ کا زھر

کبھی سوچتا ہوں
'ستاروں سے آگے
کہا ہے کسی نے' جہاں اور بھی ہیں
ہنستے جھپٹتے، لڑتے، لپٹتے
وہاں لوگ ہوں گے، یہی لوگ ہوں گے،
کبھی دھوپ ہوگی
کبھی چھاؤں ہوگی
بدلتے مناظر شب و روز ہوں گے
کبھی سوچتا ہوں
'میں کیوں سوچتا ہوں
زمیں، چاند، سورج، سیارے، ستارے
فقط قمقمے کیا فریب نظر ہیں!
خموشی کا عالم ہے کچھ بھی نہیں ہے
میں خود بھی نہیں ہوں، خدا بھی نہیں ہے
کبھی سوچتا ہے
'میں کیا سوچتا ہوں!'

لو کے تلے

چہل پہل قہقہوں کی محفل
قمقموں سے بجی اک عمارت
رنگدار در و دیوار پہ رنگیں تصاویر
فرش پہ چار سو ریشم و کم خواب
چمکتی روشنی میں بشاش چہرے
دلفریب ساز پہ مدھم مضراب
سماں میں گم سم نیم عریاں شباب
اچانک اک ہوا کے جھونکے سے
بجھ گئی تھرتھراتی لو دئے کی
چراغ بجھتے ہی زرد چہرے کا
اک مہیب و مدھم سائے کے ہمراہ
مٹ گیا یہ رنگیں تصور بھی

Hussain Lane, Chhanpura, Srinagar-190015
Cell: 09419093465

دور حاضر

مناظر ہیں ہر سمت کرب و بلا کے
عبث ہے جہاں میں تلاش محبت
جلوسوں، گھروں، مسجدوں میں دھماکے
زمانے میں برپا ہے ہر سو قیامت
کہاں جا کے ڈھونڈے کوئی علم و حکمت
کہ اب ہے سبھی کا چلن خود نمائی
سبھی کو ہے اک دوسرے سے عداوت
کہیں کم نگاہی، کہیں کج ادائی
جہاں میں کسی کو ملی ہے اسیری
کوئی بے نوا ہے کوئی بے سہارا
کوئی اقتصادی مسائل کا زخمی
کوئی ہے شقاوت کے زخموں کا مارا
نگاہوں پہ بوجھل نظارے ہوئے ہیں
سبھی عہد حاضر کے مارے ہوئے ہیں

حسد کی آگ

کیسی کیسی الجھنیں ہیں دہر میں
کیسے کیسے دشمن جاں روگ ہیں
کیسے کیسے کم نظر ہیں شہر میں
کیسے کیسے کینہ پرور لوگ ہیں
حد نہیں کوئی بھی ان کے بیر کی
دشمنی میں ہیں یہ خود اپنی مثال
کیا کرے کوئی توقع خیر کی
پھینکتے ہیں دم بہ دم نفرت کے جال
گالیاں دیتے ہیں فن کے نام پر
بدزبانی ہے چلن، صبح و مساء
دیکھتے ہیں جب کسی کو بام پر
جل کے ہو جاتے ہیں گویا کوئلہ
ہے یہی تعذیر ان کے بھاگ میں
جلتے جائیں یہ حسد کی آگ میں

کربلا کے بے تیغ سپاہی
حضرت علی اصغر کی نذر

چشم اصغر سے چھلکتا ہے یہ کیسا پانی
رہ گیا سینۂ دریا میں ابلتا پانی
کس کے دیدار کو بے تاب ہیں امواج فرات
کس کے لب چھونے کو اب تک ہے مچلتا پانی
ہائے کیا پایس فروزاں تھی سر کرب و بلا
جس کو آنکھوں میں بسائے ہے چمکتا پانی
تر بہ تر خون میں حلقوم کرشمہ دیکھو
میرے کربل پہ ابھی تک ہے برستا پانی

ایک نظم

ہمارے سروں پر پگھلنے والی
برف جیسی سفید دھوپ
ہم سے عمر رفتہ کے
ہر سیہ پل کا حساب مانگتی ہے
جن پلوں سے ہمارا سامنا
خیالوں کی ہری گھاس پر
بیٹھ کر ہوا تھا

تم قتل کرو ہو....

اس کی باتوں کے ترکش میں
زہر میں بجھے ہوئے
لفظوں کے تیر تھے
جن سے میرا لہجہ
لہولہان ہو گیا
لیکن ساتھ ہی اس نے
اپنی شگفتہ آنکھوں کی
مہکتی مسکراہٹ سے
میرے لہجے پر
خاموشی کا مرہم رکھ دیا

نئی انجیل

اور اب جب کہ
ہم میں سے ہر ایک حواری
اپنے اپنے عیسیٰ کو صلیب پہ ٹنگا دیکھ کر
مطمئن گھر لوٹا ہے
وقت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم
اپنے اپنے عیسیٰ کی تصویریں
اپنے اپنے کلیسا میں آویزاں کر کے
اپنے لیے
زندگی کی دعا مانگیں

شارق عدیل

ایٹہ

صفائی کرمچاری

گٹر کی گندگی کو صاف کر کے
.....جب بھی میں باہر نکلتا ہوں
تو یہ احساس میرے ذہن میں
.....کروٹ بدلتا ہے
خدا کو مجھ سے دنیا میں
اگر یہ کام لینا تھا
تو انسانی دماغوں کی
غلاظت صاف کرنے کی
مرے ہاتھوں کو طاقت کیوں نہیں بخشی؟

کوڑا اٹھاتا ہوں

میں پڑھ لکھ کر
بہت ہی معتبر عہدے پہ فائز ہوں
مرے ماتحتوں میں اعلیٰ اور کمتر ذات کے
......سب لوگ ہیں جن میں
کبھی بھی ذات کو لے کر
کسی تکرار کی نوبت نہیں آئی
مگر پھر بھی
مجھے اکثر یہ کیوں محسوس ہوتا ہے
میں ایسا باعث صد فخر انساں ہوں
جواب تک ذات کا کوڑا اٹھاتا ہے

P.O. Marahra, Distt. Etah-207401 (U.P.)

سجاد پونچھی
جموں

انقلاب کی آہٹ

ہیں ان کی زندگی میں تلخیاں زمانے کی
خوشی کی لذتوں کا دور تک بھی نام نہیں
مہیب رات کا سایہ ہے ان کی قسمت پر
نہیں ہے کوئی دن ایسا جو مثل شام نہیں
عجب گھٹن ہے، نحوست ہے، مفلسی ہے مگر
حسین چاند بھی ان جھونپڑوں میں پلتے ہیں
ایسا لگتا ہے کہ پھر انقلاب آئے گا
دکھائی دیتے ہیں جو امن کے چراغ کہیں
ہر ایک شخص کی اکھڑی ہے مگر سانس یہاں
ہے ان کے لب پہ فقط انقلاب زندہ باد
عوام جھکتی نہیں اپنا سر کٹاتی ہے
یہ صبر و شکر کے بندے نہیں ہے ان کا جواب
ہیں دل شکستہ مگر خوش ہیں فاقہ مستی میں
ہے ان کے حوصلوں میں پربتوں کا عزم جواں
زبان چپ ہے حرارت ہے ان کی معنی خیز
اٹھے گی اور بھی آواز حق غریبوں کی
ہزار زلزلے باقی ہیں بحر و بر کے لیے
ابھی ان آنکھوں سے شعلوں کی بارشیں ہوں گی
وہ پھیر دیں گے پھر اپنے رخ پریشاں کو
جنہوں نے چین و سکون چھین لیا ہے ان کا
ابھی کچھ اور بھی ہونا ہے دیکھتے جاؤ
یہ انقلاب کی ابھری ہوئی سی آہٹ ہے
کہ جس سے کر دی ہیں نیندیں حرام باطل کی
کہ اب اسیری کا کرب و بلا نہیں ہوگا
ابھی تو روٹی بھی پانی کے ساتھ باقی ہے
جسے کہ چھین ہی لیں گے یزید سے بڑھ کر
ادائے حق ہمارے کربلا کا تب ہوگا
شعور و آگہی پہ اختیار جب ہوگا

338, Near Sheikh Amin Kothi, Jolaha ka
Mohalla, Jammu (J&K)

مظفر ایرج
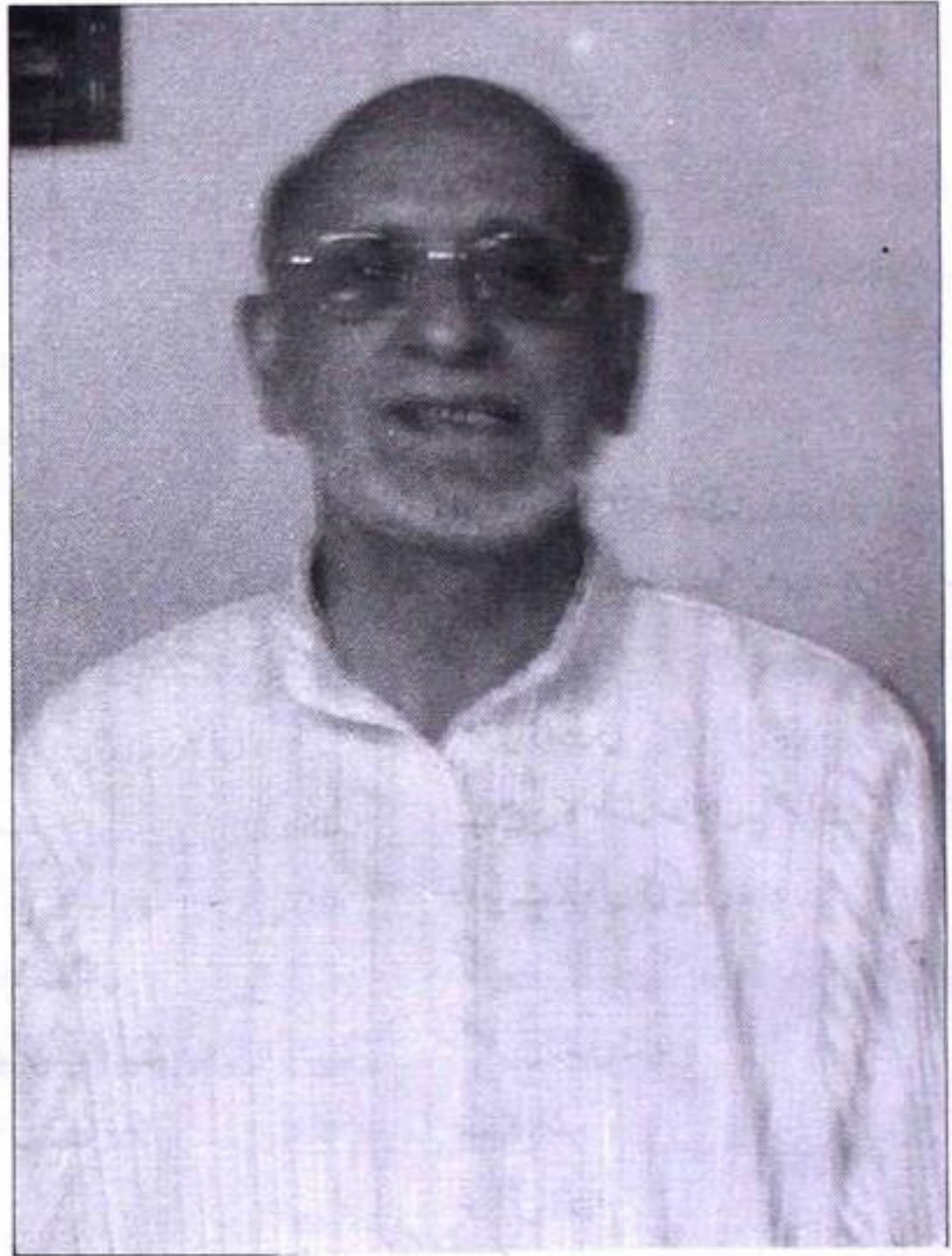
Kahkashan, Naugam Bypass, Srinagar-190015 (J&K)
Cell: 09596255405

مظفر ایرج

کرب

شہر کے
آئینہ گر
آئینہ سازی ترک کر کے
اب
(خدا ہی جانتا ہے)
کاروبارِ سنگ میں سود و زیاں
کیوں
ڈھونڈتے پھرتے ہیں
شیشے کے مکانوں کی
چمکتی گھومتی دہلیز کے سائے میں
بے چہرہ ستونوں سے کمر ٹیکے ہوئے
آواز کی بے سمت لہروں سے الجھ کر
سینکڑوں
بے جوڑ ٹکڑوں میں بٹی
صورت کو ہی پہچاننے کی سعی میں سرگرداں
کروڑوں سال سے ادراک کے اس المیے پر
دل
کہ ہے ماتم کناں بھی
کانچ کی پتلی نوکیلی کرچیاں نظروں میں چبھتی ہیں
سدا
احساس کے بے آنچ، بے تن آبلے
تیرہ نگاہی کے
ہرے ناسور
تپتے گھاؤ
مہکے زخم سب
شام و سحر
تیزاب سے دھوڑالتے ہیں
کچھ گناہوں کے سڑے پھوڑوں سے بہتی پیپ رک
جائے
سکڑتی ذات کی
بے چہرگی کا سلسلہ صدیوں پہ بکھرا ہے
وہ چاہے جزو کل ہی کیوں نہ ہو
لیکن
ٹھٹھرتی زندگی میں
ضبط کا پابند
خواہش کا غلام
ان کہے الفاظ کا محتاج
بے گھر
بے مکاں
کیوں نہ ہم بھی
بے ضرر
کچھوؤں ہی کی تقلید میں
اس بار
اپنے خول کے اندر ہی چھپ جائیں

میں

خلاء
کی بے جاں دبیز چادر بدن پہ اوڑھے
میں
خودنگر، خودنما، خودآرا
(وجود کی الٹی سیدھی بندش سے ماورا سا)
یقیں کی سرحد پہ
(اہتمام خمیر وخوں سے)
گماں کے پیکر تراشنے کا ہی منتظر تھا
کسے خبر تھی
یہ زرد مٹی بھی
اپنی سوندھی کنواری خوشبو کا مہکا آنچل جلا چکی ہے
یہ کیا خبر تھی
سمندروں کا سراب پانی بھی
بھاپ بن کر
جھلستے سورج کو
ڈھک رہا ہے
زمانہ پہلو بدل رہا ہے
سلگتے لمحوں میں ڈھل رہا ہے
کسے خبر تھی صداؤں کے
نقش اولیں بھی
زمیں کے سینے پہ بوجھ بن کر
اتر رہے ہیں

قدم
زماں ومکاں کی منزل سے
رفتہ رفتہ گذر رہے ہیں
کہ نقش ثانی ابھر رہے ہیں
کسے خبر تھی
خلاؤں میں ان گنت اندھیرے
سما چکے ہیں
میں اپنے قدموں کے نقش سارے
سمیٹتا ہوں
نشانِ ماضی
ایک ایک شے سے مٹا رہا ہوں
کہ
کوئی بھٹکا ہوا مسافر
مری طرح
(اتفاق ہی سے)
جھلستے لمحوں میں
زندگی کے
مہیب غاروں میں گر نہ جائے

سرگوشیاں

شام کی
سمٹی ہوئی دھنلاہٹوں سے
صبح کے
پھیلے دھندلکوں تک
خدا جانے
میں کتنے بے گنہ لمحے
فلک سے تاز میں بکھرے ہوئے
مریخ سے آئے ہوئے
عفریت کے منہ میں
بصد عجز و ادب
انڈیل دیتا ہوں
بجز ادراک
نوک تیغ پر چلتے ہوئے
سورج کو
اپنے ہاتھ میں
لے کر بجھاتا ہوں
کہیں
میری ہتھیلی کی لکیروں میں
یہ
یخ بستہ، کہر آلود
دھندلاتی، سکڑتی دھوپ
اگ آئے
کہ
پیپل کی گھنیری چھاؤں میں
گیلی سلگتی لکڑیوں کی سیج پر
یرقاں زدہ لاغر بدن
تاریکیوں کا سخت چھدرایا کفن
اوڑھے ہوئے
لمحوں میں
ڈھلتی رات کے سائے میں جلتا ہے
افق کے
تیرہ دامن میں
ابھرتے، چیختے، چنگھاڑتے
سورج نے
رنگ و نور کی
قوس قزح بھر دی
شعاعوں کی تپش سے
میری آنکھیں کھل گئی ہیں
مجھے لگتا ہے
اب
مجھ کو بھی سونا نہیں ہے

اکائی اور....

سبک خرام ساعتیں
سکون بے ثبات
تو
ثبات بے اساس
اور سکوت بے صدا
کہ
آسماں ٹپک رہا ہے
کوہ دشت..... بے اماں
طلسم دامن ہوا..... تمام تر
شکست صوت میں اداس
مضمحل
نہ اعتبار
کچھ یقین و اعتماد بھی نہیں
پھر اختیار کس کا
کیسا احتساب
اتنا بے جہت نہ بھاگتا
تو کیسے
بیکراں خلاؤں میں
پناہ گاہ ڈھونڈتا
سفید قرمزی بدن کی اوٹ سے
ٹپکتی
نیلی پیلی چاندنی کا قافلہ
شگاف در شگاف ایک فاصلہ
لڑھکتے پتھروں کا ایک سلسلہ
غبار، کہر، نیم جاں دھواں دھواں
نظر، سراب، آگہی
ابلتے پانیوں کا عکس
خوف و اضطراب و انتشار
ضبط خودکشی
پگھلتے خواب
روشنی میں ڈھل گئے
نظر سے خالی آنکھ تھی
فلک بہت قریب تھا
بریدہ جسم
شق ہوا
شکستہ ہاتھ
کٹ گئے
ریشہ ریشہ
میری ساری انگلیاں
فگار تھیں
میں
کیسے جلتی ریت پر حصار ذات کھینچتا

کھوج

سفر کی ابتدا میں تازہ دم نہ تھا
سفر کے اختتام پر مسافتوں کے بوجھ نے تھکا دیا
وہ
آخری مقام سے گذر گیا
تو مجھ کو یوں لگا کہ میرے سامنے افق کی کوکھ سے کوئی
مقام بے مقام
پھیلتی چمکتی سرخیاں ادھیڑ کر سرک گیا
وہ زینہ زینہ روشنی کے جسم سے اتر کے
میری آنکھ میں سمٹ گیا
فصیل آسماں کو اپنے سر پہ رکھ لیا
مجھے لگا کہ اس نے میرے جسم پر یہ لکھ دیا
کہ میں طلسم ذات کا، ادھوری کائنات کا
ابھرتے حادثات کا، غلط تصورات کا
اسیر ہوں
ازل سے پائمال ہوں
تو
میرے قد کی پستیوں پہ ہاتھ رکھ
مرے وجود کی بلندیوں سے ہو کے سربلندیوں کو چھو کے
دیکھ لے
ہر اک مقام
ہر نئے مقام کی تلاش میں سراب کا شکار ہے
سفر
پڑاؤ
رہگذر
ہزیمتیں
صعوبتیں
تضاد
زندگی کا رنگ روپ ہے
نکھار ہے، سنگھار ہے
یہ زندگی بجائے خود تضاد ہے۔ فساد ہے، عناد ہے
کہ
جس کی نعمتوں سے بڑھ کے زحمتوں کا بوجھ
اپنی پیٹھ پر لیے
میں خاک کی فصیل میں
زمیں سے آسماں تک
خلاء کی رفعتوں کو اپنی انگلیوں سے چھو چکا
مسافتوں کا زہر میں نے پی لیا
مرے قریب و دور
فاصلوں کے سارے سلسلے فنا ہوئے
مقام بے مقام
منزلوں کی ہر فصیل مٹ گئی
سفر کی انتہا کا انتظار اب نہیں
کہ
زندگی کی سب اکائیوں کے وہم پر
یقیں کی مہر ثبت ہے.....!

ابتداء انتہا

اتھاہ
بیکراں
بے پناہ وسعتوں کا
جگر چاک کرتا
ہرا، زرد، کالا، سمندر
بیاباں کا آنچل سمیٹے شکن در شکن آبدیدہ
ابھرتے ہوئے
نیلے طوفان کی آہٹ سے فق
منتظر کیوں ہے؟
پانی، ہوا، خاک
سورج کی رگ رگ میں رقصاں
مری سوچ کا گہرا نیلا اجل آسماں
ہر منقش در و بام پر
سرسراتی ہوئی آہٹوں کی
سم آلود پرچھائیاں
شب کے سینے پہ بکھری ہوئی
ظلمتوں کے گل سخت کی پتیاں
مردہ اصنام
آتش کدوں کے جواں جسم بے حس
دہکتے شراروں کی شدت
سلگتی ہوئی کروٹوں کی حرارت

نم آلود برتن میں مدفون
طوفان یک رنگ و بے رنگ و رنگیں
سم آلود
معبد کی کھڑکی کا پردہ
ہرا
لال
پیلا
چمکتا ہوا
سن رسیدہ، خمیدہ بدن
سنسناتی ہوئی
خون میں تیرتی بجلیوں کی لہر سی
ابلتی ہوئی
ہڈیوں میں اتر جانے والی
پراسرار دھندلاہٹیں
دھیمی دھیمی
خنک رنگ سانسوں کا سرگم
ہرا ناگ
پھنکارتا، لہریں مارتا
گھاس کی چھت پہ
چنگاریوں سے ہے
مہتاب روشن....!

سائے اور رقص

سوچ
مثبت نہ منفی
زنگ آلود ماحول کی آہٹیں
نیم عریاں
مگر
نیم جاں
خون آلود
کٹھ پتلیاں
ڈور
لمحوں کی کھینچی ہوئی
لمس کے ہاتھ
بے جوڑ
سانسوں کی
سرگوشیوں تک
شکستہ
درو بال
دیوار، کھڑکی
سفیدی کا
اجلا کفن
سالہا سال سے
اپنے

تن پر لپیٹے ہوئے
وقت کی
رنگ آمیزیاں
میز
کرسی
چٹائی
قلم
انگلیاں
ایش ٹرے
جسم کی
گہری کھائی سے اٹھتی ہوئی
آڑی
ترچھی
دھوئیں کی لکیروں کے
اس پار
جب دیکھتا ہوں
مرے
ذہن میں
سینکڑوں
الجھی پرچھائیاں
ناچتی ہیں

دعا

دفعتاً
میں نہیں جانتا کیا ہوا
میں نے
اپنے خدا سے سر دار مانگی دعا
اے خدا
مالک بحر و بر، لم یزل
میرے مرتے ہی
مجھ کو کسی روپ میں
(چاہے وہ روپ کتنا ہی کمتر ہو کمزور ہو)
اپنی دنیا میں پھر بھیجنا
میں تو یہ بھی نہیں جانتا کیا ہوا
اور مری چیخ ٹھٹھرے خلاؤں کا دل چیرتی
کالے غاروں میں گم ہو گئی
اور اچانک
مری روح نے
جو مرے جسم کے سینکڑوں میل گہری گپھاؤں میں
صدیوں سے مدفون تھی
سوئے افلاک
پرواز کرتے ہوئے
اپنے رب سے یہ کی التجا
اے خدا
تو مجھے اپنی دنیا میں
ہرگز
کسی روپ میں بھی نہیں بھیجنا
(چاہے وہ روپ برتر بھی افضل بھی ہو)
مجھ کو
تیری نیابت نہیں چاہیے
مجھ کو
پیغمبری کی تمنا نہیں
کیونکہ میں
تیری تخلیق کا المیہ
دیکھ سکتا نہیں
اور پھر
میں
تو یہ بھی نہیں جانتا کیا ہوا
میں نے دیکھا
مری روح
پھر میرے پیکر کی
تاریکیوں میں اترتی چلی جا رہی ہے

تحریک ادب میں اشتہار کے لیے نرخ

صفحہ	سفید/سیاہ	رنگین
ٹائیٹل کور بیک		15000/=
ٹائیٹل دوسرا		10000/=
ٹائیٹل تیسرا		10000/=
پوراصفحہ اندر	2000/=	
دوتہائی صفحہ اندر	1000/=	
آدھاصفحہ اندر	500/=	
ایک تہائی صفحہ اندر	250/=	

قاہرہ میں جمیل منظر افروایشین راشٹر یونین میں ہندوستانی مندوبین کے ساتھ

Jameel Manzar
'Navras' 14B, Royd Street, Kolkata-700016
Cell: 09836210151, 09330020207 Phone: 033-22178936

جناب جمیل منظر سے ایک گفتگو

مکالمہ نگار: **جاوید انور**

(جناب جمیل منظر کولکاتا کی باوقار سماجی، ملی، تھذیبی اور ادبی شخصیت ھیں۔ وہ نھایت ھی نفیس اور مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل ھیں۔ ان کا خانوادہ علمی و ادبی اعتبار سے بے حد معروف ھے۔ جناب جمیل منظر کے یھاں مشاھیر ادبا و شعرا و صحافی کے اعزاز میں گاھے گاھے پھلے "نورس" اور اب "چھایا گھیرا" میں ادبی نشستیں ھوا کرتی ھیں اور تمام مدعوئین لذت کام و دھن سے لطف اندوز بھی ھوتے ھیں۔ ترقی پسند ادب کا ترجمان ادبی ماھنامہ "سھیل" گیا (اجراء ۱۹۳۹ء) کی اشاعت ثانی ۲۰۱۲ء سے موصوف نے کولکاتا سے کی ھے جو ھر ماہ پابندی سے شائع ھو رھا ھے۔ جمیل منظر صاحب محمڈن اسپورٹنگ کلب کے اعزازی جنرل سکریٹری کے علاوہ آل انڈیا قومی ایکتا منچ، مغربی بنگال کے صدر، ماھنامہ "سھیل" کولکاتا کے مدیر، ادبی جریدہ "تمثیل نو" دربھنگہ کے نگراں، ادبی جریدہ "نیا سفر" کے سرپرست، نیو وژن اسکول، گیا کے ڈائرکٹر، ملی الامین کالج کے صدر، اسلامیہ اسپتال کے نائب صدر، اسلامک ڈیولپمنٹ بینک، جدہ کے مرکزی پینل کے رکن اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایگزیکٹیو ممبر ھیں۔ ان کی مرتبہ کتاب محمڈن اسپورٹنگ کلب ۲۰۱۰ء میں شائع ھوئی ھے جو اسپورٹس لٹریچر میں ایک بے بھا اضافہ ھے۔ جناب جمیل منظر موضع سنسھاری (نوادہ) کے علمی و ادبی گھرانے کے چشم و چراغ ھیں۔ موصوف حافظ محمد عبدالرحمن بسمل سنسھاری کے نبیرہ اور جناب ادریس سنسھاری کے نورچشم ھیں۔ حالیہ دنوں میں انھوں نے ایک انجمن "بزمِ یارانِ ادب" بھی قائم کی ھے جس کے زیر اھتمام ادبی نشستیں ھوتی ھیں)...... جاوید انور

جاوید انور: جمیل منظر صاحب! آپ صوبۂ بنگال اور قرب و جوار میں خدمت خلق میں لگے رہتے ہیں تو یہ جذبہ آپ کو وراثت میں ملا ہے یا آپ کے مخصوص ذہن کی اختراع ہے؟

جمیل منظر: بھائی! میری تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہے جس میں خدمت خلق شامل ہے۔ یہ جذبہ

وراثت کا ہی ایک حصہ ہے۔ میرے گھر کا ماحول ادبی و مذہبی تھا جس کے زیر سایہ میری تربیت ہوئی۔ گیا (بہار) سے لے کر مغربی بنگال کولکاتا تک میری خدمات ہیں۔ اگر ہر انسان میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو لوگوں کو بے حد فائدہ پہنچے گا۔

جاوید انور: آپ محمڈن اسپورٹنگ کلب سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جمیل منظر: جناب کلیم الدین شمس مرحوم (سابق ڈپٹی اسپیکر اور وزیر) جو ہمارے کرم فرما تھے، ان کی تحریک پر محمڈن اسپورٹنگ کلب سے وابستہ ہوا۔ وہ اس کے صدر تھے اور میں نائب صدر بنایا گیا۔ بعد میں سلطان احمد صاحب (سابق وزیر مملکت) اس کے صدر ہوئے اور میں جنرل سکریٹری۔ تقریباً ۱۲۔۱۳ برسوں سے میں اس سے وابستہ ہوں۔

جاوید انور: ادب سے آپ کی وابستگی کس طرح ہوئی؟

جمیل منظر: میرے دادا حافظ عبدالرحمٰن سنہماری تاریخ گو اور شاعر تھے۔ چچا جناب شمس العارفین عارف اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان ہجرت کر چکے تھے۔ میرے بڑے چچا جناب زین العابدین گیا میں تاج پریس قائم کیے ہوئے تھے جو بہار کا مشہور پریس تھا۔ اس پریس میں بھی ماہانہ نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ اس سے گھر کا ماحول ادبی تھا۔ ان حضرات کی سرپرستی میں میری پرورش و پرداخت ہوئی۔

جاوید انور: گیا میں جو ادبی فضا تھی اور آج ہے، اس کے تناظر میں آپ بنگال اور بالخصوص کولکاتا کی ادبی فضا کو کہاں دیکھتے ہیں؟

جمیل منظر: ہمیں تو ایسا لگنے لگا ہے کہ ادبی فضا آلودہ ہو چکی ہے۔ سارے ملک کی ادبی فضا بشمول مغربی بنگال ایک ہی طرح کی ہے۔ ۱۵۔۲۰ برسوں میں یہ روبہ انحطاط ہوئی ہے۔ حکومت کروڑوں روپے اردو کے نام پر دیتی ہے لیکن اس سے اردو ادب کے مافیا لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ آپ یقین جانیں، اردو اگر بچی ہوئی ہے تو صرف مدرسوں سے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ لوگ اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم اردو میں بھی دلوائیں۔ انگریزی اسکول میں بھیجنے کی ذہنیت سے بچے اردو سے نابلد رہ جاتے ہیں۔ ان کا تلفظ بھی بگڑ جاتا ہے۔ شعری اور ادبی نشستوں سے بھی میں نے استفادہ کیا ہے۔

جاوید انور: آزادی کے بعد سے اب تک تقریباً پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت دلت طبقے سے بھی بدتر ہے۔ اس کے اسباب آپ کی نظر میں کیا ہیں؟

جمیل منظر: آزادی کے بعد سے اب تک مسلمانوں کی حالت واقعی دلتوں سے بدتر ہے۔ اس کی وجہ ناخواندگی بھی ہے اور دوسرے یہ بھی کہ مسلمانوں کی فلاح اور ان کے فائدے کے لیے جو کچھ کیا گیا ہے، وہ زیادہ تر فائلوں میں بند رہتا ہے۔ ۸۰ فیصد آبادی گاؤں میں رہتی ہے۔ ٹیلی ویژن آج بھی

گاؤں میں کم ہے۔ ریڈیو آج بھی گاؤں میں مقبول ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی فلاح و بہبود یا ان کے فائدے کے لیے جو اسکیمیں تیار کی جاتی ہیں ان کی تشہیر ریڈیو کے ذریعہ بڑے پیمانے پر ہونی چاہیے۔ سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں تو کہا ہی ہے کہ مسلمانوں کی حالت دلت سے بھی بدتر ہے۔ اس کی تشہیر حاطر خواہ نہیں ہو رہی ہے۔

جاوید انور: اپنی اس حالت کے لیے آپ مسلم قوم کو کس حد تک ذمہ دار مانتے ہیں؟

جمیل منظر: مسلمانوں کی زبوں حالی کے ذمہ دار وہ خود ہیں کہ تعلیم کی طرف سے ان کی بے توجہی ہے۔ اگر مسلمان تعلیم پر پوری توجہ دیں تو ان کی حالت میں سدھار ہوگا اور انہیں تمام مراعات حاصل ہوں گے۔ لیکن مسلمان خواب پر زیادہ اور کام پر کم توجہ دیتے ہیں۔ میری سوچ یہ ہے کہ۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

جاوید انور: ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی حالت سدھارنے کے لیے عالمی سطح پر جو کام ہو رہے ہیں، آپ کے نزدیک وہ کہاں تک سودمند ہیں؟

جمیل منظر: ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی حالت کے سدھار کے سلسلے میں عالمی سطح پر جو کام ہو رہے ہیں، اس پر ہماری قوم کو پوری نظر رکھنی چاہیے۔ ہر جگہ سیاست ہو جاتی ہے۔ کچھ چیزیں سیاست سے الگ ہیں۔ عالمی سطح پر جو کام کیے جا رہے ہیں اس سے کہیں کہیں فائدے تو نظر آتے ہیں، لیکن اسباب وعلل پر توجہ نہیں کے برابر ہے۔ کسی کا شعر ہے:

پیغام ان کو عشق کا ملتا بھی تو کیسے بھلا جذبات کا یہ فیصلہ بھی نام پر چھوڑا گیا

ہم جذباتیت سے سوچتے ہیں اور مسلمان ہونے کا غن ہم میں ہے۔ سچر کمیٹی نے مسلمانوں کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ صد فیصد درست ہے اور یو پی اے اول نے فاطمی کمیٹی بنائی جس نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پانچ کیمپس کی سفارش کی۔ یو پی اے دوم نے یہ کام شروع کیا لیکن تین جگہ کیمپس بنائے گئے اور اس پر کتنی سیاست ہوئی اور ہو رہی ہے، یہ ہم سب دیکھ رہے ہیں۔ آزادی سے لے کر اب تک مسلمانوں کو کھلونے دے کر بہلانے کا کام کیا جا رہا ہے۔

جاوید انور: عالمی اور حکومتی سطح پر مفلس طبقوں کو بالخصوص مسلمانوں کو جو براہ راست فائدہ نہیں مل پا رہا ہے، اس کے اسباب آپ کی نظر میں کیا ہیں؟

جمیل منظر: جاوید صاحب! آپ کے سوال کا جواب میں پچھلے جواب میں دے چکا ہوں۔ مسلمانوں کو براہ راست فائدہ نہیں پہنچنے کی اصل وجہ ان کی ناخواندگی ہے۔ وہ تعلیم حاصل کریں اور اپنا حق جمہوری طریقے سے حاصل کرنے کی سعی میں لگے رہیں۔ اگر خواندہ رہیں گے تو تمام مراعات کا انہیں علم ہوگا

اور وہ اپنے مراعات لے کر رہیں گے۔ آج اقلیتی ادارے میڈیکل، انجینئرنگ کالج جن کے نیٹ ورک ساؤتھ میں زیادہ پھیلے ہوئے ہیں، آرٹیکل ۲۹۔۳۰ کی بنیاد پر انہیں الحاق مل جاتا ہے لیکن وہاں غریب طلبا و طالبات نہیں پڑھ پاتے۔ غریب مسلمان اپنے بچوں کو ان میں تعلیم دلانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہمارے جو رہنما ہیں انہیں بھی اپنی قوم کی فکر ہونی چاہیے تا کہ ہماری قوم مکمل خواندہ ہو سکے اور اقلیتی اداروں میں زیادہ سے زیادہ ان کی جگہیں محفوظ ہوں۔

جاوید انور: آپ کے نزدیک ایسے کیا اقدام کیے جائیں کہ مسلم مظلوموں کے ساتھ ان کے حقوق کے سلسلے میں اب زیادتی نہ ہو؟

جمیل منظر: جاوید انور صاحب! مسلمانوں کو جذباتی بیان سے پرہیز کرنا چاہیے اور صرف حکومت کے سہارے ہی نہیں رہنا چاہیے بلکہ محنت اور جدوجہد سے یہ ثابت کریں کہ ہم اپنے حقوق جمہوری طریقے سے حاصل کریں اور اپنی فکر مثبت رکھیں۔ بہت سی مراعات جو ہمیں ملتی ہیں، ان کو نافذ کرانے میں پیش پیش رہیں۔ علامہ اقبال کے لفظوں میں۔

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی ‌‌ ‌ ‌ عمل سے غافل ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

جاوید انور: آپ قوم کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں قوم کے بچے، مرد، بزرگوں و خواتین کو کیا مشورے دینا چاہیں گے؟

جمیل منظر: قوم کی فلاح بہبود کے لیے ہمیں جی جان سے محنت کرنی ہوگی۔ اپنی بچیوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا ہوگا۔ جب بچیاں تعلیم سے آراستہ ہوں گی تو ہمارا پورا سماج تعلیم یافتہ ہوگا۔ تعلیم نسواں پر پوری توجہ ہونی چاہیے۔ جاوید صاحب! ہمیں متحد رہنا چاہیے اور خانوں میں تقسیم ہو کر نہیں رہنا چاہیے ورنہ بہت برا ہوگا۔ کہیں نہ کہیں ہم میں کمیاں ہیں۔ انہیں دور کرنے کی سعی بلیغ کرنی چاہیے۔ اسی میں ہماری فلاح و بہبود مضمر ہے۔ میر کے لفظوں میں:

بارے دنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو ‌ ‌ ‌ ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

جاوید انور: بہت بہت شکریہ، آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔

Jameel Manzar
(Hony. General Secretary, Mohammadan Sporting Club)
"Chhaya Ghera" 3/2-A, Orient Row, Kolkata-17
Cell: 9836210151, 9903642664

ڈاکٹر فریاد آزر
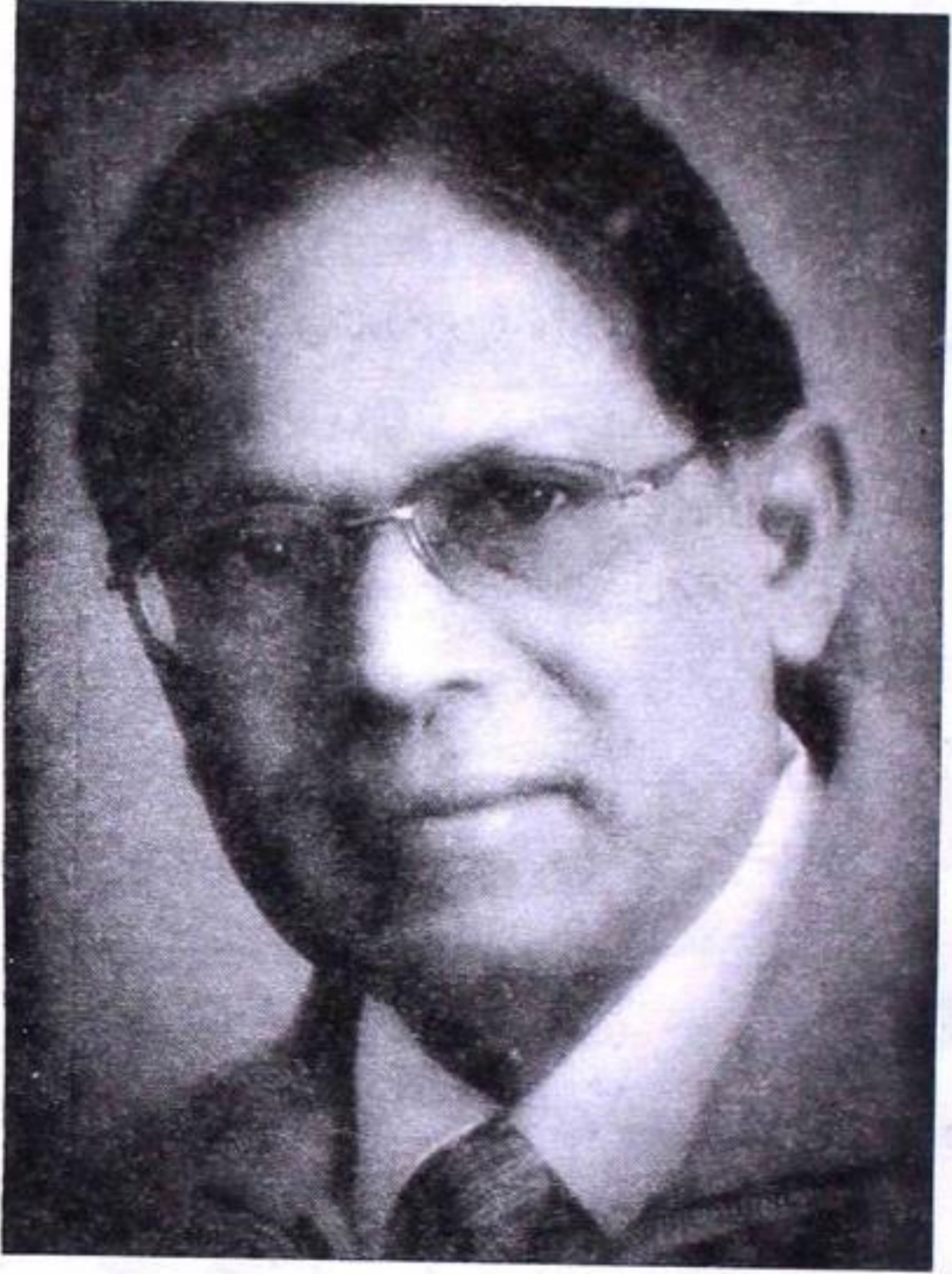
E-12/60-A, Hauz Rani, Malviya Nagar, New Delhi-110017
Cell: 09971910361

فریاد آزر ایک نظر میں

نام:	سید فریاد علی
قلمی نام:	(ڈاکٹر) فریاد آزر
پیدائش:	10-7-1956
والدین:	الحاج سید عبدالحق شاہ (مرحوم)، فاطمہ بیگم (مرحومہ)
آبائی وطن:	غوثیہ بازار، وارانسی
تعلیم:	ایم اے، ایڈوانس ڈپلومہ ان ماس کمیونیکیشن میڈیا، پی۔ ایچ۔ ڈی
شعری رہنما:	ساجن پردیسی مرحوم اور پروفیسر عنوان چشتی مرحوم
پیشہ:	درس و تدریس
تصانیف:	۱۔ خزاں میرا موسم 1994
	۲۔ بچوں کا مشاعرہ 1998 (ناشر: حکومت دہلی)
	۳۔ قسطوں میں گزرتی زندگی 2005
	۴۔ کچھ دن گلوبل گاؤں میں 2009
	۵۔ من خوب می شناسم (انشائیے) زیر طبع
خصوصی گوشے:	۱۔ ماہنامہ شاعر
	۲۔ سہ ماہی انتساب
مدیر اعزازی:	۱۔ ماہنامہ انٹرنیشنل اردو میڈیا
	۲۔ ماہنامہ عاکف کی محفل
انٹرنیٹ:	مدیر اعزازی: ایوانِ غزل ڈاٹ کوم
	موڈریٹر: ادب ڈاٹ کوم
اعزاز:	۱۔ سابق صدر، جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کے ہاتھوں نشانِ غزل ایوارڈ
	۲۔ اردو اکادمی دہلی کی جانب سے شعری مجموعہ کچھ دن گلوبل گاؤں میں کو ایوارڈ

فریاد آزر کا جہان دیگر

پروفیسر عتیق اللہ (نئی دہلی)

فریاد آزر کا نیا مجموعہ کلام موسوم بہ "کچھ دن گلوبل گاؤں میں" منظر عام پر آچکا ہے، اس سے قبل ان کے تین مجموعے "خزاں میرا موسم" (1994)، بچوں کا مشاعرہ (1998) اور قسطوں میں گذرتی زندگی (2005) میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان دس گیارہ برسوں کے دوران اگر چہ چوتھا محض انتخاب ہے۔ چار مجموعوں کی یکے بعد دیگرے اشاعت کے معنی یہ بھی ہیں کہ شاعر کا تخلیقی وجدان مسلسل رو بہ نمو ہے اور اس نمو یافتگی میں بھی محض یکساں روی کا دخل نہیں ہے کہ شاعر نے جس آواز کو ابتدائے سفر میں اپنی پہچان کا وسیلہ بنایا تھا، پندرہ بیس برس کے بعد بھی وہ اسی کی پرداخت میں مصروف ہے۔ فریاد آزر کے اس طویل تخلیقی سفر کے تمام سنگ ہائے میل کا مجھے بخوبی علم ہے۔ اطمینان کی خبر یہ ہے کہ کسی بھی سنگ میل کو انہوں نے مستقل پڑاؤ نہیں بنایا بلکہ ہر سنگ میل کے وقفے کو انہوں نے ایک تجربے کے طور پر ہی اخذ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فریاد آزر کے کلام میں واضح طور پر ایک ارتقاء کی صورت نظر آتی ہے۔ اس قسم کا ارتکاز اور یکسوئی جو شاعر کے اعتماد کی دلیل ہے، کم ہی کا مقدر بنتی ہے، اس کے لئے اپنے آپ سے بڑی جنگ لڑنی پڑتی ہے، اپنے آپ کو بار بار رد کرنا پڑتا ہے، بار بار اپنی باطن کی چھان پھٹک کرنی پڑتی ہے، اپنے لمحاتی جذبوں اور ان کے وفور پر قدغن لگانی پڑتی ہے جب کہیں ارتکاز اور یکسوئی کی وہ صورت پیدا ہوتی ہے جو شاعر کے قدم بقدم پیش روی کرتی ہے۔ درج ذیل اشعار فریاد آزر کی تخلیقی سمت و رفتار کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور اس تخلیقی تدریجی ارتقاء کے مظہر بھی ہیں جس کا پہلا نقش 'خزاں میرا موسم' نے قائم کیا تھا۔

عجیب طور کی مجھ کو سزا سنائی گئی
بدن کے نیزے پہ سر رکھ دیا گیا میرا

دل تو بس اپنی امیدوں کا سبب جانتا ہے
ذہن کو کیسے میں سمجھاؤں کہ سب جانتا ہے

اب تو ہر شہر ہے اک شہرِ طلسمی کہ جہاں
جو بھی جاتا ہے وہ پتھر میں بدل جاتا ہے

تمام عمر بھٹکتا رہا میں خانہ بدوش
خرید بھی نہ سکا اک مکان قسطوں میں

جو مکاں اپنے بزرگوں نے بنایا تھا کبھی
اس مکاں میں ہم کرائے دار ہو کر رہ گئے

(خزاں میرا موسم)

دفن کر دیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہدِ قدیم
رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دورِ جدید

پھر وہی منظر نظر کے سامنے کیوں آگیا
کربلا، خوں ریزی، کوفہ، تشنگی، صحرا، فرات

جب ملا تبدیلیٔ تاریخ کا موقع اسے
نام خود اپنا سنہرے اکشروں میں لکھ دیا

یہ بلائیں سر سے کچھ ٹلتی نظر آتی نہیں
اب انہیں ہی زندگی کا استعارہ مان لو

مرے وجود سے اس درجہ خوف ہے اس کو
کہ میرا نام و نشاں ہی مٹانا چاہتا ہے

(قسطوں میں گذرتی زندگی)

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ فریاد آزر نے کسی بھی مرحلۂ سفر کو مستقل پڑاؤ نہیں مانا۔ 'خزاں میرا موسم' کے اشعار میں آزر جس کرب اور جس دکھ سے دوچار ہے وہ عصری تہذیبی زندگی کا پیدا کردہ ہے۔ فریاد آزر اپنی چاروں طرف کی ہنگامہ خیز اور شور آگیں زندگی سے پوری طرح بلکہ اپنے پورے وجود کے ساتھ وابستہ بھی ہے اور اس سے ایک ایسی لاتعلقی بھی محسوس کرتا ہے جو اس کے لئے مستقل ایک سوال بنی رہتی ہے۔ دونوں کے درمیان ایک ایسی خلیج ضرور ہے جو بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتی لیکن شاعر کا سارا دکھ ہی یہی ہے کہ پوری طرح شمولیت کے باوجود ایک اجنبی پن ایک نامانوسیت بہرطور برقرار ہے۔ دراصل فریاد آزر ایک ایسا خاص اخلاقی وزن رکھتا ہے جسے تمام حقائق اور تمام چیزوں کی کسوٹی کا نام دینا چاہئے، اسے جہاں اپنی اخلاقیات سے تصادم کا سامنا ہوتا ہے وہیں اس کے قلم میں بھی ایک نئی آب آجاتی ہے اور احتجاج اس کا کلمہ بن جاتا ہے۔ فریاد آزر کے لئے شہر اور اس کی اندھادھند بڑھتی پھیلتی ہوئی تہذیبی زندگی ہی تمام اعلیٰ ترین انسانی اقدار کی مرگ آثاری کا باعث ہے انسانی رشتوں کی پامالی اور نیک ترین انسانی جذبوں اور بنیادی معصومیتوں کی ناقدری، فریاد آزر کے خوش خواب کے تئیں ایک بڑے چیلینج کا بھی حکم رکھتی ہے۔ فریاد آزر کا یہی خوش خواب (یوٹوپیا) 'قسطوں میں گذرتی زندگی' تک آتے آتے چکنا چور ہو جاتا ہے، جس کی بس کرچیاں ہی اس کے حصے میں آتی ہیں۔ غزل کی صنف کے عمومی مضامین کے برخلاف فریاد آزر کے مضامین شعر، ان کے اپنے تجربات کی کوکھ سے پھوٹے ہیں۔ جو غزل کی عمومی فضا کے تئیں یقیناً نامانوس ہیں لیکن اس اقلیت کے ایک فرد کے لئے قطعاً نامانوس نہیں ہیں، جو گذشتہ ساٹھ برسوں سے ایک انتہائی غیر یقینی، حوصلہ شکن، بشریت کش، اور تاریخ کش عہد میں زیست بسری کے لئے مجبور ہے۔ ہمارے ادوار میں تاریخ نے ایک ایسی مظلوم و مجبور عورت کا روپ دھارن کر لیا ہے جو تنہا اور بے چارہ ہے اور جس کی عصمت کو صدیوں کے من گڑھت مظالم کے انتقام کی پیاس بجھانے کے لئے بڑی بے دردی اور ہٹ

دھرمی کے ساتھ تار تار کیا جا رہا ہے۔ احمد آباد اور سورت کے واقعات، تاریخ کے وہ متون ہیں جن کے تحت المتون فریاد آزر کی شاعری کے اصل مخرج ہیں۔ فریاد آزر نے ان مضامین نو کے علاوہ ایسے بہت سے مضامین کو بھی جگہ دی ہے، جن کی معنویت کا دائرہ قدرے وسیع ہے۔ اسی نے حقائق کے پرے اور میرے دیکھنے اور محسوس کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ ہر جا جو جہانِ دیگر ہے آزر اسے بڑے ضبط اور یکجائی کے ساتھ کسب کرنے کی طرف مائل دکھائی دیتا ہے۔ اس جہانِ دیگر کا تعلق جہاں ایک طرف اس کے ہر چہار طرف کی دنیا سے ہے وہیں اس کے اس باطن سے بھی گہرا ہے جو نہ تو محفوظ ہے اور نہ جس کی حیثیت ایک مامن کی رہی ہے۔ فریاد آزر کی شاعری میں انہیں بے چینیوں نے اس کی آواز کو بھی لہو رنگ بنا دیا ہے۔

چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا
رُکے تو پاؤں سے آگے نکل گئی صدیاں

سب حقائق مجھ سے بھی پہلے کہیں موجود تھے
میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ مری ایجاد ہے

بدلے میں اس کی موت، مرا میں تمام عمر
وہ شخص جی گیا مرے حصے کی زندگی

پاؤں کے نیچے سلگتی ریت صدیوں کا سفر
اور سر پر بارِ سقف آسماں جلتا ہوا

گلوبل گاؤں کا نمائندہ شاعر۔ ڈاکٹر فریاد آزر

سعید رحمانی (کٹک)

اس میں شک نہیں کہ نئے عہد نے ہم پر خوش حالی اور عیش و عشرت کے در وا کیے ہیں۔ سائینس اور ٹکنولوجی نے مادی ترقیات کو تیز رفتاری عطا کی ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے اس وسیع و عریض دنیا کو ایک گلوبل گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے مگر بایں ہمہ ان سائنسی دریافتوں اور فکری جدتوں نے مادی پیش رفت کے پہلو بہ پہلو روحانیت کو بھی مجروح کیا ہے۔ اطمینان، قلبی سکون اور راحت جیسی بے بہا دولت آج قصۂ پارینہ نظر آتی ہے۔ یہ سب اس لئے کہ اعلیٰ اقدار کی پامالی، تہذیب کی شکست و ریخت، خود غرضی اور منافقت جیسی علتیں ہمارے معاشرے کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہی ہیں۔ آج کا انسان کبھی ذات کے محفوظ جزیرے میں قید نظر آتا ہے تو کبھی اجتماعی انتشار کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں خود کو نامساعد حالات سے متصادم پاتا ہے۔

اس بحران میں سانس لینے والی نسل زندگی کے چوراہے پر کھڑی آگے کا راستہ متعین کرنے میں منہمک نظر آتی ہے۔ اس نسل کے فنکاروں میں جنہوں نے گزشتہ صدی کی آٹھویں دہائی کے آس پاس اپنے تخلیقی وجود کا ثبوت دینا شروع کیا، ان میں سے بیشتر کی شاعری اپنے عہد کا ایک ایسا آئینہ نظر آتی ہے جس میں عہد حاضر کے مختلف چہرے عکس ریز ہیں۔ انہی فنکاروں میں ڈاکٹر فریاد آزر ایک اہم نام ہے۔ وہ خالصتاً غزل کے شاعر ہیں۔ عصری شعور کی حامل ان کی غزلیں سماجی، معاشی اور نفسیاتی رویوں کے ہر رخ کی ترجمانی کے ساتھ بالخصوص امت مسلمہ کی حالتِ زار کا المناک پہلو پیش کرتی ہیں۔ ان غزلوں سے ان کا فکری اخلاص مترشح ہے جن میں سماجی شعور اور اسلامی فکر کی ایسی فضا بندی ہوئی ہے جس سے ان کی غزل گوئی کے وسیع تر امکانات روشن نظر آتے ہیں۔

ان کا حقیقی نام سید فریاد علی ہے اور ادبی دنیا میں ڈاکٹر فریاد آزر کے نام سے معروف ہیں۔ بنارس میں ان کی ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۵۶ء کو ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ وہیں سے کیا اور اعلیٰ تعلیم کی غرض سے دہلی آگئے۔ دہلی یونیورسٹی سے بی اے، جواہرلال نہرو یونیورسٹی سے ایڈوانس ڈپلومہ ان ماس کمیونیکیشن میڈیا، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ سردست دہلی میں

قیام ہے جہاں وہ درس و تدریس کے معزز پیشہ سے وابستہ ہیں۔ صحافت کا اچھا تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ ماہنامہ انٹرنیشنل اردو میڈیا کی ادارت سے تین سال تک وابستہ رہے۔ فی الحال ماہنامہ ''عاکف کی محفل'' کے مدیر اعزازی ہیں اور ادب ڈاٹ کوم کے موڈریٹر کی حیثیت سے اپنا ایک ادبی ویب سائٹ بھی چلا رہے ہیں جس کے ہزاروں ممبر ساری دنیا میں موجود ہیں۔

انھیں یوں تو بچپن سے شاعری کا شوق رہا ہے مگر اس کا باقاعدہ آغاز ۱۹۷۸ء میں کیا۔ پہلے ساجن پردیسی مرحوم سے اصلاحیں لیں اور آخر میں پروفیسر عنوان چشتی مرحوم کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔ اب ماشاءاللہ وہ اس مقام پر ہیں کہ دوسرے ان سے کسب فیض کر رہے ہیں۔ یوں تو طالب علمی کے دور سے ہی ان کی تخلیقات شاعر، شب خون، آہنگ، سب رنگ، ادب لطیف، افکار (پاکستان) جیسے مقتدر رسائل کی زینت بننے لگی تھیں مگر اب یہ حال ہے کہ بیشتر رسائل میں نظر آتے ہیں اور اپنی ایک منفرد شناخت بھی بنائی ہے۔ تصنیفات میں بچوں کا مشاعرہ کے علاوہ دو (غزلیہ) شعری مجموعے ''خزاں میرا موسم'' اور ''قسطوں میں گزرتی زندگی'' منظر عام پر آ کر خراج تحسین وصول کر چکے ہیں اور ابھی ابھی ان کا تیسرا شعری مجموعہ '' کچھ دن گلوبل گاؤں میں'' منظر عام پر آیا ہے جو دراصل پہلے دو مجموعوں کا ایک جامع انتخاب ہے۔ اس انتخابی مجموعہ کو پیش کرنے کا عمل اس نقطۂ نظر سے لائق تحسین ہے کہ ان کی نمائندہ تخلیقات یکجا نظر آئیں گی۔ جو لوگ تحقیقی امور سے جڑے ہیں وہ اگر آزر صاحب پر کچھ لکھنا چاہیں تو اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ آزر صاحب کی شاعری کے متعلق لب کشائی سے پہلے میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا یہ قول پیش کرنا چاہوں گا۔

''شاعر وہی اچھا ہے جو اپنی مہر بند شخصیت میں روزن بنا کر خود کو لامتناہیت کے لمس سے آشنا کرے''۔ ڈاکٹر فریاد آزر کی غزلوں میں واحد متکلم اگر چہ اپنی ہی ذات کے خول میں نظر بند آتا ہے۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو وہ اپنی ذات کے اندر محدود نہ رہکر ہر دور کے معاشرے کا ایک ایسا نمائندہ فرد ہے جس کی نظیر مسائل کی دھوپ میں تپتے ہوئے ریگستانوں میں کھڑے اس شخص سے دی جا سکتی ہے جو ہمدردی اور خلوص کی چادر سے محروم ہے۔ دونوں مجموعوں کے بیشتر اشعار سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فریاد آزر کی وسطی زندگی جہد مسلسل میں گزری ہے اور زندگی کی کڑی دھوپ کے صحرا میں مدتوں آبلہ پائی کے کرب سے دوچار رہے ہیں۔ واللہ علم بالصواب۔ ان کے کچھ اشعار میرے اس گمان کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔ مثلاً

وہ لے رہا تھا مرا امتحان قسطوں میں
خبر نہ تھی کہ نکالے گا جان قسطوں میں

تمام عمر بھٹکتا رہا میں خانہ بدوش
خرید بھی نہ سکا اک مکان قسطوں میں

تمام قرض ادا کر کے ساہوکاروں کا بچا ہی لوں گا بزرگوں کی آن قسطوں میں
جو مکاں اپنے بزرگوں نے بنایا تھا کبھی اس مکاں میں ہم کرایہ دار ہو کر رہ گئے
صبح ہوتی ہے تو دفتر میں بدل جاتا ہے یہ مکاں رات کو پھر گھر میں بدل جاتا ہے
سب میں کرایہ داروں کے پائے گئے نشاں جسموں کے شہر میں کوئی خالی مکاں نہ تھا

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ آزر صاحب کی زندگی میں جو کڑے لمحے آئے ہیں ان میں بے گھری کا کرب سب سے نمایاں ہے۔ بنارس سے دہلی ہجرت اور پھر دہلی میں مستقل قیام کے دوران ان کی ذاتی زندگی میں اچانک قیامت صغرا کی زبردست ہنگامہ آرائی بھی ان کی شاعری میں جا بجا محسوس کی جاسکتی ہے۔ شخصیت اور شاعری کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔ شاعر جو محسوس کرتا ہے یا اس کے اپنے جو مشاہدات و تجربات ہوتے ہیں انہیں اس طرح شعری لباس عطا کرتا ہے کہ فردیت اجتماعیت کا روپ دھار لیتی ہے۔ فریاد آزر چونکہ ایک حساس انسان ہیں اس لئے عصر حاضر کی قہر سامانیاں ان پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کی شاعری انسانیت کو درپیش مسائل سے مکالمہ آرائی کرتی نظر آتی ہے۔ آج کی صارفیت اور عالم گیریت کی اندھی دوڑ میں جبکہ اخلاقی قدریں اور ترجیحات یکسر بدل چکی ہیں۔ انسانیت کا قتل عام جاری ہے۔ ایسے میں آزر صاحب نے اپنی شاعری سے نوک نشتر کا کام لینے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں عہد حاضر کا منظر نامہ قاری کو لمحہ فکریہ عطا کرتا ہے۔

گھٹ گھٹ کے مر گیا مرے اندر کا آدمی پھر آ کے بس گیا کوئی پتھر کا آدمی
اب اس کی روح میں شیطان بس گیا آزر وہ جسم گاؤں سے انسان لیکے آیا تھا
اب کے برس بھی جھوٹ ہمارا پیٹ بھرے گا سچائی افلاس لکھے گی اب کے برس بھی

آج کی مادہ پرست دنیا کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ رشتوں میں استواری نہیں رہی۔ اگر دنیا سکڑتی جارہی ہے تو فرد سے فرد کی دوری بھی بڑھنے لگی ہے۔ اس فکری بعد اور ذہنی فاصلہ نے انسان کو اپنی ذات کے خول میں بند کر دیا ہے۔ تنہائی اس کا مقدر بن چکی ہے۔ چنانچہ شناسا لوگ بھی نظر پھیر کر گزر جاتے ہیں۔ بے حسی ایسی کہ منھ اور کان رہتے ہوئے بھی انسان گونگا اور بہرا لگتا ہے اور تو اور شہر ایک ایسا طلسم خانہ بن چکا ہے جس کی حدود میں قدم رکھتے ہی لوگ پتھر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

وقت کے ٹھکرائے کو گردانتا کوئی نہیں جانتے ہیں سب مجھے پہچانتا کوئی نہیں
پہلے تو اس نے شہر کو بہرا سمجھ لیا پھر یوں ہوا کہ خود کو ہی گونگا سمجھ لیا

اب تو ہر شہر ہے اک شہرِ طلسمی کہ جہاں جو بھی جاتا ہے وہ پتھر میں بدل جاتا ہے

اب ذرا دنیا کی تیز رفتاری اور خاندان کے بکھراؤ کے ساتھ ساتھ جدید دور کہ یہ کرشمے بھی دیکھیں کہ کمپیوٹر نے اب بچوں کی کتابوں کے بستہ کی شکل لے لی ہے۔ اوزون کے سوراخ سے در آنے والی بنفشی شعاعوں کا حملہ بھی ہونے لگا ہے جس سے عمل تنفس کا متاثر ہونا یقینی ہے اور لمحوں میں صدیوں کا فاصلہ طہ کرنا کوئی محیر العقول بات نہیں رہی۔

نھا کمپیوٹر، قلم، کاپی، کتابوں کی جگہ اس قدر سوچا نہ تھا ہو جائیں گے بستے جدید

ورنہ ہم سانس بھی لینے کو ترس جائیں گے سطح اوزون کو فضلات سے آزادی دے

چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر فریاد آزر کی شاعری کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ جس جدید معاشرے کے جملہ مسائل اپنی تمام تر سنگینوں کے ساتھ واضح نظر آتے ہیں تاہم ان کی شاعری کا ایک خوشگوار پہلو ایسا بھی ہے جو ان سب پر حاوی نظر آتا ہے اور وہ پہلو ہے ان کی اسلامی فکر جسے ان کی شاعری میں اساسی حیثیت حاصل ہے۔ عہد حاضر میں اسلام مخالف طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب آج عالم اسلام جس سنگین صورتحال سے دوچار ہے وہ ہر ذی فہم کے لئے کسی لمحۂ فکریہ سے کم نہیں۔ ایسے میں ایک قلم کار کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے تلوار کا کام لے اور اسلام مخالف سازشوں کا پردہ چاک کرے۔ آزر صاحب نے اس فریضہ کو بحسن خوبی نبھایا ہے۔ اس ذیل میں انہوں نے انگنت شعر کہے ہیں۔ کہیں تلمیح سے کام لیا ہے تو کہیں ایمائیت سے اور کہیں کہیں برملا اظہار بھی ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف چند اشعار کا حوالہ پیش ہے۔

دہر میں زندہ ابھی نمرود کا ہمزاد ہے امتحاں میں اب بھی ابراہیم کی اولاد ہے

کربلا ہو کہ فلسطینؔ کہ ہو بوسینیا درد صدیوں سے مرا نام و نسب جانتا ہے

سب سنائی دیتا ہے آزر اذانوں کے سوا محو حیرت ہیں کہ ہم بھی ہو گئے کتنے جدید

صحرا سے العطش کی صدا آ رہی ہے پھر تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے پھر

آزر صاحب کی شاعری سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ مروجہ یکسائی فکر کی عام روش سے ہٹ کر انہوں نے جو اشعار کہے ہیں ان میں مواد اور ہیت کے درمیان فاصلہ کو انہوں نے جس کامیابی سے طے کیا ہے اس سے ان کی فنی اور فکری بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ لسانی اور اسلوبیاتی سطح پر بھی وہ راہِ اعتدال سے متجاوز نہیں ہوئے ہیں۔ مشکل تراکیب اور دورانہ کار استعارات سے عمداً گریز سے ابلاغ وترسیل کا مسئلہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وہ محاسن ہیں جن کی بدولت ان کی شاعری قاری کے انجذاب

توجہ کا باعث بنتی ہے۔ ان کے ہاں کچھ اشعار ایسے بھی مل جاتے ہیں جنہیں ان کا شناس نامہ کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ اولین شعر دیکھیں۔

خوب صورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے　　ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں

بیشتر اشعار میں انکی ایسی سوچ بھی کار فرما ہے جس سے ان کے فکری ارتقاع اور تخلیقی جوہر کا پتہ چلتا ہے۔ خصوصاً لفظوں کو انہوں نے جو کثیر الجہتی عطا کی ہے اس کے سبب ان کی شاعرانہ آواز اپنے ہم عصروں میں دور سے پہچانی جا سکتی ہے۔ اس قبیل کے چند اشعار دیکھیں۔

وہ زندگی تھی دھوپ سے لڑنے کی زندگی　　ہم نے گزار دی جسے چھاؤں میں بیٹھ کر

رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں　　چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا

وہ شخص جی گیا مرے حصے کی زندگی　　بدلے میں اس کی موت مرا میں تمام عمر

سب کی آنکھیں رکھی تھیں گروی میرے دشمن کے پاس
کون میرے گھر کی بربادی کا منظر دیکھتا

اس میں شک نہیں کہ آزر صاحب حرف کے مزاج داں ہیں اور ان کا کلام صلابت فکری اور شعری بصیرت کا نمونہ۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید حسیت، سماجی شعور اور اسلامی افکار سے وابستگی کے سبب ان غزلوں میں جو دلکش فضا بندی ہوئی ہے وہ انکی شعری جہات کے وسیع تر امکانات کا جواز فراہم کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کے گلوبل گاؤں کی نمائندگی کرنے والے ڈاکٹر فریاد آزر نے وقت کے محضر نامہ پر اپنے فکروفن کے جو دستخط ثبت کیے ہیں ان کی شناخت لکیروں کے ازدحام میں بڑی آسانی سے کی جا سکتی ہے۔

نئی غزل کے معتبر فنکار: ڈاکٹر فریاد آزر

رفیق شاہین (علی گڑھ)

عمر کی پچاس بہاریں دیکھ چکے ڈاکٹر فریاد آزرؔ ہندوستان کی راجدھانی میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ Ph.D. کے اعزاز سے سرفراز جدید لب و لہجے اور نئی آواز کے معتبر و منفرد شاعر ہیں۔ان کے تازہ ترین غزلوں کے مجموعے ''قسطوں میں گزرتی زندگی'' سے بھی پہلے ان کے دو شعری مجموعے ''خزاں میرا موسم'' (۱۹۹۴ء) اور ''بچوں کا مشاعرہ'' (۱۹۹۸ء) منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر ارباب دانش اور شائقین ادب سے بھرپور خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب پچھلی کئی دہائیوں سے بڑی لگن، تندہی اور مستعدی کے ساتھ غزل میں مشق و ممارست کرتے چلے آرہے ہیں اور اب ایک قادرالکلام اور پختہ گو شاعر کہلانے کا بجا طور پر استحقاق رکھتے ہیں۔آپ کی تخلیقات ملکی اور غیر ملکی صف اول کے ممتاز و معیاری رسائل و جرائد میں تواتر سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔آفاق ادب میں آپ کا نام نامی خورشید عالم تاب کی طرح تاباں ہے۔ادب میں آپ کی شناخت مستحکم ہو چکی ہے اور آپ کا نام صف اول کے ممتاز و معتبر شعراء کی فہرست میں شامل ہے۔

سادگی و سلاست، ندرت و انفرادیت، عصری حسیت، سماجی معنویت، وحدت و صداقت، ذاتیت و آفاقیت، خارجیت و داخلیت، فصاحت و بلاغت، نزاکت و جمالیت اور حلاقت و شعریت ان کی نئی غزل اور شاعری کا خلاصہ ہیں۔ان کا فکری شعور ان کی اپنی آگہی کے ہنڈولے میں پروان چڑھا ہے۔اپنے اطراف و اکناف اور معاشرے و ماحول پر وہ گہری نگاہ رکھتے ہیں اور خارجی محرکات ہی ان کی داخلیت کی گہری جھیل میں شناوری کے عمل سے گزر کر شعر کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ان کی شاعری ذات سے لے کر کائنات تک کا سفر طے کرتی ہے۔انہوں نے روایت کے طلسمات اور رومانیت کی خیالی جنتوں اور حسن و عشق کے فرضی جہانوں اور پرستانوں میں پناہ لینے کے بجائے خود کو عصر حاضر کے سنگین مسئلوں اور تلخ سچائیوں کے حوالے کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں آج کے عہد کا چہرہ ہمیں حقیقی شکل میں نظر آتا ہے۔

جہاں فساد میں اعضائے جسم کٹ کے گرے
اسی زمین سے ہم لخت لخت اگنے لگے

پھر انتخاب کا موسم گزر گیا شاید
پھر اس کے ہونٹوں پہ لہجے کرخت اگنے لگے

ضد کرتا نہیں سستے کھلونوں کے لئے بھی
یہ بچہ میرا مجھ سے بھی بوڑھا نظر آیا

حمام میں تو خیر سبھی ہوتے ہیں ننگے
حمام سے باہر بھی وہ ننگا نظر آیا

دوسرے سیاروں پہ چلنے کی تیاری کرو
یہ زمیں کرنے کو ہے ساری سبیلیں مسترد

خلاؤں میں بھی شر پھیلا رہا ہے
پرندہ کتنا پر پھیلا رہا ہے

فریاد آزر کی شاعری میں ان کی اپنی آگہی نہایت اہم رول ادا کرتی ہے۔ یہ آفتابِ آگہی ان کی دنیائے شعور وادراک اور جہان فکر وخیال کے ذرے ذرے کو اپنے نور کی زرق برق زریں شعاعوں سے تاباں و درخشاں کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے سحاب خامہ سے اشعار کے دمکتے موتی برسنے لگتے ہیں ۔

مجھے بھی کرنا پڑا تھا بسر جہنم میں
مرا مکان تھا جنت میں، گھر جہنم میں

سانس بھی لوں اور شہر ہوا سے بچنا چاہوں
دنیا میں رہ کر دنیا سے بچنا چاہوں

طرز عمل ایسا بھی نہیں جو زندہ رکھے
پھر بھی میں انجامِ فنا سے بچنا چاہوں

کن کن صعوبتوں سے گزرنا پڑا مجھے
اس زندگی میں بارہا مرنا پڑا مجھے

جذبے میں آ کے میں نے بھی سچ بول تو دیا
پھر اپنے ہی بیاں سے مکرنا پڑا مجھے

گھٹ گھٹ کے مر گیا مرے اندر کا آدمی
پھر مجھ میں آبسا کوئی پتھر کا آدمی

ڈاکٹر صاحب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ نئی نئی شگفتہ زمینیں تلاش کر کے ان میں اپنے افکار وخیالات اپنے نقشے کے مطابق سجا اور سنوار کر ڈھالتے ہیں۔ ''اندر کا آدمی''، ''بسر جہنم میں'' اور ''سر اتار دیتا ہے'' جیسی زمینوں والی ان کی غزلیں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب بخوبی واقف ہیں کہ آج سیاست ہو یا معاشرت' مذہب ہو یا ادب، آج زندگی سے وابستہ ہر شعبہ سخت بے راہ روی اور افراتفری کا شکار ہے۔ ذات پات، عدم انصاف، مذہبی وملی عصبیت ومنافرت، اہل سیاست کی ریشہ دوانیاں، مقتدر ہستیوں کی متعصّبانہ روش، رہنماؤں کی خود غرضی وخود پرستی اور بے ضمیری' قانون کی خلاف ورزی، حقوق کی پائمالی' قاتل صفت جماعتوں کی وحشت و بربریت' رشوت خوری' رشتوں سے لاتعلقی' تہذیب وتمدن سے بیزاری' اعلیٰ قدروں کی پسپائی اور جائزہ وناجائز طور پر دولت کمانے کی ہوس نے اس ارضی جنت کو ایک شعلہ فشاں جہنم میں تبدیل کر دیا ہے جہاں نیک دل سیدھے سچے ایماندار اور شریف انسانوں کے لئے جینا حرام ہو کر رہ

گیا ہے۔ خود پرستانہ اور خود غرضانہ نئے نئے معیارات نے معاشرے کو سنگین مسائل کا ایک جنگل بنا دیا ہے جہاں طاقتور اور دولتمند انسان نما درندے دندناتے پھر رہے ہیں اور غریب و شریف انسان اپنی غربت کے تاریک غاروں میں سہمے اور سکڑے بیٹھے تبدیلی وقت کے مشاہدے میں مصروف ہیں۔ زندگی کو کہیں بھی جائے اماں نصیب نہیں اور موت سے بھی بدتر زندگی بڑی بے یقینی کے عالم میں بسر ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر فریاد آزر نے ایسے ہی ناموافق حالات اور معاشرے کی کسمپرسی اور زبوں حالی کی اپنی شاعری میں بھرپور عکاسی کی ہے اور خوب کی ہے ۔

کیوں نہیں یکبارگی کی موت مرتی زندگی
اے مری جانکاہ قسطوں میں گزرتی زندگی

گرو کی یاد انگوٹھے سے آنے لگتی ہے
میں جب بھی ہاتھوں میں تیر و کمان لیتا ہوں

آزما کر عالمِ ابلیس کے حربے جدید
ہوگئے قابض مری صدیوں پہ کچھ لمحے جدید

دفن کر دیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہد قدیم
رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دور جدید

اس قبیلے کے لہو میں ذائقہ اتنا لگا
جس کو بھی دیکھا اسی کے خون کا پیاسا لگا

مدتیں گزریں مجھے احباب کو دیکھے ہوئے
مسئلوں نے مجھ کو ایسی قید تنہائی کی دی

پھر وہی منظر نظر کے سامنے کیوں آ گیا
کربلا، خوں ریزی، کوفہ، تشنگی، صحرا، فرات

پھر بیعت یزید سے منکر ہوئے حسین
اور ظالموں کی فوج ستم ڈھا رہی ہے پھر

دہر میں زندہ ابھی نمرود کا ہمزاد ہے
امتحاں میں اب بھی ابراہیم کی اولاد ہے

سروں کی فصل کٹتے دیکھنا اس کی سیاست ہے
ہے اس کا مشغلہ صحن فضا میں زہر بونے کا

کم زور شہ زور سے، معصوم گنہگار سے اور مظلوم ظالم سے ہمیشہ ہی تباہ و تاراج ہوتا رہا ہے۔ جھوٹ اقتدار کی مسند پر متمکن ہو کر وقت کا سب سے بڑا سچ بن جاتا ہے۔ طاقتور اپنے کسی بھی عمل پر جواب دہی سے مستثنیٰ ہے جبکہ کمزور ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ اس ظلم اور ناانصافی پر نہ تو زمین کی چھاتی شق ہوتی ہے اور نہ ہی آسمان کا کلیجہ پھٹتا ہے البتہ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی لاچار انسانیت ضرور خون کے آنسو بہاتی رہتی ہے۔

یہاں تاریخ کہلاتی ہے فرسودہ حکایت بھی
اور اس کے سامنے آنکھیں چراتی ہے حقیقت بھی

مر گئے بوئے ہوئے زہر سے اتنے معصوم
اب اترتے نہیں کھیتوں میں پرندے معصوم

آگ جنگل میں لگا دیتے ہیں بدمست درخت
بے گناہی کی سزا پاتے ہیں پودے معصوم

اب اترتے ہیں کسی اور ہی سیارے پر
اتنے خائف ہوئے دھرتی سے پرندے معصوم

جو سیاست نے اٹھا دی ہے دلوں کی درمیاں جانے کب ہوں گی وہ زہریلی فصیلیں مسترد

وہ امن و آشتی کا نام لے کر جہاں میں اپنا ڈر پھیلا رہا ہے

وہ جرم میں نے جسے ایک بار بھی نہ کیا قبول اس کو مجھے بار بار کرنا پڑا

ذلیل خود کو اسے باوقار کرنا پڑا یہ اہتمام مجھے بار بار کرنا پڑا

مذکورہ مطلع بے پناہ مطلع ہے جو ہزاروں موقعوں پر حوالہ بن کر موقع محل کی نزاکت کا ترجمان ثابت ہوگا۔ ایسے شعر جو شاعر کے تجربے میں قاری کو شامل کر کے اور اس کی تائید حاصل کر کے اس سے مہر تصدیق ثبت کرالیں مشکل سے ہی عالم وجود میں آتے ہیں۔

ڈاکٹر فریاد آزر کی زبان سادہ، لہجہ تیکھا اور اسلوب نگارش ندرت و انفرادیت اور گہرے تاثر کا حامل ہے۔ ان کی شاعری میں احتجاجاً طنز اور نشتریت کے حربے بھی آزمائے گئے ہیں لیکن دبی آواز اور لہجے کی نرمی و شائستگی کے سبب یہ طبیعت پر بارِ گراں ثابت نہیں ہوتے۔

ڈاکٹر صاحب خیال کے اظہار میں تشبیہات و استعارات، رموز و علامات اور اشاریت و ایمائیت سے مدد لیتے ہیں مگر اس بات کا خیال خاص طور پر رکھتے ہیں کہ ان کی شاعری میں تجریدیت، تکثیریت، مجہولیت، ابہامیت اور مہملیت نہ در آئے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ کھڑا نہیں کرتی۔ ان کا شعر سلاست و فصاحت اور بلاغت سے آراستہ ہونے کے سبب زبان پر آتے ہی اپنی شرح آپ بن جاتا ہے اور ان کی مقصد سے بھرپور بامعنی شاعری کم پڑھے لکھے قارئین کی سمجھ میں بھی بآسانی آجاتی ہے۔

نئے لب و لہجے میں شعر کہنے والے اور بھی ہیں لیکن فریاد آزر کی بات ہی نرالی ہے۔ ان کی آواز کے سر میں جو انوکھی دلکشی اور نغمگی کا پرتو ہے، وہ کسی بھی شاعری میں موجود نہیں ہے۔ ان کا لہجہ سب سے الگ ہے جو اپنی مخصوص کھنک اور تیکھے پن کی وجہ سے ان کی ایک الگ پہچان بن گیا ہے۔ بالفاظ دیگر اگر ہم انہیں ایک بے مثال اور صاحبِ طرز شاعر کے خطاب سے پکاریں تو اس میں کسی کو اعتراض نہ ہوگا۔

ڈاکٹر فریاد آزر نے مختلف النوع مضامین اور موضوعات سے اپنے شعری گلدستے کو سجایا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ان سبھی شعری جہات کا محاسبہ اور احاطہ ممکنات کی حد سے باہر ہے لہٰذا راقم الحروف ان کے اس مقطع کے ساتھ ہی درِ مضمون بند کرتا ہے۔

آزر سے مل کے مجھ کو بھی ایسا ہی کچھ لگا صدیوں پہ ہے محیط گھڑی بھر کا آدمی

سبز ساعتوں کا شاعر: فریاد آزر

ڈاکٹر ممتاز الحق (نئی دہلی)

سنہ ۸۰ کے آس پاس شعراء کی جو نئی نسل سامنے آئی وہ کئی لحاظ سے اپنے پیش رو شعراء سے مختلف تھی۔ تازہ دم، نئی فکر اور نئے اسالیب کی موجد، تازہ ہوا کے جھونکوں کی مانند! ان کا کمٹمنٹ نہ ترقی پسندی سے تھا نہ جدیدیت سے۔ ایک آزاد تخلیقی فضا کا احساس دلانے والے ان شعراء میں ایک اہم نام تھا فریاد آزر! فریاد آزر ۱۹۵۶ میں بنارس میں پیدا ہوئے، انٹر میڈیٹ کے بعد اعلا تعلیم کی غرض سے دہلی تشریف لائے۔ جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر عنوان چشتی کی شاگردی میں ۷۷۔۱۹۷۶ میں غزلیہ شاعری کا آغاز کیا۔

۱۹۹۴ میں فریاد آزر کا پہلا شعری مجموعہ خزاں میرا موسم منظرِ عام پر آیا اور پھر ایک طویل وقفہ کے بعد سنہ ۲۰۰۵ میں دوسرا شعری مجموعہ قسطوں میں گزرتی زندگی شائع ہوا۔ اس طویل وقفہ کی وجہ ایسے مسلسل حادثات تھے جنھوں نے آزر کے حوصلے پست کر دئے اور ان کی ذاتی زندگی بھی ایک مسلسل بے سکونی، ایک کرب ناک اضطراب اور ایک خاموش قیامتِ صغرا بن کر رہ گئی۔ دونوں مجموعوں کا انتخاب کچھ دن گلوبل گاؤں میں ۲۰۱۰ میں شائع ہوا۔

خزاں میرا موسم اور قسطوں میں گزرتی زندگی دونوں مجموعوں کے نام شاعر کے فطری درد و غم، اضطراب اور محرومی کے غماز ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ کوئی بھی حساس فن کاران سے بچ نہیں سکتا۔ زندگی کا عرفان انھیں جذبات و احساسات کا مرہونِ منت ہے۔ آزر کے یہاں ذاتی غموں اور ناکامیوں نے اس رنگ کو اور بھی گہرا کر دیا ہے۔

پڑا تھا لکھنا مجھے خود ہی مرثیہ اپنا　　کہ اپنے بعد بھلا اور کون تھا اپنا

پاؤں کے نیچے سلگتی ریت، صدیوں کا سفر　　اور سر پر بارِ ثقف آسماں جلتا ہوا

یاس، محرومی، تذبذب، کرب، خوش فہمی، انا　　اتنے ساماں تھے، مرا تنہا مکاں چھوٹا لگا

کربلا ہو کہ فلسطین کہ ہو بوسنیا　　درد صدیوں سے مرا نام و نسب جانتا ہے

کربلا، فلسطین اور بوسنیا کی علامتیں بتاتی ہیں کہ شاعر کا غم محدود نوعیت کا نہیں ہے، یہ اسے

ورثہ میں ملا ہے اور اس غم میں پوری ایک نسل اس کی شریک ہے۔ اسے صرف اس جرم کی سزا دی جارہی ہے کہ وہ حق کا طرفدار ہے اور اسکی وابستگی دینِ محمدی سے ہے۔ حیرت کی بات نہیں کہ آزر کی پسندیدہ علامتیں قرآن، رسول، اذان، نماز، سورۂ رحمان، سورۂ یاسین وغیرہ ہیں۔ سبز رنگ ان کے یہاں خدا شناسی، خداترسی، پاکیزگی، اخوت ومحبت اور حق گوئی و بے باکی کا استعارہ ہے۔ سبز رنگ کے مختلف شیڈس آزر کے تخلیقی تجربات کی رنگا رنگی کا وافر ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ان پرکشش تراکیب پر نظر ڈالیں: سبز صدی، سبز لمحات، سبز ہوا، سبز لمس، سبز سایے، سبز موسم، سبز رخت، سبز ہاتھ اور سبز گھاس! اور جب یہ ترکیبیں جزوِ شعر بنتی ہیں تو یہی سبز رنگ کئی دوسرے رنگوں کے پیکر تخلیق کرتا ہے اور شعر کی بلاغت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

نئی رتوں نے ہوا کی رو سے نہ جانے کیا ساز باز کر لی
کہ سبز صدیوں سے گونجتی آ رہی ندائے اذان بھی چپ
اس نے تو جڑ سے کاٹ ہی دی تھی روایتاً
یہ سبز گھاس ہے کہ اگی آ رہی ہے پھر

مغربی طاقتیں مشرق اور خاص طور پر اسلام کو ہمیشہ زیر کرنے اور اسے بدنام کرنے کی فکر میں رہی ہیں، ان کی سازشیں بے نقاب ہو چکی ہیں مگر مشرقی ممالک کبھی گلوبلائزیشن کے نام پر، کبھی تیل کی سیاست اور کبھی ایٹمی توانائی کے حربوں سے ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ آزر کی شاعری اس صورتِ حال کے خلاف شدید احتجاج درج کراتی ہے۔

جہاں کہیں بھی میں طاقت کی شکل میں ابھروں ‫ کسی بہانے وہ مجھ کو دبانا چاہتا ہے
سر پہ آکر رک گیا ہے آفتابِ مغربی ‫ پی نہ جائے وہ کہیں اب سارے کا سارا فرات
اس قبیلے کے لہو میں ذائقہ اتنا لگا ‫ جس کو بھی دیکھا اسی کے خون کا پیاسا لگا

آزر کی شاعری میں اقلیتی نفسیات کا گہرا شعور نظر آتا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک میں اقلیتوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے، ان کی حق تلفی کی جاتی ہے اور بعض مواقع پر انھیں دوئم درجہ کا شہری قرار دیا ہے۔ ہندستان میں بار بار فرقہ وارانہ فسادات کا برپا ہونا اس امتیاز کی بدترین شکل ہے۔

جو مکاں اپنے بزرگوں نے بنایا تھا کبھی ‫ اس مکاں میں ہم کرائے دار ہو کر رہ گئے
ہر آن سازشِ نو میں پھنسانا چاہتا ہے ‫ میں سر اٹھا ہی نہ پاؤں زمانہ چاہتا ہے

آزر کو اس بات کا احساس ہے کہ ساری دنیا میں ملت اسلامیہ خود انتشار کا شکار ہے۔ اس کی ناکامی کا خاص سبب یہی ہے۔ اس رویہ کے خلاف آزر کے یہاں شدید برہمی ملتی ہے۔

جدا جدا رگِ ظالم پہ وار کرتے ہیں — ستم زدہ وحدت میں کیوں نہیں آتے
متحد ہو کر نہ سورج کی طرح چمکے تو پھر — رفتہ رفتہ جگنوں کے پر کتر جائے گی رات

حالانکہ آزر کی شاعری کا مرکزی خیال قومی اور بین الاقوامی مظالم کے خلاف شدید احتجاج ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس عہد کے دیگر مسائل کی طرف ان کی نگاہ نہیں جاتی۔ سماجی، سائنسی، سیاسی، معاشی، تہذیبی، مذہبی، ادبی گویا کہ ہر طرح کے مسائل پر وہ بہت باریکی سے نگاہ ڈالتے ہیں۔ مندرجہ ذیل قبیل کے بے شمار اشعار آزر کے کلام میں کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔

ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں — خوب صورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے
دفن کر دیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہد قدیم — رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دورِ جدید
پھر نہیں خوف کوئی دونوں بڑے دیووں سے — سبز گلفاموں کو گر تھوڑی سیاست آ جائے
ورنہ ہم سانس بھی لینے کو ترس جائیں گے — سطحِ اوزون کو فضلات سے آزادی دے
گرو کی یاد انگوٹھے سے آنے لگتی ہے — میں جب بھی ہاتھ میں تیر و کمان لیتا ہوں
زہر پینا ہی پڑے گا ہمیں اپنا اپنا — اب کوئی دوسرا شنکر نہیں آنے والا

اظہار کی سطح پر آزر نے نئی شعری روایات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ غیر آرائشی زبان، سامنے کی مگر تازہ علامتوں کا استعمال، فارسی اضافتوں سے کم سے کم کام لینے کا ہنر، صنعتِ تضاد کے ذریعہ بیان کو پر تاثیر بنانے کا ملکہ، جذبہ و فکر کی ہم آہنگی، قافیہ و ردیف کی بنیاد پر شعر کو استوار کرنے میں مہارت ایسی خصوصیات ہیں جن سے آزر کے شعری مزاج اور انفرادیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ ترکیب سازی میں بھی آزر کے یہاں جدت نمایاں ہے۔ جسم کی کشتی، خواہشوں کا بحر بیکراں، سکوت موسم مکان، نیلا سراپا، تاریخی مسجدوں کا سکوت، برہنہ طرزِ بیان، سیاہ لفظوں بھری داستان، مٹی کا بادشاہ، دھوئیں کا لشکر، کربِ فلسطین وغیرہ۔ اس طرح ان تراکیب کی مدد سے وہ نئی شعری زبان کو نئے جہات سے آشنا کرنے میں بھی بڑی جدت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مثلاً غارِ حرا کے لہجے میں پناہ دینا، ابرہہ کے لہجہ میں عذاب کا آنا، خوش فہمی کے پنجوں پر کھڑے ہونا، قربتوں کی زد میں آنا، قسطوں میں جوان ہونا، قسطوں میں جینا مرنا وغیرہ۔ آزر کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا شعری مواد کبھی گھسا پٹا نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ کہ آزر نے زندگی اور دنیا کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، کائنات کے ذرہ ذرہ کو بغور محسوس کیا ہے۔ اس کے علاوہ تخیل کی پرواز بھی آزر کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ بڑے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دنیائے غزل میں فریاد آزر کا نام مستقبل قریب میں سورج کی طرح نمایاں ہوگا کیوں کہ آزر نے غزل میں اپنی انفرادیت کے نقوش ثبت کئے ہیں۔

فریاد آزر کی تخلیقی آزری

ڈاکٹر کوثر مظہری (نئی دہلی)

اردو غزل میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اس کے واضح نقوش بہت کم شاعروں کے یہاں نظر آتے ہیں۔ اپنے عہد کی ستم ظریفیوں و رعیاریوں کو آئینہ دکھانے کی ہمت ہر شاعر میں نہیں ہوتی۔ اس کام کے لئے صفائے باطن اور شعورِ فن کے ساتھ ساتھ تخلیقی قوت چاہئے۔ فریاد آزر ایک ایسے شاعر ہیں جو ۱۹۸۰ کے بعد کی ادبی نسل میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فرد کی بے ضمیری اور معاشرے کی بے مروتی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے:

پھر مرے سر پہ وہ شمشیر نظر آنے لگی — پھر میں سچ بولنے والا ہوں یزیدوں کے خلاف

اب تو ہر شہر ہے اک شہر طلسمی کہ جہاں — جو بھی جاتا ہے وہ پتھر میں بدل جاتا ہے

میں اپنی لاش کو تنہا ہی دفن کرلوں گا — کہ تم بھی جاؤ، سبھی لوگ گھر گئے اپنے

فریاد آزر نے رشتوں کے ٹوٹنے اور آدمی کے بکھر جانے کو بھی اپنے شعروں میں پیش کیا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجئے:

نہ کوئی دوست نہ ساتھی نہ کوئی رشتہ دار — غریب کیا ہوئے سب لوگ مر گئے اپنے

بسا رہا ہے ہر اک فرد اک الگ ہی جہاں — بکھر رہا ہے ہر اک خاندان قسطوں میں

فریاد آزر نے غزل کے چہرے سے پردۂ الہام کو چاک کیا ہے۔ وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہیں اور معاشرے میں جو تبدیلی رونما ہو رہی ہے یا ہو چکی ہے اسکی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ جدید ذہنوں اور جدید تہذیبی بساط پر کھڑی نئی نسل کو طنز کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔ آزر کے فکری ابعاد کی زد میں عہد جدید اور عہد قدیم دونوں ہیں۔ یہاں ایک ہی غزل کے دو شعر دیکھئے:

رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دورِ جدید — دفن کر دیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہد قدیم

محو حیرت ہیں کہ ہم بھی ہو گئے کتنے جدید — سب سنائی دیتا ہے آزر اذانوں کے سوا

تہذیبی سفاکیت کو آئینہ دکھانے کا کام نئی غزل میں خوب کیا گیا ہے لیکن فریاد آزر کے یہاں یہ رنگ قدرے تیز ہے۔ موضوع اور موقف پر غور کیجئے اور اوپر ذکر کئے گئے انسانی بے بسی کے

حوالے سے چند شعر دیکھئے:

عجیب طور کی مجھ کو سزا سنائی گئی　　بدن کے نیزے پہ سر رکھ دیا گیا میرا

پاؤں کے نیچے سلگتی ریت، صدیوں کا سفر　　اور سر پر بارِ سقف آسماں جلتا ہوا

آتا تھا دیر رات کو جاتا علی الصباح　　بچے اسے سمجھتے تھے دفتر کا آدمی

انسان کبھی کبھی غفلت شعاری میں اپنی عمر کے قیمتی لمحات گنوا دیتا ہے۔ اسے پتہ نہیں ہوتا کہ مستقبل کی کامیابی کا راز حال کی محنت اور مشقت میں ہے۔ فریاد آزر نے بڑی خوبصورتی سے اس مضمون کو پیش کیا ہے۔

ہم نے گزار دی جسے چھاؤں میں بیٹھ کر　　وہ زندگی تھی دھوپ سے لڑنے کی زندگی

اسی طرح کبھی انسانی پس و پیش اور کشمکش کے موضوع کو آزر پیش کرتے ہیں، کبھی کبھی انسان کے لئے ایک لمحہ بھی بھاری پڑتا ہے اور کبھی ذرا سی غفلت سے انسان بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ شعورِ ذات کی کلید احساسِ لطیف ہے۔ دونوں کی ہم آہنگی سے ہی فکری بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ آزر اس راز سے واقف ہیں۔ زمانے کی ستم ظریفی اور گردشِ ایام پر ان کی گہری نظر ہے۔ جس کے اندر ذرا بھی جھجھک ہے (بلکہ اس جھجھک کو میں تہذیبی رکھ رکھاؤ کہوں گا) وہ زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ فریاد آزر نے اسی بات کو تخلیقیت کے عناصر میں گھلا ملا کر یوں پیش کیا ہے:

چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا　　رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں

وہ بے دریغ کئے جا رہا تھا قتل مرا　　میں منتظر تھا کہ اس پر عذاب اترے گا

فساد بہت ہی سامنے کا موضوع ہے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جس نے فساد کے حوالے سے ایک آدھ شعر نہ کہے ہوں۔ اس کو آزر یوں پیش کرتے ہیں۔

جہاں فساد میں اعضائے جسم کٹ کے گرے　　اسی زمین سے ہم لخت لخت اگنے لگے

فریاد آزر اس دور کے شاعر ہیں لہٰذا اس عہد کے کرب کو انھوں نے سمجھا ہے، محسوس کیا ہے۔ معاملہ چاہے ذاتی ہو، سماجی ہو یا بین الاقوامی، انکی نگاہ ہر اہم موضوع پر ضرور پڑتی ہے۔ چاہے معاملہ سائنسی ترقیات اور خلائی سیارچوں کا ہو جس کے ذریعہ آج نہیں تو کل اسٹار وار ہونا ہی ہونا ہے، یا پھر زمینی، فضائی یا خلائی آلودگی کا ہو یا بین الاقوامی دہشت گردی اور اس کو بہانہ بنا کر پوری دنیا میں ایک مخصوص مذہب کے ماننے والوں کی جگہ جگہ نسل کشی ہو، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اس کو بغور دیکھ رہا ہے اور اس پر آنسو بہا رہا ہے۔ ایسے اشعار کی تعداد بہت ہے بخوفِ طوالت محض چند اشعار پیش ہیں۔

خلاؤں میں بھی شر پھیلا رہا ہے
پرندہ کتنا پر پھیلا رہا ہے

فضائے شہر آلودہ بنا کر
وہ گاؤں پر نظر پھیلا رہا ہے

کون جائے ذوقؔ اب دلّی کی گلیاں چھوڑ کر
صبح کی تازہ ہوا لے آئیں گے دوکان سے

ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں
خوب صورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

فضا کتنی بھی آلودہ ہو آزرؔ
ہمارے ذہنوں سے بہتر ہے اب بھی

اس قبیلے کے لہو میں ذائقہ اتنا لگا
جس کو بھی دیکھا، اسی کے خون کا پیاسا لگا

اس قدر آنکھیں کھلی رکھنے والا انسان ہی صحیح معنوں میں شاعری کا حق ادا کر سکتا ہے ورنہ ذاتی مشغلہ کی بنیاد پر اشعار کہنے والوں کی ایک کثیر تعداد ہر دور میں موجود رہتی ہے مگر وقت انھیں بھلا دیتا ہے۔فریاد آزر ایسے شاعر ہیں جنھیں نہ تو غزل کی تاریخ فراموش کر سکتی ہے نہ ہی وقت کا غبار ان کے افکار کو دھندلا کر سکتا ہے۔ بہر حال غزل گوئی میں فریاد آزر کی ریاضت جاری ہے۔ مجھے امید ہے کہ نئی غزلیہ شاعری کے متون میں ان کی زبردست حصہ داری رہے گی۔

فریاد آزر: تخلیقی اڑان کے نئے زاویے

حقانی القاسمی (نئی دہلی)

تخلیق کی Virgin Territory کی سیاحت، عصر حاضر کے بہت ہی کم فنکاروں کا مقدر بنی ہے، غیر ممسوس منطقے کی سیر کے لئے جس آشفتگی، دیوانگی، جرأت، بے خطری اور عصری آگہی کی ضرورت پڑتی ہے، اس سے بہت سے تخلیق کار محروم ہیں۔ فریاد آزر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ تخلیق کو نیا سیاق وسباق، نیا مفہوم اور نیا تناظر عطا کرنے کی جدو جہد میں اس فکری اور اظہاری منطقہ تک رسائی میں کامیاب ہوئے ہیں جو بہت حد تک کنوارا اور قدرے غیر مستعمل ہے۔ ان کی تخلیق میں وہ مرکزی نقطہ اور محوری نکتہ بھی موجود ہے جو عصر حاضر کی بیشتر تخلیق سے غائب ہو گیا ہے۔

آزر کا تعلق تخلیق کے اس تلازماتی نظام اور تناظر سے ہے جس سے تخلیق میں تازگی، تحیر اور تابندگی آتی ہے۔ انہوں نے 'تخلیقی اجتہاد' سے کام لیا ہے اور تقلیدِ جامد سے گریز کیا ہے اور ایک نئی تخلیقی سمت کی تلاش نے ان کی شاعری کو اس بھیڑ سے بھی بچا لیا ہے جس میں اکثر فن پارے اپنے نام و پتہ کی تلاش میں مدتوں بھٹکتے رہ جاتے ہیں۔ ولی دکنی نے بہت پہلے کہا تھا'' تا قیامت کھلا ہے باب سخن......... فریاد آزر کی شاعری میں باب سخن کے نئے نئے در کھلے جاتے ہیں اور ہمیں تحیرات سے ہم کنار کرتے ہیں۔ خوشی ہوتی ہے کہ صنعتی و مشینی عہد میں آزر کے اندر کا احساس اور اضطراب زندہ ہے اور اس کی لہریں ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہیں۔ فریاد آزر کی شاعری میں جو احساس و اظہار ہے، وہ 'آج' سے عبارت ہے جس میں 'گذشتہ' مکمل طور پر نہ شریک ہے اور نہ ہی مکمل طور پر متروک کہ ان کا حال ماضی سے مستعار نہیں مگر مستنیر ضرور ہے۔ آزر کا تخلیقی احساس منفرد اور مختلف ہے۔ زندگی کے تعلق سے ان کا Dynamic Approach ہے۔ آج کی زندگی کی صورت حال اور انسانی متعلقات کے حوالے سے ان کا زاویہ نظر جداگانہ ہے۔ ان کے یہاں اس انسان کی جستجو ملتی ہے جو 'گلوبل گاؤں' میں اپنی شناخت کھو چکا ہے اور بے چہرگی جس کی پہچان ہے۔ بنیادی انسانی اقدار سے منحرف اور ٹکڑوں میں بٹے ہوئے انسانی وجود کے ذہنی وفکری بحران اور انتشار واختلال کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری کے ذریعہ انسان کی داخلی' خارجی صورتحال سے آگہی

ہوتی ہے۔ Globlised Society اور ملٹی کلچر ایج میں سماجی، سیاسی اقدار میں تبدیلیاں آئی ہیں اور انسانوں کے ذہنی زاویے بھی بدلے ہیں۔ ایسی بدلتی ہوئی صورتحال میں ان کی تخلیق نہ صرف آج کے مسائل پر نگاہ ڈالتی ہے بلکہ آج کے معاشی' اقتصادی' سماجی' تہذیبی نظام سے بھی بے خوف مکالمہ کرتی ہے۔

جدید غزل کے منظرنامے پر فریاد آزر کا نام اس اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ روایتی حصار سے باہر نکل کر عصری حالات' تغیرات اور تموجات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ اور آج کے عہد کی تفہیم بالکل نئے زاویے سے کی ہے اور اس انسانی ضمیر اور روح کی بازیافت بھی کی ہے جو تینوں زمانوں پر محیط ہے۔

فریاد آزر کی تخلیقی اڑان کے زاویے الگ ہیں۔ انہوں نے احساس و اظہار کے جو صنم کدے تعمیر کیئے ہیں' اس میں ان کے خونِ جگر کی نمود ہے۔ وہ اپنی ذات میں گم نہیں ہیں بلکہ گرد و پیش پہ ان کی گہری نظر ہے:

اس کے کہنے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ زندگی آخرت عکس ہے
اب ہمیں سوچنا ہے کہ ہم لوگ دوزخ میں یا کہ جنت میں ہیں

خونِ مشرق کا بہاتے ہی رہیں گے ناحق
اور کر سکتے ہیں کیا مغربی آقاؤں کے لوگ

ورنہ ہم سانس بھی لینے کو ترس جائیں گے
سطحِ 'اوزون' کو فضلات سے آزادی دے

رواج گاؤں میں پردے کا اس قدر نہ تھا
مگر مزاج میں بے پردگی بہت کم تھی

یہ اور بات کہ سب جنگلوں میں رہتے تھے
مگر فضاؤں میں آلودگی بہت کم تھی

یہ ان کے تخلیقی ذہن کی ارتعاشی لہریں ہیں۔ سیاست' سماج اور دیگر مختلف سطحوں پر ان کے ذہنی تحرک کے ثبوت کے لئے یہ اشعار کافی ہیں۔ ان کی نگاہ کسی خاص نقطہ پر محدود نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری ایک طرح سے 'جام جہاں نما' ہے جس میں پوری انسانی کائنات کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ اکثر شعروں میں حیرتوں کی نئی قندیل جلاتے ہیں' ان کی شاعری کی مجموعی قرأت سے پتہ چلتا ہے ان کے یہاں تخلیق کی علمی' عرفانی' وجدانی سطح بہت بلند ہے اور سماجی' سیاسی' سائنسی شعور بالیدہ۔

فکریات کی سطح پر جہاں انہوں نے بہت سے نئے تجربے کیئے ہیں یا پرانے تجربوں کی 'تقلیب' کی ہے' وہیں لفظیات کی سطح پر بھی وہ ایک نئے آب و رنگ میں نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں لسانی جبر کا وجود نہیں ہے۔ ہر وہ لفظ جو ان کے احساس کی ترسیل کردے خواہ اس کا تعلق کسی زبان' مذہب' ملک سے ہو اس کا استعمال سے عذر نہیں کرتے' یہی لسانی اور فکری جمہوریت فریاد آزر کا فکری

شناس نامہ ہے۔ ان کی شاعری میں وہ جمہوری آوازیں ہیں جو جلجا میش، سقراط، سرمد اور منصور کے 'حلق بریدہ' سے بلند ہوتی رہی ہیں۔ انہوں نے سیاسی، سماجی، سفاکیت، آمریت، مطلق العنانیت کے خلاف اپنی شاعری کو بطور ہتھیار استعمال کیا ہے اور عالمی استعماری نظام کے خلاف آواز بھی بلند کی ہے۔ فرقہ واریت، فسطائیت کے خلاف بھی انہوں نے اپنی تخلیقی توانائی کا استعمال کیا ہے:

بھر رہا تھا زہر وہ معصوم ذہنوں میں مگر ہم پہ نفرت گھولنے کا جرم عائد ہو گیا

ہندو کوئی تو کوئی مسلمان بن گیا انسانیت بھی مذہبی خانہ میں بٹ گئی

بچوں پہ ایسا جادو چلا ہے نصاب کا اکبر کا نام لینے لگے غزنوی کے ساتھ

کہیں بھی قتل ہو کیسی عجیب سازش ہے لہو میں ڈوبی ہوئی مری آستین لگے

ان کی تخلیق کا توانائی نظام انتہائی متحرک اور فعال ہے۔ ان کے یہاں بصیرت اور آگہی کی وہ بلند سطح ہے جو ماضی اور مستقبل پر نگاہ رکھتی ہے۔ ان کا آئینہ ادراک روشن ہے جس میں وہ ماضی کے کے ساتھ مستقبل کی آہٹوں کو بھی محسوس کرتے ہیں۔

فریاد آزر کی شاعری میں عصر حاضر کے مسائل کا اظہار ادراک ہے اور یہی عصری حسیت اور آگہی ان کی شاعری کو نقطہ انفرادیت عطا کرتی ہے۔ اس میں ایک آفاقی شعور بھی ہے، ژرف نگاہی اور باطنی روشنی (Inner Light) بھی جو آج کی تخلیق میں کم نظر آتی ہے۔ معاشرہ کی تمام متضاد اور متخالف لہروں کو انہوں نے اپنی شاعری میں سمولیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں ایسے نقوش مرتسم کردئے ہیں جو سماج اور سیاست کی راہوں میں بھٹکنے والوں کو بھی صحیح سمت کا اشارہ دیں گے اور انہیں منزل مراد تک پہنچا دیں گے۔

فریاد آزر کا تہذیبی، سماجی، سیاسی، شعور پختہ ہے اور شعور کی مختلف سطحیں ان کے تخلیقی نظام سے مربوط اور منسلک ہیں۔ اسکائی اسکریپر کلچر کے اس عہد میں چھوٹی چھوٹی زمینی حقیقتوں اور ارضی صداقتوں کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنا اور قاری کے احساس وضمیر کو مرتعش کرنا بہت بڑی بات ہے:

دفن کر دیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہد قدیم رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دورِ جدید

مجھے اب اور سیاروں پہ لے چل میں گلوبل گانوں سے اکتا گیا ہوں

ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں خوبصورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

اس قبیلے کے لہو میں ذائقہ اتنا لگا جس کو بھی دیکھا اسی کے خون کا پیاسا لگا

اب تو ہر شہر ہے اک شہر طلسمی کہ جہاں جو بھی جاتا ہے وہ پتھر میں بدل جاتا ہے

سب حقائق مجھ سے بھی پہلے کہیں موجود تھے میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ مری ایجاد ہے

تخلیق کی سطح پر ایقاظ اور بیداری کا جو فریضہ فریاد آزر انجام دے رہے ہیں، آج کی بے حسی کے دور میں بہت سے فنکار اپنی ذمہ داری کے احساس تک سے محروم ہیں۔ انہیں 'احساس زیاں' ہی نہیں تو پھر معاشرتی ، سماجی' اقدار کے تحفظ کا خیال کہاں سے آئے گا۔ فریاد آزر تخلیق کے منصب سے باخبر ہیں اور اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ۔ اس لئے وہ اپنی تخلیق کے ذریعہ ہر سطح پر ابن آدم کو کائنات کے مسائل اور اس کی پیچیدگیوں سے آگاہ کررہے ہیں۔ ان کی پوری شاعری مقصدیت سے معمور ہے۔ وہ گل وبلبل کی داستاں' یا فسانۂ شب ہائے دراز' پر یقین نہیں رکھتے بلکہ آج کی سفاک جاں گسل حقیقتوں کو اپنی شاعری کا موضوع اور تخلیق کا مرکزی نقطہ قرار دیتے ہیں اور اسی محور پر ان کی شاعری حیات وکائنات کے مختلف مسائل اور موضوعات کا طواف کرتی رہتی ہے۔ طوافِ کوچۂ جاناں' کے بجائے 'غم دوراں' سے ہی آج کی شاعری معتبر اور منفرد قرار پاتی ہے۔

فریاد آزر کی شاعری میں یہی ''غم دوراں' عذاب جاں' آشوب عصر اپنی تمام تر تخلیقی منطق' معروضیت اور فنی' فکری ہنر مندی کے ساتھ موجود ہے۔

فریاد آزر: شگفتہ خیال شاعر

عمران عظیم

بنارس کی سرزمین جہاں صنعت وحرفت اور سیاحت کے سبب عالم گیر شہرت کی حامل ہے، وہاں اس کی ثقافتی، تہذیبی نیز ادبی سرگرمیوں کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے۔ اس سرزمین پر بین الاقوامی اہمیت کی حامل شخصیات نے جنم لیا اور اپنے اپنے کمالات وجوہر کا لوہا بھی منوایا۔ موسیقی اور رقص جیسے فنون لطیفہ کے ضمن میں بسم اللہ خاں، گرجا دیوی، پنڈت کشن مہاراج، ستارہ دیوی اور ایم راجن کا تعلق بھی اسی شہر سے رہا ہے۔ ہندو مذہب کے علم برداروں نے ویدانت، فلسفہ اور بھکتی کا گیان بھی یہیں پر حاصل کیا۔ کبیر داس، پریم چند، غالب، فراق اور قرۃ العین حیدر نے بھی اس سرزمین سے کسی نہ کسی صورت سے تعلق رکھا۔ نامور ڈرامہ نگار آغا حشر بھی بنارس میں آکر بس گئے تھے۔ عہد حاضر میں یہاں کے بہت سے مخلص خدام شعروادب سرگرم عمل ہیں اور اعلیٰ تخلیق ادب میں مصروف ہیں۔

دبستان بنارس کے بالغ اور بیدار مغز شاعر فریاد آزر دہلی میں مقیم ہیں۔ تازہ فکر اور تازہ کار غزل گو ہیں۔ ان کی شاعری کئی دہائیوں پر محیط ہے اور ان کا ادبی سفر نہایت خلوص ولگن کے ساتھ جاری ہے۔ وہ اپنی دھرتی سے جڑے ہوئے شاعر ہیں۔ انہوں نے عہد حاضر میں اقدار کی شکست وریخت، تہذیب واخلاق کے عروج وزوال، زندگی کی افراتفری، نے ہمواریوں اور ناسائند حالات کو دیکھا ہے اس لیے ان کی شاعری میں معاشرتی، تہذیبی وتمدنی موضوعات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ شعری بصیرت کے ساتھ سماجی وسیاسی مسائل ونکات کا بھی بھرپور شعور رکھتے ہیں جس کا اظہار ان کی شعری کائنات میں بکثرت مل جاتا ہے۔

فریاد آزر کی شاعری میں جدت، ندرت، اختراع اور اچھوتا پن نمایاں ہے غزل اس تہذیب کا نام ہے جس کی دلکشی اس کی رمزیت واشاریت میں مضمر ہے۔ یہ عناصر تاریخی تلمیحات کے ساتھ ان کی شاعری کے سرور وتلذذ میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے اس نوع کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

پھر بیعت یزید سے منکر ہوئے حسین | اور ظالموں کی فوج ستم ڈھا رہی ہے پھر

وہ لمحہ سرورِ عالم کو جب ملی معراج — اسی کے صدقۂ جاں سے سنبھل گئیں صدیاں

تشنگی ایسے لبوں کی کیا بجھا پاتا فرات — مدتوں سے خود تھا جن کی دید کا پیاسا فرات

دفن کر دیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہد قدیم — رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دور جدید

گرو کی یاد انگوٹھے سے آنے لگتی ہے — میں جب بھی ہاتھ میں تیر و کمان لیتا ہوں

عہد حاضر مادیت کا دور ہے۔ ہر شخص معاشی نقطہ نگاہ سے سوچتا ہے۔ بے اطمینانی ہر شخص کا مقدر ہے۔ غیر محفوظیت، قنوطیت اور مایوسی کے ماحول میں انسان اپنی زندگی قسطوں میں بسر کرنے پر مجبور ہے۔ ان موضوعات کا اظہار آزر کے اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے:

کیوں نہیں یکبارگی کی موت مرتی زندگی — اے مری جانکاہ قسطوں میں گزرتی زندگی

ہم ایک ساتھ نہیں کرتے گھر کی آرائش — ہم ایسے لوگ بڑھاتے ہیں شان قسطوں میں

پہلے تو سر سے سایہ اٹھا آسمان کا — پھر پاؤں کے تلے سے زمیں بھی کھسک گئی

ضد کرتا نہیں سستے کھلونوں کے لیے بھی — یہ بچہ مرا مجھ سے بھی بوڑھا نظر آیا

چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا — رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں

ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں — خوبصورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

وہ صبح و شام و روز و شب شدید غم کی لذتیں — نہ جانے کیوں وہی عذاب مانگتی ہے زندگی

شکست و ریخت کے نوحوں کے علاوہ ان کی شاعری میں زندگی دردمندی کا احساس بھی ہے۔ فریاد آزر جس زمانی اور مکانی حدود میں رہتے ہیں ان میں درپیش مسائل کو اپنی شاعری میں بڑی مہارت اور سلیقہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کے شاعری اپنے قاری کو انوکھے کیف و سرور سے سرشار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ کسی ایک نہج پر گفتگو نہیں کرتے بلکہ اپنے شعری اظہار سے وہ انسانی زندگی سے وابستہ مختلف موضوعات پر بات کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ موضوعات کا تنوع ان کے نظامِ فکر کی عکاسی کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے جذباتی و ذہنی تجربات کی نقش گری میں مکمل حسیت کے ساتھ صنف غزل کے فنی التزام اور ڈسپلن کو بھی ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا، تاہم وہ محنتی شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی ذہانت اور صلاحیت کی بنیاد پر کئی غیر مانوس اور اجنبی قوافی کا بھی استعمال تجربے کے نام پر کیا ہے۔ میری رائے میں اسے شعری وسعت میں نیک شگون اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ غزل کے مطلع کے ساتھ ہم صوت قوافی والے اشعار درج ذیل ہیں۔

آزما کر عالمِ ابلیس کے حربے جدید — ہو گئے قابض مری صدیوں پہ کچھ لمحے جدید

دفن کر دیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہد قدیم — رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دور جدید

کیوں نہیں لے جاتی اب وحشت بھی صحرا کی طرف　　　بن گیا کیوں شہر از خود آج صحرائے جدید

محل نظر ہے کہ لمحے جدید، حرب جدید کے ساتھ حرف اضافت کے ساتھ دور جدید کو محض صوتی ہم آہنگی کے باعث ہم قافیہ بنایا گیا جو قابل قبول نہیں۔ قوافی کے صوتی نظام میں اس جارحانہ دخل اور غیر ضروری چھیڑ چھاڑ کے عمل سے گریز بہتر تھا۔ خوش بیانی، پرکاری اور معنی آفرینی کلام آزر کی قابل ذکر خصوصیات ہیں۔ عملی طور پر انہوں نے روایت سے قطعی انحراف نہیں کیا ماسوائے مذکورہ بالا غیر صحیح اور ناگوار ضابطہ شکنی کے، جو تجربے کے نام پر ان کے کلام میں گاہے بگاہے در آئی ہے۔ بلکہ انہوں نے جدید فکری نظام کی شجر کاری کی ہے۔

فریاد آزر نہایت شریف الطبع انسان ہیں۔ کاہلی اور سست رفتاری ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ دراصل عملی طور پر وہ جس کام کو کرتے ہیں اسے اطمینان اور سکون سے کرتے ہیں۔ ان کے شعری موضوعات کے تنوع کی رنگارنگی ان کی شعری کائنات۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا　　　رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں

تمام عمر ہمیں منزلیں نہیں ملتیں　　　ہم اہل درد سدا راستے میں رہتے ہیں

اس سادہ دل سے مل کے مجھے بھی یہی لگا　　　اب تک میں جی رہا تھا دکھاوے کی زندگی

ملی تھی جب اسے جنت تو خوش نہ تھا اتنا　　　وہ جتنا خوش ہے مجھے دیکھ کر جہنم میں

وہ شخص آج بھی ماضی سے ایسا الجھا ہے　　　کہ اس کے پاؤں ہیں جنت میں، سر جہنم میں

تجھ سے بچھڑے تو آغوش مادر میں، پھر پاؤں پر، پھر سفر در سفر

دیکھ پھر تجھ سے ملنے کی خواہش میں کب سے لگا تار جنت میں ہیں

صبح ہوتی ہے تو دفتر میں بدل جاتا ہے　　　یہ مکاں رات کو پھر گھر میں بدل جاتا ہے

ننھے بچپن میں بزرگوں سا تھا جس کا رکھ رکھاؤ　　　زندگی کی دوڑ میں وہ آدمی بچہ لگا

اس قدر سبز درختوں کو نہ کاٹو کہ کہیں　　　سانس لینے کو ترس جائے ہوا بے چاری

ہیں پستیاں ہی مقدر، بلند ہوتے ہوئے　　　میں خواب دیکھوں حقیقت پسند ہوتے ہوئے

یہ کیسے جرم کی پاداش ہے یہ زندگی جس سے　　　رہائی مل تو جاتی ہے، سزا پوری نہیں ہوتی

حصہ درد وراثت سے زیادہ ہی ملا　　　مجھ کو شاید مری قسمت سے زیادہ ہی ملا

لوگ دو گز کے مکانوں میں بھی رہتے ہیں جہاں　　　کوئی دروازہ، نہ آنگن، نہ دریچہ کوئی

غموں کی قید بھی کتنی عجیب ہے، جس سے　　　فرار ہوتے ہیں قیدی، بری نہیں ہوتے

درخت یوں ہی اگر سبز سبز کٹتے رہے　　　بدل نہ جائے زمیں پر نصاب موسم کا

بزرگوں کی کبھی خدمت نہ کر پائے تھے آزر
سواپنے آپ کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں

اہل صحرا بھی بڑھے آتے ہیں شہروں کی طرف
سانس لینے کو جہاں صرف دھواں باقی ہے

کسی بھی قصہ کا کردار وہ نہیں تھا مگر
بغیر اس کے ہر اک داستاں ادھوری تھی

ہم سمجھنے لگے مجرم ہے ہمیں میں کوئی
حادثہ ایسا رچایا گیا سوچا سمجھا

ضمیر کہتا ہے ایمان ہے تو سب کچھ ہے
زمانہ کہتا ہے پیسہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

جی ذرق برق کپڑوں سے اس کا اچٹ گیا
آنکھوں میں بس گئی تھی کفن کی جمالیات

راکشس کی جان طوطے میں تھی اور ہم جیسے لوگ
دم بدم اگ آنے والا سر قلم کرتے رہے

مجموعی طور پر یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فریاد آزر کی شاعری روشن امکانات کی حامل ہے۔ وہ زرخیز تخلیقی ذہن رکھتے ہیں۔ ان کے تخلیقی عمل میں ہم عصر زمانہ کی نمائندگی اور ترجمانی ہے۔ وہ عصری مسائل کا عرفان رکھتے ہیں اور انسانی نفسیات و احساسات پر گہری نظر، جو ان کی شاعری کو مقصدیت عطا کرتی ہے۔ فریاد آزر نہایت لگن، توجہ اور دل جمعی کے ساتھ شعری ریاضت میں مصروف ہیں۔

عصری تقاضے اور فریاد آزر کی شاعری

ابراہیم اشک

کسی بھی فن پارے کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے متعلقہ فن کار کی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور اس کے نظریات و جذبات سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ آزر کو جس قدر نزدیک سے خادم جانتا ہے اتنا کوئی بھی نہیں جانتا ہوگا۔ آج بھی اس کے بچپن، لڑکپن اور شباب کی ہنگامہ آرائیاں ان نگاہوں میں قید ہیں۔

ہمیشہ سے ہی وہ اپنے ہمسنوں سے جداگانہ مشاغل فطری طور پر اپناتا رہا ہے۔ بنارس کا مشہور ہندی کا روزنامہ 'آج' پڑھنے کو مل جاتا تھا جس کے سنڈے ایڈیشن میں بچوں کا صفحہ ہوتا تھا جس میں ننھی منی نظمیں پہیلیاں اور لطیفے وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ یہیں سے آزر کو ننھی منی نظمیں کہنے کی تحریک ملی۔ اس کی پہلی نظم ''ورشا کا موسم'' آج کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوئی تھی، جب اس نے چھٹی جماعت میں داخلہ لیا تھا۔ پھر اس کا پورا بچپن تعلیم کے ساتھ ساتھ اخبارات و رسائل میں چھپنے چھپانے اور ریڈیو پر بچوں کے پروگراموں میں حصہ لینے میں گزر گیا۔

اعلیٰ تعلیم کی غرض سے آزر ۱۹۷۲ء میں دہلی آیا۔ دہلی یونیورسٹی سے بی۔ اے کرنے کے بعد جامعہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں داخلہ لے لیا۔ جہاں اسے پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے سرپرست ملے۔ یہیں سے اس کی شاعری کا دوسرا دور لیکن صحیح معنوں میں ابتدائی دور شروع ہوتا ہے۔ جامعہ کے ادبی ماحول اور یہاں کی فضاؤں نے اسے اشعار کہنے پر مجبور کر دیا۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ کچھ ہی مہینوں میں وہ شاعر شب خون، سب رنگ، ادب لطیف اور افکار جیسے برصغیر ہندو پاک کے مقتدر ادبی جریدوں میں کثرت سے شائع ہونے لگا۔

ایم۔ اے کے بعد پروفیسر شمیم حنفی کی نگرانی میں ''اردو اور ہندی کی رومانی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھا مگر بڑی شان بے نیازی کے ساتھ، جس کی سزا وہ آج تک بھگت رہا ہے۔ یعنی اس کے جونیئر احباب آج ریڈر اور پروفیسر ہو گئے ہیں مگر وہ آج بھی اسکول کی بھول بھلیوں سے باہر نہیں نکل سکا ہے۔ اور اب تو اس قدر مایوس ہو چکا ہے کہ اسے ہی اپنا مقدر تسلیم کر

چکا ہے۔

آزر کی شاعری میں عام طور پر امت کے کرب کی جھلک ملتی ہے۔لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس نے کبھی ذاتی کرب یا ذاتی خوشی کا اظہار نہ کیا ہو۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس کی شاعری کا ابتدائی دوراس کی ذاتی اور ذات قلب کا اظہار ہے۔

چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا
رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں

کلام کرتا میں اس سے دعا کے لہجے میں
مگر وہ بول پڑا تھا خدا کے لہجے میں

لوگ خوش فہمی کے پنجوں پر کھڑے تھے فطرتاً
اور یوں قد میرا ان کے درمیان چھوٹا لگا

عجیب طور کی مجھ کو سزا سنائی گئی
بدن کے نیزہ پہ سر رکھ دیا گیا میرا

صبر کرنے کے سوا چارہ نہیں آزر وگرنہ
ان درختوں پر مری خاطر ثمر کوئی نہیں ہے

بچاؤں لاکھ مگر بھیگ بھیگ سا جائے
وہ ایک عکس جو پلکوں کے سائبان میں ہے

وہ لے رہا تھا مرا امتحان قسطوں میں
خبر نہ تھی کہ نکالے گا جان قسطوں میں

ادا ہوا نہ قرض اور وجود ختم ہوگیا
میں زندگی کا دیتے دیتے سود ختم ہوگیا

سب اپنی اپنی منزل مقصود پا گئے
کرب انا لیے میں فقط سوچتا رہا

مجھے پھر اس سے تعلق بحال کرنا پڑا
وہ شخص مجھ سے بچھڑ کر اداس تھا کتنا!

نہ روک پائی مری آستین کی خوشبو
اسے بھی لے گئی بہلا کے بین کی خوشبو

مجھ سے پتھر یہ کہہ کے بچنے لگے
تم نہ سنبھلو گے ٹھوکریں کھا کر

ان جیسے بے شمار اشعار آزر کے ذاتی رنج ومسرت کے غماز ہیں۔مگر رنج ومسرت میں رنج اور کرب غالب ہیں۔ مذکورہ تمام اشعار آزر کے پہلے مجموعۂ کلام ''خزاں میرا موسم'' سے ماخوذ ہیں۔ میں نے شعرا کے بے شمار مجموعوں کا مطالعہ کیا ہے۔اگر سچائی سے کام لیا جائے تو یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہوگی کہ نوے فیصد مجموعے تو صرف اور صرف ردی کی دکانوں کے لائق ہوتے ہیں۔باقی تقریباً دس فیصد مجموعوں میں معیاری اشعار کے نام پر گنتی کے ہی چند اشعار ملتے ہیں۔مگر آزر کا کمال یہ ہے اس کی ابتدائی شاعری میں بھی بے شمار اشعار ایسے ہیں جنھیں اردو کے شعری ادب کے سرمایۂ افتخار میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ بڑے بڑے ناقدین ادب نے آزر کی شاعری کی عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے۔لیکن آزر نے محسوس کیا ہے کہ اردو کے اعلیٰ ترین ناقدین کو پاکستانی اور دیگر غیر ممالک کی اردو شاعری زیادہ متاثر کرتی ہے لہٰذا وہ لوگ انہیں شعرا پر رسائل اور کتب میں مضامین لکھتے ہیں۔میرے نزدیک یہ آزر کی سادہ لوحی ہے۔حقیقت اور ہی کچھ ہے جس کا ذکر یہاں مناسب نہیں ہے۔

آزر نے صرف اپنے ذاتی غموں پر ہی آنسو نہیں بہائے بلکہ سماج میں ہو رہی ناانصافیوں اور قدروں کے زوال پر بھی اس کا دل رو پڑتا ہے۔

ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں — خوبصورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

چہرے بھی کے لگتے تھے مہمانوں سے مگر — خود کے سوا کسی کا کوئی میزباں نہ تھا

اب تو ہر شہر ہے اک شہر طلسمی کہ جہاں — جو بھی جاتا ہے وہ پتھر میں بدل جاتا ہے

سبھی کو زہر اپنے اپنے حصے کا پڑا پینا — نئی تہذیب نے شاید کوئی شنکر نہیں پایا

جب سے میں نے گفتگو میں جھوٹ شامل کر لیا — میری باتوں کا برا پھر مانتا کوئی نہیں

یہاں تاریخ کہلاتی ہے فرسودہ حکایت بھی — اور اس کے سامنے آنکھیں چراتی ہے حقیقت بھی

خلاؤں میں بھی شر پھیلا رہا ہے — پرندہ کتنا پر پھیلا رہا ہے

کوئی بھی فن کار کارخانۂ قدرت کے واردات و حوادث سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس کا مشاہدہ بہت زبردست ہوتا ہے۔ آزر کے کلام میں ایسے موضوعات کی بہتات ہے جو ایسے ادراک و مشاہدات کی زبردست غمازی کرتے ہیں۔ عام طور پر آزر کے ہر شعر میں کوئی نئی بات ہوتی ہے۔ اگر اتفاقاً نئی بات نہیں بھی ہوتی تو بھی نیا زاویۂ نظر اس شعر کو نیا بنا دیتا ہے۔

"آزر ہندو اساطیر کے حوالے سے بھی بات کرتا ہے اور تلمیحات کے حوالے سے بھی، لیکن لاشعوری طور پر۔ اس نے تشبیہ اور استعارہ وغیرہ دیگر شعری لوازمات کا بھی کبھی سہارا نہیں لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ لاشعوری طور پر کہیں کہیں ایسا ہو گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کلاسیکی شاعری کی جکڑ بندیوں سے بھاگتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور قدیم شعری قواعد و ضوابط سے آزاد رہنے میں ہی اپنی بھلائی محسوس کرتا ہے۔ لیکن عموماً عصری شعرا کی اچٹتی ہوئی نگاہ بھی جہاں نہیں پہنچتی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آزر وہاں کا بھی مشاہدہ بڑی باریکی سے کرتا ہے۔ مادی ترقی میں خلا سے استفادہ کر کے سائنس نے زمانہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ آج انسان دیگر سیاروں کی سیر کر کے واپس آچکا ہے اور وہاں مستقل رہائش کی فکر میں ہے۔ اس کے علاوہ کارخانۂ قدرت میں ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کے کیا نتائج برآمد ہو رہے ہیں، عصری غزل میں عموماً ناپید ہیں لیکن آزر کے کلام میں ایسے موضوعات کی بھرمار ہے۔"

(پروفیسر محمد حسن)

خواب کی راہوں میں حائل تھیں ہوا کی سرحدیں — راستے لیکن خلاؤں کے وسیلے ہو گئے

اے زمیں تیری کشش کیوں اس قدر کم ہو گئی ہے — دوسرے سیاروں پر ہم آب و دانہ ڈھونڈتے ہیں

ورنہ ہم سانس بھی لینے کو ترس جائیں گے — سطح اوزان کو فضلات سے آزادی دے

وقت سے پہلے نہ آجائے قیامت آزر — گرین ہاؤس کو بخارات سے آزادی دے

بے ربط ہو چکے ہیں مواسم کے سلسلے — شاید زمین ابلق محور سے ہٹ گئی

اس قدر سبز درختوں کو نہ کاٹو کہ کہیں — سانس لینے کو ترس جائے ہوا بیچاری

ہم چاند پر پہنچ کے بھی کچھ کر نہیں سکے — لپٹے رہے خلا سے تو دنیا بدل گئی

اب چند اشعار ہندو اساطیر کے حوالے سے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

گرو کی یاد انگوٹھے سے آنے لگتی ہے — میں جب بھی ہاتھ میں تیر و کمان لیتا ہوں

سبھی کو زہر اپنے اپنے حصے کا پڑا پینا — نئی تہذیب نے شاید کوئی شنکر نہیں پایا

کبھی تو پاؤں سے چھو کے مجھ کو حیات دے دے — میں تیری راہوں میں سنگ منظر پڑا ہوں کب سے

جس چڑیا کی آنکھ نشانے پر تھی میرے — اس کا سایہ بھی ہے تیر نظر سے باہر

صدیوں کا بن باس لکھے گی اب کے برس بھی — تنہائی اتہاس لکھے گی اب کے برس بھی

کیا سویمبر رچائے دھنک بک گئی — آج سیتا کی خاطر جنک بک گیا

چند چاول کے دانوں نے دکھلایا رنگ — اور دھرتی کے ہاتھوں فلک بک گیا

الزام کیا میں دیتا وبھیشن کی ذات کو — مجھ سے ہی جب لہو کا میرے انحراف تھا

آزر کا سب سے بڑا کرب امت کی زبوں حالی، اس کے ساتھ کی جارہی سازشوں کے تحت اس کا قتل عام اور پھر اسی کو پوری دنیا میں دہشت گرد ثابت کرنے کی بین اقوامی سیاست ہے۔

اس قبیلے کے لہو میں ذائقہ اتنا لگا — جس کو بھی دیکھا اسی کے خون کا پیاسا لگا

آزما کر عالم ابلیس کے حربے جدید — ہو گئے قابض مری صدیوں پہ کچھ لمحے جدید

وہ یہاں ندیاں بہا سکتا ہے لیکن خوں کی — اس کو ہر رنگ میں صحرائے عرب جانتا ہے

اس نے میرا نام شوریدہ سروں میں لکھ دیا — اور خود کو امن کے پیغمبروں میں لکھ دیا

صحرا سے العطش کی صدا آرہی ہے پھر — تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے پھر

ہر آن سازش نو میں پھنسانا چاہتا ہے — میں سر اٹھا ہی نہ پاؤں زمانہ چاہتا ہے

مرے وجود سے اس درجہ خوف ہے اس کو — کہ میرا نام و نشاں ہی مٹانا چاہتا ہے

کربلا ہو کہ فلسطین، کہ ہو بوسنیا درد صدیوں سے مرا نام ونسب جانتا ہے

آزر اپنی ذات اور امت پر ہو رہے جبر وظلم سے اس قدر مایوس ہو جاتا ہے کہ اسے دنیا سے بے زاری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ احساس اس قدر شدید ہوتا ہے کہ وہ رومانی شعرا کی صف میں کھڑا نظر آنے لگتا ہے۔ یا تو وہ دنیا سے ہی دور چلے جانے کی خواہش کرنے لگتا ہے یا پھر ماضی میں کھو جاتا ہے۔ اس ماضی میں، جس میں اس کی ذات آفات سے آزاد تھی اور اس ماضی میں جس میں تقریباً ہر بر اعظم پر امت مسلمہ کا دبدبہ تھا۔

مجھے اب اور سیاروں پہ لے چل میں گلوبل گاؤں سے اکتا گیا ہوں

کچھ تو ہوتا حال سے ماضی میں ہجرت کا سبب یوں ہی بس یادوں کی چادر تانتا کوئی نہیں

کہاں سے دیکھتا میں تیرے خوبرو جہان کو ہزاروں خواہشیں تھیں کوئی زاویہ نہیں ملتا

اب اس جہان میں رہ کر سکوں نہیں ملتا کہاں میں جاؤں گھڑی بھر سکوں نہیں ملتا

تیرا احسان کہ دنیا کو بنایا تو نے اک کرم اور کہ دنیا سے اٹھا لے مجھ کو

آزر تلخ حقائق کی تاب نہ لا کر خیالوں کی دنیا میں ضرور چلا جاتا ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ حقیقت پسند نہیں ہے۔ اس نے محسوس کیا ہے کہ امت مسلمہ کی بربادی کے ذمہ دار پہلے مسلمان خود ہیں، بعد میں کوئی اور ہے۔

سب سنائی دیتا ہے آزر اذانوں کے سوا محو حیرت ہیں کہ ہم بھی ہو گئے کتنے جدید

اور کچھ بتلاتے ہیں اعمال ہم سب کے مگر عظمت رفتہ کا بس ہم کو ترانہ یاد ہے

ہمارا حال، ماضی کا پتہ دیتا نہیں آزر ہماری عظمت رفتہ پہ کس کو اعتبار آئے

یہ بدنصیبی ہماری ہے، کم ہوا ایسا کہ دشمنوں کے بھی حق میں دعا ہوئی ہم سے

آزر کے کلام کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ حالات حاضرہ پر ان کی زبردست نظر ہے۔ وہ ایسے پہلوؤں پر بھی نظر ڈالتے ہیں جہاں اردو کے دوسرے شعرا کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ آج دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کا بھی وقت نہیں ہے کہ ایسی ترقی سے ماحولیات پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ اس ضمن میں فریاد آزر کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

خلاؤں میں بھی شر پھیلا رہا ہے پرندہ کتنا پر پھیلا رہا ہے

فضائے شہر آلودہ بنا کر وہ گاؤں پر نظر پھیلا رہا ہے

ورنہ ہم سانس بھی لینے کو ترس جائیں گے سطح اوزون کو فضلات سے آزادی دے

وقت سے پہلے نہ آ جائے قیامت آزر ''گرین ہاؤس'' کو بخارات سے آزادی دے

فضاؤں تک ہی گر موجود رہتی تو بھی چل جاتا — خلاؤں میں بھی اب آلودگی محسوس ہوتی ہے

فضائے شہر سے آتی ہوئی ہواؤں کو — میں سانس لینے سے پہلے ہی چھان لیتا ہوں

گلاب اگے تھے مرے شہر کے ہر آنگن میں — مگر فضا میں تھی رقصاں مشین کی خوشبو

ذہن میں اس کے کھڑکیاں تھیں بہت — پر فضاؤں میں آندھیاں تھیں بہت

زمیں گھر چکی تھی سرد آگ کی لپیٹ میں — جہاں سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ملا

ایک چنگاری فضاؤں کو خلا کر دے گی — خشک ہونے کو ہے پانی بھی ہوا جھیلوں کا

بدن صبا کا بھی یکسر دھوئیں میں لپٹا ملا — نسیم بھی لیے گرد و غبار گزری ہے

اہل صحرا بھی بڑھے آتے ہیں شہروں کی طرف — سانس لینے کو جہاں صرف دھواں باقی ہے

درخت یوں ہی اگر سبز سبز کٹتے رہے — بدل نہ جائے زمیں پر نصاب موسم کا

ہوا کے شہر میں بس سانس لینے آتے ہیں — وگرنہ اہل زمیں ہیں خلا سے لپٹے ہوئے

خلاف گاؤں کے اک یہ بھی جال شہر کا تھا — لگے بدلنے مواسم، کمال شہر کا تھا

کیسے آلودہ فضاؤں سے بچے باد نسیم — کیسے مسموم نہ ہو جائے صبا بے چاری

اس قدر سبز درختوں کو نہ کاٹو کہ کہیں — سانس لینے کو ترس جائے ہوا بے چاری

آزر کے کلام پر اظہار خیال کرنے کے لیے مزید صفحات اور وقت کی ضرورت ہے مگر بہتر یہی ہے کہ قارئین خود ہی آزر کے کلام کو پڑھ کر کوئی رائے قائم کریں۔

میں تو شاید جھوٹا بھی ہو سکتا ہوں — آپ کلام آزر خود پڑھ کر دیکھیں

ڈاکٹر فریاد آزر: ایک مزاحیہ تعارف

اسد رضا

ریکارڈ کے مطابق ڈاکٹر فریاد آزر کی پیدائش ۱۰؍جولائی ۱۹۵۶ کو بنارس ضلع میں ہوئی۔ اب یہ ضروری نہیں کہ ۱۰؍جولائی کو ہی ان کی پیدائش ہوئی ہو مگر اتنا تو طے ہے کہ ان کی پیدائش ضرور ہوئی ورنہ آج مسلسل ادبی رسالوں میں ان کی اتنی غزلیں شائع نہیں ہوتیں۔ انٹر میڈیٹ کے بعد اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ۱۹۷۲ میں دہلی تشریف لائے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ دہلی کی تینوں سنٹرل یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہت دنوں تک اس خوش فہمی میں شادی نہیں کی کہ لکچرر شپ ملنے کے بعد ہی شادی کریں گے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ فریاد صاحب قول کے پکے نہیں تھے ورنہ آج تک کنوارے ہی بیٹھے ہوتے۔ کیونکہ لکچرر شپ انہیں آج تک نہیں ملی اور اب تو وہ امید کا دامن بھی چھوڑ چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ امید نے ان کا دامن بہت پہلے سے ہی چھوڑ رکھا ہے۔ ہاں، جامعہ میں اگر ذرا عقلمندی سے کام لیتے تو آج فریاد صاحب لکچرر ہی نہیں بلکہ پروفیسر ہو گئے ہوتے مگر موصوف عقل سے کم اور خودداری سے زیادہ کام لینے کے عادی ہیں لہٰذا آج بھی ہر میدان میں اپنے احباب سے پیچھے ہیں ورنہ ایک زمانہ میں موصوف کا ایک مزاحیہ شعر جامعہ میں بہت مقبول ہوا تھا۔

جو میں یونیورسٹی والوں کا رشتہ دار ہو جاتا　　　کم از کم لکچرر شپ کا تو میں حقدار ہو جاتا

مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ مولانا حالی کا یہ شعر ایک عرصہ تک شادی کے سلسلہ میں ان کی رہنمائی کرتا رہا۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　　اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں!

یعنی وہ ایک عرصہ تک گھروں میں گھس کر خوب سے خوب تر حسن کی تلاش میں سرگرداں رہے مگر نتیجہ انہی کے شعر میں ملاحظہ فرمائیں۔

تلاش خوبتر میں خوب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے　　　ہم اپنے بے وفا محبوب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے

بہر حال کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے یعنی موصوف دولہا بنے مگر سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے اور دوبارہ بال اگ آنے کے باوجود آج تک اولے پڑنا جاری ہیں اور اب انہیں سر منڈانے کی کوئی

ضرورت پیش نہیں آتی کیوں کہ اب ان کے سر پر بچا ہی کیا ہے! اس طویل اور مسلسل اولہ باری میں فریاد آزر کو اب تک جم جانا چاہیے تھا۔ مگر جان ہر شخص کو عزیز ہوتی ہے لہٰذا مکمل طور پر جمنے سے پہلے تھوڑا بہت ہاتھ پاؤں ہلا کر خود کو گرم کر لیتے ہیں۔ گرم کرنے سے مراد یہ ہے کہ کسی اور مشغلہ میں سرگرم ہو جاتے ہیں، کبھی کسی ادبی رسالے کی ادارت شروع کر دیتے ہیں، کبھی انٹرنیٹ پر اردو کا ویب سائٹ شروع کر دیتے ہیں، کبھی کسی اخبار میں نئی نسل کے ادیبوں اور شاعروں کا انٹرویو لینا شروع کر دیتے ہیں کبھی شناخت نامی تنظیم کے ذریعہ نئی نسل کے شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تو کبھی فرصت کے لمحات میسر ہونے پر کچھ اشعار بھی کہہ لیتے ہیں۔ اب تک موصوف کے چار شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں مگر نقاد حضرات کی نگاہ ان تک نہیں پہنچی ورنہ اب تک سچ مچ اردو کے اہم شعرا کی فہرست میں ان کے نام کا اضافہ ہو چکا ہوتا۔ اس سلسلہ میں فریاد صاحب خود فرماتے ہیں ؎

ہاں ابھی مجھ کو نہ تسلیم کرے گا وہ بھی ۔۔۔ وقت آئے گا تو تعظیم کرے گا وہ بھی

فریاد صاحب ایک دردمند دل رکھتے ہیں۔ غریبوں اور لاچاروں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ایک بھکاری پر جب انہیں رحم آ گیا تو کیا ہوا آپ خود ان کی زبانی ملاحظہ فرمائیں ؎

میں رحم کھا کے جو سائل سے بات کرنے لگا ۔۔۔ وہ دور ہٹ کے موبائل سے بات کرنے لگا

آج اس عمر میں اتنا سنجیدہ نظر آنے والا شخص نوجوانی میں کس قدر شوخ تھا، یقین نہیں آتا۔ موصوف نے جامعہ میں طالب علمی کے دوران ایک شوخ رسالہ نکالا تھا اور اس سے پہلے کہ خود انہیں ہی جامعہ سے نکال دیا جاتا انہوں نے دوسرا شمارہ نکالا ہی نہیں۔ رسالہ کا نام تھا دل پھینک اور موصوف اس کے مدیر ادنیٰ تھے۔ لیکن اس کے دوسرے شمارہ کی اشاعت نہ ہو پانے کی وجہ موصوف خود فرماتے ہیں ؎

خود اپنا پرچہ نکالا مدیر ہو بیٹھے ۔۔۔ مہینہ بھر میں مکمل فقیر ہو بیٹھے

تخلص شاعر کی پہچان ہے۔ فریاد صاحب تخلص کے معاملے میں بڑے دریا دل رہے ہیں۔ شروع شروع میں شہزادہ فریاد کے نام سے لکھتے رہے، پھر اچانک نئے تخلص کی طرف راغب ہوئے اور یکے بعد دیگرے درجنوں تخلصوں کو اپناتے رہے۔ کبھی فریاد رومی تو کبھی فریاد راوی۔ کبھی صنم بنارسی تو کبھی کچھ۔ اس دور میں اکثر احباب ان سے ان کی نئی غزل کم سنتے، نیا تخلص زیادہ۔ آخر کار فریاد صاحب آزر پر آ کر رک گئے لیکن کچھ بھروسہ نہیں کہ کب کوئی اور تخلص اختیار کر لیں۔

فریاد صاحب کو بچپن سے ہی شعر و شاعری اور ریڈیو پر بچوں کی پروگراموں میں حصہ لینے اور اخبارات و رسائل میں چھپنے چھپانے کا شوق تھا۔ آپ کی پہلی نظم اس وقت بنارس کے مشہور ہندی روزنامہ آج کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوئی تھی جب آپ چھٹی جماعت میں داخل ہوئے ہی

تھے۔ پھر تقریباً ہر سنڈے ایڈیشن میں آپ کی نظمیں اور ٹوٹی پھوٹی کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف اخبارات میں سیاسی مضامین لکھنے لگے۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد جب اعلیٰ تعلیم کی غرض سے دہلی آئے تو دہلی یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد اچانک جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم اے اردو میں داخلہ لینے کی کوشش کی۔ مگر ڈاکٹر عنوان چشتی مرحوم، پروفیسر شمیم حنفی اور دیگر اساتذہ نے فریاد آزر کے داخلے کی مخالفت کی کیوں کہ فریاد آزر کے پاس پہلی جماعت سے لے کر بی اے تک کسی کلاس میں اردو بحیثیت مضمون بھی نہیں تھی۔ ایسے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے فریاد آزر کو یہ کہہ کر شعبہ میں داخلہ دے دیا کہ ایک نوجوان ہندی سے اردو کی طرف مائل ہو رہا ہے ہمیں اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ لیکن سیمیناروں میں فریاد آزر پڑھے گئے مقالات پر جس انداز سے بحث کرتے تھے اس سے مرحوم عنوان چشتی اور شمیم حنفی اور دیگر اساتذہ فریاد آزر کے داخلے سے نہ صرف مطمئن ہو گئے بلکہ عنوان چشتی مرحوم نے فریاد آزر کو اپنی شاعرانہ شاگردی میں بھی لے لیا اور ایم اے کے بعد شمیم حنفی صاحب فریاد آزر کے پی ایچ ڈی کے مقالے کے نگراں مقرر ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ عنوان صاحب کی شاگردی میں فریاد آزر غزل کی طرف مائل ہو گئے اور صحیح معنوں میں ان کی شاعری کا آغاز بھی جامعہ ملیہ سے ہی ۱۹۷۸ء سے ہوا۔ اب فریاد صاحب پی ایچ ڈی کے مقالہ میں کم اور شعر و شاعری میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ پانچ سال تک مسلسل جامعہ اسٹور کے ارشاد ٹی اسٹال پر صبح صبح بیٹھ کر سامعین کا انتظار کرتے اور انہیں چائے پلوا کر غزلیں سناتے۔ سامعین ایک چائے اور غزل کے بعد چلے جاتے مگر فریاد صاحب دوسرے سامعین کے منتظر رہتے۔ اسی طرح سامعین بدلتے رہتے چائے چلتی رہتی اور شام ہو جاتی اور فریاد صاحب اگلے دن پھر آنے کے لیے گھر چلے جاتے۔ طالب علمی کے دور میں اتنا پیسا خرچ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ فریاد آزر کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے ایک ترکیب نکال رکھی تھی کہ سبھی کو آدھی یعنی ایک بٹے دو چائے پلوایا کرتے تھے۔ مگر اس کے لیے انہوں نے ارشاد بھائی اور ان کے ملازمین کو ایک کوڈ ورڈ بتا رکھا تھا۔ یعنی اگر چار لوگ موجود ہوں اور آدھی آدھی چائے پلوانی مقصود ہو تو یہ کہا جائے گا کہ 'ہو جائے' لیکن اگر سب کو پوری پوری چائے پلوانی مقصود ہو تو یہ کہا جائے گا کہ 'چار چائے'۔ اس سے کسی کو پتہ نہیں چل پاتا تھا کیوں کہ چائے تو اتنی ہی ہوتی تھی بس کوالٹی میں تھوڑا فرق ہوتا تھا۔ لیکن یہ راز اس وقت کھل گیا جب ایک دن باذل عباسی صاحب بحیثیت سامع اس چائے خانہ میں تشریف لائے۔ ان کو دیکھتے ہی چائے خانہ کا ملازم فریاد صاحب سے پوچھ بیٹھا کہ 'دو چائے یا ہو جائے؟' پھر بھی کب تک ادھار چلتی! ایک دن ارشاد بھائی نے رقم کا تقاضا کر ہی دیا۔ فریاد صاحب ان کی مذہب پسندی سے واقف تھے۔

انہوں نے ارشاد بھائی سے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ جناب آپ میرے ایک سوال کا جواب دیجیے۔ اور وہ یہ ہے کہ کیا آپ کو روز حساب پر یقین ہے؟ ارشاد بھائی نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا کہ الحمدللہ! فریاد صاحب فوراً بولے کہ پھر میرا اور آپ کا حساب وہیں ہوگا۔

پانچ سال گزر گئے اور پی ایچ ڈی کا کام برائے نام ہو پایا تھا۔ فریاد آزر اور شاہ رخ خان کو ایک ساتھ جامعہ سے نکال دیا گیا۔ شاہ رخ ٹی وی سیریل میں کام کرنے لگا اور آج ہندوستانی فلم انڈسٹری کا بے تاج بادشاہ ہے۔ فریاد صاحب اپنے دل سے جامعہ کی محبت نہیں نکال پائے لہٰذا انہیں ایک سال کی مزید مہلت دے دی گئی اور اسی سال موصوف نے واقعی دن رات محنت کر کے پی ایچ ڈی کا مقالہ پورا کر ہی لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈاکٹر بننے کے بعد لکچرر بننے کی دل سے قطعی کوشش نہیں کی کیونکہ لکچرر شپ کے تمام اوصاف ہونے کے باوجود ایک وصف اپنے اندر پیدا نہیں کر سکے وہ یہ کہ پروفیسروں کے گھروں کے چکر اس دور میں بھی نہیں لگا سکے جب کہ ایسا کرنا نہایت ضروری تھا۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ شعر و شاعری کے جنون کے دوران ہی ایک دوست کے مشورے پر جامعہ سے ہی بی ایڈ کر لیا تھا لہٰذا دال روٹی چل رہی ہے ورنہ شاید دوسروں کی طرح پروفیسروں کے گھروں کے چکر لگا کر لکچرر شپ حاصل کر ہی لیے اور دال روٹی کے بجائے مرغ مسلم کے مزے لوٹ رہے ہوتے۔ یہ الگ بات ہے کہ دال اور مرغ کی قیمت میں آج کوئی فرق نہیں رہا۔

بی ایڈ کے دوران ہی فریاد آزر نے اپنا مشہور زمانہ شعر کہا جسے آج بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں بہت سے شعرا اپنے اپنے نام سے مشاعروں میں سنا دیتے ہیں اور پکڑے جانے پر معافی مانگ لیتے ہیں۔ وہ شعر یہ تھا۔

خوبصورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہوگئے　　　ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں

آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''خزاں میرا موسم'' ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ اسکول میں پڑھاتے ہوئے بچوں کو املہ کے طور پر فی البدیہہ نظمیں لکھواتے تھے جسے اردو اکادمی نے ۱۹۹۸ء میں بچوں کا مشاعرہ کے نام سے خود شائع کیا۔ ۲۰۰۵ء میں تیسرا شعری مجموعہ ''قسطوں میں گزرتی زندگی'' شائع ہوا اور چوتھا شعری مجموعہ ''کچھ دن گلوبل گاؤں میں'' ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا جسے اردو اکادمی نے ایوارڈ سے بھی نوازا۔ ان کی شاعری کے معیار کو دیکھتے ہوئے ان کے پہلے اور دوسرے مجموعوں کو بھی ایوارڈ سے یقیناً نوازا جاتا لیکن جس ادارے کے مالی تعاون سے دونوں کتابیں شائع ہوئی تھیں وہی ادارہ قانوناً ان کتابوں پر ایوارڈ نہیں دے سکتا تھا۔ خیر یہ تو اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ ایوارڈ جیسی چیز خود ہی دوڑ بھاگ کر کے حاصل کر لیتے ہیں مگر آزر صاحب اس انتظار میں ہیں

کہ شاید ایمانداری سے ان کو ان کی شاعری پر ایوارڈ آج نہیں تو کل مل ہی جائے گا۔ یہ میں کیا آپ بھی اسے خوش فہمی محض مانتے ہوں گے۔ خود فریاد صاحب فرماتے ہیں۔

ورنہ مرا مزاج مجھے مار ڈالتا — شامل مرے وجود میں خوش فہمیاں بھی تھیں

ڈاکٹروں کے مطابق کینسر کا کوئی علاج نہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خوش فہمی کا بھی کوئی علاج نہیں ہے۔ خوش فہمی اور امید کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے یہ بات تو ڈاکٹر صاحب بھی جانتے ہیں مگر وہ اتنے بھی سادہ لوح نہیں ہیں۔ ہمیشہ 'امید' سے رہیں۔ انہیں زندگی اور حالات کا زبردست تجربہ ہے ورنہ یہ شعر نہ کہتے۔

ایک جانب یاس کی سرحد سے لپٹا کرب کفر — دوسری جانب امیدوں کا جہاں جلتا ہوا

سنجیدگی فریاد آزر کی گھٹی میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن کوٹنے اور چھاننے کے دوران طنز و مزاح کے عناصر بھی اس میں شامل ہو گئے اور کبھی کبھی یہ طنز و مزاح اردو کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کا بہترین سرمایہ بن جاتا ہے۔ ان کی ایک مزاحیہ غزل (جو کہ احمد فراز کی مشہور غزل کی پیروڈی ہے) کے چند اشعار حاضر ملاحظہ فرمائیں۔

'سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں' — سو ہم بھی آج یہی کام کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے ربط ہے اس کو امیر زاروں سے — سو آج ہم بھی اسے جیب بھر کے دیکھتے ہیں

جن عاشقوں کو بڑھاپہ کی پونچھ اگنے لگی — سنا ہے وہ بھی اسے دم کتر کے دیکھتے ہیں

بس اس لیے کہ اسے پھر نظر نہ لگ جائے — لگا کے بس اسے چشمے نظر کے دیکھتے ہیں

ہے شوق اس کو موبائل سے بات کرنے کا — سو ہم بھی چار چھ مس کال کر کے دیکھتے ہیں

سدھار پائے نہ جن کو پولس کے ڈنڈے بھی — وہی موالی اسے خود سدھر کے دیکھتے ہیں

وہ بالکونی میں آئے تو بھیڑ لگ جائے — رقیب ایسے میں جیبیں کتر کے دیکھتے ہیں

سڑک سے گزرے تو ٹریفک بھی جام ہو جائے — کہ اہل کار بھی اس کو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

کسی بھی موت پہ آجاتا ہے اسے رونا — سو جھوٹ موٹ کا پھر ہم بھی مر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے جب سے لی 'جوڈو' کی تربیت اس نے — رقیب دور سے ہی اس کو ڈر کے دیکھتے ہیں

مکان اس کا ہے سرحد کے اس طرف لیکن — ادھر کے لوگ بھی جلوے ادھر کے دیکھتے ہیں

مشاعروں کے لیے چاہیے غزل اس کو — یہی ہے مانگ تو پھر مانگ بھر کے دیکھتے ہیں

فریاد آزر سے ایک انٹرویو

شمس رمزی

سوال: آپ کے اندر شاعری کا شوق کیسے پیدا ہوا؟

جواب: گھر میں اردو شاعری کی مختلف کتابیں ہندی خط میں موجود تھیں۔ میرے بھائی صاحب نئی نئی کتابیں لاکران میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ میں بچپن میں انہیں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا اور بہت سے اشعار بھی یاد ہو گئے۔ جنہیں میں دوستوں کو سنا تا تھا۔ وہ مجھے شاعر کہنے لگے۔ میں نے بھی ٹوٹے پھوٹے اشعار سے اپنی شاعری کا آغاز کر دیا۔ بعدازاں ساجن پردیسی (مرحوم) نے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ اور پھر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دہلی آیا تو پروفیسر عنوان چشتی (مرحوم) سے اصلاح لینے لگا۔

سوال: آپ نے پہلی غزل کب کہی اور آپ کا پہلا شعری مجموعہ کب منظر عام پر آیا۔

جواب: پہلی غزل غالباً انٹرمیڈیٹ کے دوران کہی لیکن میں اسے پہلی غزل کا درجہ نہیں دیتا۔ صحیح معنوں میں میری غزلیہ شاعری کا آغاز جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایم اے کے دوران یعنی ساتویں دہائی کے اواخر سے ہوتا ہے۔

سوال: تو کیا آپ کی نظمیہ شاعری کا آغاز الگ دور میں ہوا ہے؟

جواب: میں غزل کا ہی شاعر ہوں۔ لیکن بچپن سے ہی بچوں کی شاعری میں دلچسپی رہی ہے۔ لہٰذا میری پہلی نظم اس وقت بنارس کے اہم ترین روزنامہ ''آج'' کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوئی تھی جب میں چھٹی جماعت میں داخل ہی ہوا تھا اور یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ لہٰذا بچوں کے لیے شاعری کا میرا ایک مجموعہ ۱۹۹۸ء میں اردو اکادمی دہلی نے خود شائع کیا اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر آچکا ہے۔

سوال: کیا شاعری کے لیے استاد کا ہونا ضروری ہے؟

جواب: یقیناً ورنہ ایک استاد کے بجائے بے شمار لوگوں سے شاعری کا علم دوستانہ طور پر لینا پڑتا ہے، پھر بھی شاعری میں مہارت حاصل نہیں ہوتی۔ یہاں مجھے علامہ اقبال کا شعر یاد آجاتا ہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے　　　ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

سوال: آپ کس سے متاثر ہیں؟

جواب: معنی آفرینی میں مرزا غالب سے، نزاکت میں میر سے، رومانیت میں اقبال اور اختر شیرانی سے، نت نئے خیالات میں اس عہد کے شاعر محمد علوی سے اور سب سے زیادہ آج کے عالمی حالات سے۔

سوال: آپ کا تعلق شاعری کے کس دبستان سے ہے؟

جواب: میں نے شعوری طور پر روایتی انداز سے پرہیز کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کسی شعری دبستان سے خود کو جوڑنے کی قطعاً کوشش نہیں کی ہے بلکہ میں ناوابستہ شاعری کا قائل ہوں۔

سوال: آپ کی نظر میں نظریہ کے بغیر شاعری ہو سکتی ہے یا نہیں؟

جواب: ضرور ہو سکتی ہے بلکہ اچھی شاعری کسی مخصوص نظریہ کے خول سے باہر نکل کر ہی ہوتی ہے۔

سوال: آپ کس نظریہ کے تحت شاعری کرتے ہیں؟

جواب: میں کسی مخصوص نظریہ کا قائل نہیں ہوں۔

سوال: ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہر ادبی تحریک یا رجحان سے اردو کو کچھ نہ کچھ ملا ہی ہے لیکن بہت کچھ نہیں ملا۔

سوال: شاعری کرنے کا کیا مقصد ہے؟

جواب: شروع شروع میں شوقیہ طور پر شاعری کی طرف راغب ہوتے ہیں بلکہ بیشتر لوگ زندگی بھر شوقیہ طور پر ہی شعر کہتے رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ رسائل و جرائد میں چھپنے چھپانے کو اپنا مقصد بنا لیتے ہیں۔ کچھ لوگ مشاعروں سے مالی منفعت حاصل کو اپنا مقصد بنا لیتے ہیں۔ کچھ لوگ شہرت حاصل کرنا اپنا مقصد بنا لیتے ہیں۔ بہت کم لوگ شاعری کے عظیم مقصد کو اپنا پاتے ہیں۔ میرے نزدیک شاعری کا وہی مقصد ہونا چاہیے جو ہماری زندگی کا مقصد ہے۔

سوال: آپ کا محبوب موضوع کیا ہے؟

جواب: قومی اور بین الاقوامی پیمانے پر ہو رہی ناانصافیوں اور زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھانا۔

سوال: ہم عصر شاعری اور شاعروں کے سلسلہ میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: ہر عہد میں شعرا کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے۔ اس عہد میں جب کہ اردو کو نیست و نابود کرنے کی سازشیں عروج پر ہیں، شعرا نے اردو کے وجود کو قائم رکھنے کا شعوری اور لاشعوری طور پر بڑا کام کیا ہے۔ میں ذاتی طور پر ایسے شعرا کی بہت قدر کرتا ہوں جو واقعی اچھے اور نئے شعر کہتے ہیں۔ یہ

الگ بات ہے کہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس عہد میں اچھی شاعری بھی ہو رہی ہے، نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں مگر نرگس بے نور کی طرح کہ ان پر دیدہ ور کی نگاہ پڑتی تو ہے مگر عموماً وہ اپنی نگاہ دوسری طرف موڑ لیتا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا قاری کا کام ہے کہ قصور نرگس بے نور کا ہے یا ''دیدہ ور'' کی کم نگاہی کا۔

سوال: اردو شاعری کا مستقبل کیا ہے؟ اس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے یا کم ہو رہی ہے؟

جواب: یہ اردو شاعری کی مقبولیت کا ہی ثبوت ہے کہ وہ لوگ بھی اردو شاعری اپنا چکے ہیں جو اردو زبان سے واقف نہیں ہیں۔ اردو زبان کا مستقبل چاہے جیسا ہو اردو شاعری کا مستقبل تابناک ہی ہوگا۔

سوال: نئی نسل میں کوئی نقاد ایسا نہیں جس کا ذکر خصوصیت سے کیا جائے؟ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: یہی شکایت نقادوں کی بھی ہے کہ نئی نسل میں ایسا کوئی شاعر نہیں جس کا ذکر خصوصیت سے کیا جائے، حالانکہ نئی نسل میں اچھے شعرا اور اچھے ناقد دونوں موجود ہیں یہ الگ بات ہے کہ۔

مناظر کم نگاہی کے ہیں شاکی نگاہوں کو گلہ لا منظری کا

الفیض فاؤنڈیشن، جلگاؤں

الفیض فاؤنڈیشن، جلگاؤں کے زیرِ انصرام

☆ الفیض سیمی انگریزی پری پرائمری اسکول، شیواجی نگر، جلگاؤں۔

☆ الفیض اردو ہائی اسکول، شیواجی نگر، جلگاؤں۔

☆ الفیض چیریٹیز، جلگاؤں۔

صدر

عبدالعزیز سالار

زیرِ سرپرستی

عبدالکریم سالار

سیکریٹری

محمد مشتاق اقبال

Abdul Kareem Salar
Shanipet, Jalgaon-425001 (M.S.)
Cell: 09423187515

مہاراشٹرا میں عوامی خدمت گار اور اقرا ایجوکیشن سوسائٹی کے بانی صدر جناب عبدالکریم سالار صاحب سے ایک گفتگو

مکالمہ نگار: **جاوید انور**

جاوید انور: عبدالکریم سالار صاحب، آپ عرصہ دراز سے خدمت خلق میں سرگرم عمل ہیں۔ ملک وقوم میں تعلیم کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے اقرا ایجوکیشن سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ تو آپ کو یہ جذبہ وراثت میں ملا یا پھر آپ کے اپنے ذہن کی اختراع ہے؟

عبدالکریم سالار: دونوں ہی باتیں ہیں۔ میرے والد عبدالمجید سالار صاحب جو خاندیش علاقہ جس میں جلگاؤں اور دھولیہ آتا ہے میں ''خاکسار تحریک'' جو آزادی کے وقت چلی تھی، کے سپہ سالار تھے۔ ان کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے ان کو سالار کے لقب سے نوازا گیا تھا۔ یہ سالار ہم اس سلسلے سے لکھتے ہیں۔ بخاری صاحب بھی ان کے ہم نوا تھے۔ وہ ۳۰ سال تک کانسلر رہے۔ ایک بار صدر بلدیہ بھی رہے۔ آزادی کے بعد یہاں کے مسلمانوں پر تقسیم ہند کے منفی اثرات کے طور پر ایسا دور بھی آیا جب ہر جانب سے ان کو کچلنے اور استحصال کی کاوشیں زور شور سے جاری تھیں۔ تو میرے بڑے بھائی جو کرنل کے عہدے سے سبک دوش ہوئے ہیں، اس زمانے میں کیپٹن عبداللطیف سالار تھے۔ اور اکیلے دم پر مسلم استحصالی نوجوانوں کو لے کر احیا پرست طاقتوں کے مقابلے کو نکل پڑتے تھے۔ جب بھی وہ چھٹیوں میں گھر آتے، ایسا واقعہ پیش آتا۔ اس سے ہوتا یہ تھا کہ یہ برے نظریات والی طاقتیں مسلموں کی عزت آبرو، جان ومال سے کھیلنے میں ڈر محسوس کرتی تھیں اور جب ان کا زور بڑھنا شروع ہوتا، مشیت ایزدی سے میرے بڑے بھائی کی چھٹیوں کے دن آجاتے اور وہ پھر گھر کا رخ کرتے اور یہاں کے مسلم نوجوانوں میں نیا جوش وخروش بھر جاتا۔ تو یہ اور اس طرح کے واقعات کا ایک سلسلہ ہے۔ ایسے ماحول میں میری تربیت ہوئی اور اس کا اثر میری زندگی پر اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ہم نے کبھی خطرات سے گھبرانا نہیں سیکھا۔ بڑے بڑے طوفانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور آج

بھی کر رہے ہیں۔ اس تربیت کا پھل ہے کہ اب موت تک کا خوف نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ماضی میں صرف باہر کی طاقتوں سے نبرد آزمائی تھی، اب بدقسمتی سے اندرونی طاقتوں سے بھی پنجہ آزمائی ہے۔

جاوید انور: آپ نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیوں کر کیا؟ کیا آپ کی تعلیم کا بھی سیاست میں آنے میں اہم کردار رہا؟

عبدالکریم سالار: حقیقت تو یہ ہے کہ میں سیاست کے مرکز میں کبھی رہا ہی نہیں۔ اور نہ ہی کبھی میرا ذہن ایسا رہا۔ یوں سمجھئے کہ سیاست میں اتفاقیہ میرا آنا ہوا۔ میری تعلیم قسطوں میں ہوئی۔ ۱۹۶۵ء میں میں نے حیدرآباد اسلامیہ ہائی اسکول میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کی۔ بڑے بھائی عبداللطیف اس وقت حیدرآباد میں تعینات تھے۔ میں انہیں کے پاس تھا۔ گیارہویں جھانسی بینا سے لوٹ کر S.S.C. بھی پاس کی۔ ۱۹۷۱ء میں .P.U.C اور پہلا سال بی اے اورنگ آباد مولانا آزاد کالج سے کیا۔ ڈگری میرٹھ کالج سے کیا۔ کالج میں مرحوم امیر اللہ خاں، شاہین، پروفیسر ڈاکٹر بشیر بدر، شمیم جے پوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد بھائی صاحب کا تبادلہ سرحد پر ہو گیا تو میں واپس آ گیا اور یہاں پاچورہ ایک جگہ ہے، وہاں اعزازی تعلیم دی۔ ایل۔ ایل۔ بی پہلا سال مکمل ہونے سے پہلے شادی ہو گئی۔ بعد میں کئی کام کیے۔ میڈیکل ریپریزینٹیٹو رہا۔ مختلف عہدوں پر رہا۔ ۱۹۸۲ء اور ۸۴ کے درمیان حالات اچھے ہونے لگے۔ اسی درمیان اینگلو اردو ہائی اسکول میں مسلم ہاسٹل کی بنیاد ڈالی گئی جس میں مجھ سمیت میرے تمام ساتھیوں نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا اور ڈاکٹر امان اللہ شاہ اور انکے احباب کا بھرپور تعاون رہا۔ ۱۹۸۶ء میں اقرا کی بنیاد پڑی۔

جاوید انور: اقرا کی بنیاد ڈالنے کی کیا وجہ رہی؟

عبدالکریم سالار: اقرا ایجوکیشن سوسائٹی کی بنیاد رکھنے کا سبب مسلموں کی پس ماندگی اور تعلیم کے میدان میں ان کی بدحالی ہی رہی۔ ۴۰ بچوں سے شروع ہوا یہ ادارا ۱۷ ار طلبہ سے ہوتے ہوئے (۷۵۰۰) ساڑھے سات ہزار بچوں تک پہنچ گیا۔ ۴ پری پرائمری اسکول، ۲ پرائمری اسکول، ۵ ہائی اسکول، اقامتی ہائی اسکول، ایک انگلش میڈیم جونیئر کالج، .I.T.I، .B.Ed کالج، D.Ed کالج، آرٹ، سائنس ڈگری کالج، یونانی میڈیکل کالج، مولانا آزاد اوپن یونیورسٹی اور .N.C.P.U.L کی شاخیں یہاں قائم ہیں۔ اردو کمپیوٹر وغیرہ تمام سہولیات اقرا ایجوکیشن سوسائٹی میں موجود ہیں۔

جاوید انور: سیاست کے میدان میں آپ براہ راست شریک نہیں رہے یا یوں کہیں کہ مرکز میں نہیں رہے۔ لیکن الیکشن لڑا اور مختلف عہدوں پر بھی رہے۔ تو الیکشن لڑنے اور جیتنے کا جواز کیا رہا؟

عبدالکریم سالار: مرکز میں نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس میں بہت آگے جانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اپنے ہی قرب و جوار کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا۔ میری توجہ کا مرکز خاص طور پر تعلیمی میدان ہی رہا۔ میں ۷ سال تک اسکول بورڈ کا چیئر مین رہا، سابق ڈپٹی میئر ہوں، فی الحال کارپوریٹر بھی ہوں، اور کوشش کرتا ہوں کہ اہل شہر اور شہر کا حق ادا کرسکوں۔ یہاں ۱۰ اردو اسکول اپنی عمارتوں کے معیار کے علاوہ اپنے تعلیمی معیار کے اعتبار سے بھی بہت عمدہ ہے۔ باقی کا معیار بھی بہت عمدہ ہے۔ آج اس شہر میں کل ملا کر ۱۴ اسکول کارپوریشن کی زیر نگرانی میں چل رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے بہت کم شہروں کو یہ اعزاز حاصل ہے۔

جاوید انور: الفیض سوسائٹی قائم کرنے کے کیا اسباب رہے؟۔

عبدالکریم سالار: الفیض سوسائٹی میری نہیں میرے چھوٹے بھائی عبدالعزیز سالار کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ میری انھیں سرپرستی ضرور حاصل ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ہمارا خاندان خدمت خلق میں پیش پیش رہا ہے۔ یہاں گیندہ لال میل، شیواجی نگر ایک ایسا علاقہ ہے جو بہت پس ماندہ ہے مسلموں کے اعتبار سے اور وہاں ایک تعلیمی ادارے کی اشد ضرورت تھی۔ تو اس ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑی کاوشوں سے اس علاقے میں الفیض پری پرائمری اسکول اور اردو ہائی اسکول کا قیام عمل میں لایا گیا اور آج وہاں کے طلبہ و طالبات اس کا بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

جاوید انور: حکومت اقلیتوں کے لیے بہت سے پروگرام چلاتی ہے۔ ان کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سی پالیسیاں ہیں۔ تو پھر اس کا اثر کیوں نظر نہیں آتا؟

عبدالکریم سالار: حکومت اقلیتوں کے لیے کاغذوں پر زیادہ اور عملی طور پر بہت کم پروگرام چلاتی ہے۔ اصل میں آزادی کے بعد تقسیم ہند نے جو یہاں کے مسلمانوں پر ظلم ڈھایا اس سے ابھرتے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ۱۹۹۲ء کا واقعہ پیش آیا جس نے مسلموں پر سماج اور تعلیم دونوں اعتبار سے بہت برا اثر ڈالا۔ تعلیمی تحریک تو بالکل رک سی گئی یا یوں کہیں کہ مسلموں کا یعنی زیادہ تر مسلموں کا اس جانب سے رجحان کم ہو گیا۔ لیکن ۲۰۰۵ء کے بعد اور سچر رپورٹ پیش ہونے کے بعد حکومت ہند کی جانب سے ملک کی اقلیتوں کے لئے کچھ نہ کچھ قدم اٹھائے گئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری بھوک کے سامنے یہ بہت کم ہے۔ بحر حال جو بھی اسکمیں ہیں، ان کی معلومات اقلیتوں کو پوری طرح نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے ہماری خاطر خواہ ترقی نہیں ہو پا رہی ہے۔ کچھ افسر شاہی کا مزاج بھی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ ہم ان اسکیموں کا فائدہ حقداروں تک پہچائیں۔ اور ایک قانونی ٹیم اس کے تعلق سے حکومت سے بات چیت کرے اور سیاسی رہنماؤں کی

مدد سے اس میں مزید اضافہ کیا جائے۔

جاوید انور: اقلیتوں کی اس پس ماندہ حالات کے لیے کچھ اقلیتی طبقہ بھی تو ذمہ دار ہوگا؟

عبدالکریم سالار: بالکل ذمہ دار ہے جاوید صاحب۔ آپ خود بتایئے آج سماج کی کون سی برائی ہے جو مسلموں میں نہیں آرہی ہے۔ مفاد پرستوں، موقع پرستوں کی بھرمار ہے۔ کیا سیاست داں، کیا عالم دین، کیا دوسری فلاحی تنظیمیں، اس میں زیادہ تر اپنے ذاتی مفاد میں سرگرم ہیں۔ مسلکی گروہ بندی اور ان سے ابھرنے والا نفاق اور تفرقہ ہمارے لیے زہر ہلاہل کے برابر ہے۔ سب سے بری مار میرے خیال میں مسلم قوم کے لیے یہی ہے۔ یہ مسلکی نفرت ہمیں برباد کر کے چھوڑے گی اگر ہم اب بھی غور و فکر کرنے سے قاصر رہے۔ تو ان سب کا اثر ہمارے سماج اور معاشرے کے اوپر پڑا۔ جو خوبیاں ہماری اور ہمارے مذہب کی تھیں، جن سے ہمارا وقار اور دبدبہ تھا پوری دنیا میں، وہ سب غیروں نے اپنالیں۔ اور جو دوسری قوموں کی خامیاں تھیں، غلطیاں تھیں اور جن کی وجہ سے بہت سی قومیں تباہ و برباد ہوگئیں وہ تمام خرابیاں ہمارے اندر آچکی ہیں۔ یہ تو اللہ کا اپنے رسول سے وعدہ ہے کہ آپ کی امت اس طرح برباد نہیں کی جائے گی جس طرح پہلے کی امتیں۔ تو اب تک ہم بچے ہوئے ہیں ورنہ قیامت سے پہلے ہی ہمارا فیصلہ کب کا ہو چکا ہوتا۔ تو ان سب سے نجات اور ان پر اپنے اچھے عمل اور مذہبی عقائد کو اپنا کر ان پر قابو پانے اور ان کو ترک کرنے کی کاوشیں بے حد اہم ہیں۔

جاوید انور: مذہب ہماری دنیاوی ترقی میں آپ کے نکتہ نظر سے کس قدر معاون ہوسکتا ہیں۔

عبدالکریم سالار: مذہب تو ہماری دنیاوی اور دینی ترقی کے لیے ہی ساری دنیا اور کائنات کے مالک نے بنایا ہے۔ ایک چھوٹی مثال آپ کو دوں کہ اگر پورا معاشرہ نبی ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے تو جہیز اور دوسری لعنتیں ہمارے قریب بھی نہیں پھٹکیں گی اور دوسری قوم کے لوگ بھی ہمارے سماجی نظام کو دیکھتے ہوئے ہماری ہی روش کو راضی خوشی اپنالیں گا۔ یہ بھی میں سمجھتا ہوں، تبلیغ کا ایک ذریعہ ہوگا۔ تو مذہب کے مضمرات تو بہت وسیع ہیں ذات سے کائنات تک ان ہی عقائد پر سفر طے کیا جاسکتا ہے۔

جاوید انور: لیکن محض تعلیمی میدان میں ترقی کر لینے سے کیا دوسری مشکلات بھی حل ہوجائیں گی؟

عبدالکریم سالار: بالکل حل ہوجائیگی۔ تعلیم خود اپنے لیے روزی کے راستے لے کر آتی ہے۔ یہ سب بہت آسان نہیں ہے لیکن عزم و استقلال سے سارے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ ایک خوش آئند

بات آپ کو بتاؤں کہ ۲۰۱۱-۲۰۱۰ کی رپورٹ کے مطابق پورے ملک میں تناسب کے اعتبار سے مسلم نوجوانوں کا تناسب اور دوسری قوموں کے نوجوانوں کے تناسب کے اعتبار سے زیادہ ہے یہ تو ہماری تقدیر ہے کہ قدرت نے ہمیں موقع دیا ہے۔ نوجوان نسل تو ہر مشکل کا سامنا کر سکتی ہے۔ مشکلات سے لڑ سکتی ہے، اس سے جیت بھی سکتی ہے۔ تو شرط صرف یہ ہے کہ ہم صبر و تحمل سے محنت مشقت کرتے رہیں اور آگے بڑھتے رہیں۔ تعلیم انسان کی زندگی کا زیور ہے۔ موجودہ زمانے میں قوموں کے فیصلے میدان جنگ میں نہیں بلکہ میدان تعلیم میں ہوتے ہیں۔

جاوید انور: ادبی اعتبار سے آپ جلگاؤں کو عالمی ادبی دنیا میں کہاں پاتے ہیں؟

عبدالکریم سالار: یہ جو ہمارا علاقہ ہے یہ پورا خاندیش کا علاقہ کہلاتا ہے۔ مغلوں کے دور سے اس جگہ کی خاصی اہمیت ہے کہ یہ واحد راستہ تھا اس دور میں جو دکن کو برصغیر کے دوسرے علاقوں سے جوڑتا تھا۔ اس دور سے اور انگریزوں کے دور میں اور آزادی کے بعد بھی یہاں کی ادبی فضا ہمیشہ سرسبز و شاداب رہی ہے اور آج بھی اردو زبان اور ادب کی آبیاری کرنے والے بہت سے محبان اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ چند اہل ادب کے نام آپ کے سامنے لیتا ہوں جو یاد آتے ہیں۔ مثلاً کیف بھساولی، ایمان بیاولی، اطہر جلگانوی، قمر بھساولی، مرزا مصطفیٰ بادی، احسان رسول پوری، شوق جلگانوی، عامر جلگانوی، شاہد علی خاں، ناظر انصاری، سلطان نقشبندی، صفدر اعظمی عادل آبادی، سکند رشیری، عثمان جوہری، اکبر شاہین، یعقوب سحر، لحہ حیدرآبادی، صابر زاہد، اثر انصاری، ڈاکٹر رشید صہبائی، رشید قاسمی، قیوم اثر، مشتاق کریمی، ذاکر حسین، رحیم رضا، سلیم خاں، احمد کلیم فیض پوری، اکبر رحمانی، ذاکر عثمانی (ماہر عروض) رفیق عادل، مجاہد جلگانوی، نیّر مصطفیٰ بادی، حامد بھساولی، شکیل حسرت، منظر بیاولی اور بھی بہت سارے اردو کے خدمت گار ہیں۔

جاوید انور: آخری سوال سالار صاحب۔ جیسا کہ آپ نے ابھی بتایا کہ مسلم نوجوانوں کا تناسب دوسری قوموں کے نوجوانوں کے تناسب کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ آپ ان نوجوانوں کو ترقی اور خوشحالی کے لئے کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

عبدالکریم سالار: سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ کسی بھی حال میں زندگی سے جدوجہد کا جذبہ، آگے بڑھنے کا جذبہ ماند نہ پڑنے پائے۔ دین کے ارکان، مذہب کے عقائد کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا جائے اور اسکی روشنی میں دیناوی ترقیوں کے سراغوں کو تلاش کیا جائے۔ اس کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل کی جائے اور دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کی جائے۔ زندگی ہر روز ایک نئی جدوجہد ہے۔ تو مسائل سے بھاگا نہ جائے بلکہ انہیں حل کر کے اور مسائل کا انتظار اور ان کے حل کے

لیے جدو جہد کے جذبے کو بیدار رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہو تو یقین جانیے کہ کامیابی اور خوشحالی اور فلاح و بہبود ہمارا پیچھا کریں گے۔ ہمیں ان کے پیچھے نہیں جانا پڑے گا۔ سچر رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد ہندوستانی مسلمان اپنی تعلیمی، سماجی، معاشی سیاسی حالت کا بخوبی مطالعہ کریں اور اپنے آپ کو قوم و ملک کی تعمیر میں لگا دیں۔ اور اپنے گلی کوچوں گاؤں شہر، محلوں سے اس تحریک کا آغاز کریں۔

جاوید انور: بہت بہت شکریہ۔ آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔

عمر فاروق

عمر فاروق ہمارے عہد کے ان معتبر شعرا میں ہیں جو شعر کہتے تو ہیں لیکن اپنی دیگر اہم مصروفیات کے سبب انہیں اشاعت کے لیے بھیجنے کا وقت بڑی مشکل سے نکال پاتے ہیں۔ اس سے قبل بھی تحریک ادب نے ان کی تخلیقات کو شائع کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ اس مرتبہ ان کی غزلوں کے متفرق اشعار منفرد نکتۂ نظر کے تحت شائع کیے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

میں سارے شہر کو سایہ تو دے نہیں سکتا
مگر کسی کے لیے پھر بھی سائبان ہوں میں

☆

وہ چھین لیتا ہے دریا سے اس کی طغیانی
جو اس زمین کو ملتا نہیں ہے گر پانی

☆

سکوت شور کی آہٹ حصار جاں کے لیے
تلاش کرتے ہیں منظر نئے جہاں کے لیے

☆

وہی ہوا جو محبت کے اختیار میں تھا
جنوں میں کوئی تو صحرا میں، کوئی دار میں تھا

☆

اے مری جان، تقاضے کو تماشا نہ بنا
شہر جاناں میں ہر اک سمت محبت تو نہیں

☆

ہر ایک حلقۂ زنجیر میں صدا تو نہیں
اٹھو کہ دار و رسن بھی کہیں خفا تو نہیں

☆

فہم و ادراک سے آگے کا سفر کرنا ہے
دشت کو خاک اور اس خاک کو گھر کرنا ہے

☆

محبت میں عجب تیرے ستم ہیں
جو احقر تھے، وہی اب محترم ہیں

☆

جگا کے خاک مری کون اب سلاتا ہے
یہ کیسی نیند ہے جس میں کوئی جگاتا ہے

☆

شمار کتنو کا کرتے، سبھی شمار میں ہیں
جناب میر یہاں آپ بھی قطار میں ہیں

☆

ہٹا کے خاک ذرا دیکھ تو قرینے سے
ہزار مسند شاہی یہاں غبار میں ہیں

☆

در و دیوار سے آتی ہے خوشبو یار کی اب تک
ترے ہونے سے ہے سب آبرو بازار کی اب تک

☆

پہلے کی طرح گرمی گفتار نہیں ہے
بازار تو ہے، کوئی خریدار نہیں ہے

☆

7, Tagore Road, Cantonment, Kanpur-10
Cell: 09839078616
e-mail: info@omarfarooq.co.in

نقشبند قمر نقوی بھوپالی
امریکہ

غزل

الفاظ، نہ مضمون، نہ گفتار، انا لعشق
خاموشی و تقدیس کا معیار۔ انا لعشق
کونین کی اس کار گہہ فکر و نظر میں
موجود ہے جو دیدۂ بیدار، انا لعشق
تنہا تو نہیں حسن کا مفہوم کوئی بھی
ہے جس کے سبب گرمیِ بازار انا لعشق
تاویل 'اناالحق' کی ہر اک سے نہیں ممکن
تھا مدعیِ شوق کو اصرار انا لعشق
کیا حسن کی تفسیر بتائے گا کوئی اور
ہے ایک یہی کاشف اسرار انا لعشق
ملتی ہے جہاں عقل و قیاسات کی سرحد
اس مملکت علم کا سردار انا لعشق
دونوں کے مفاہیم میں نسبت ہے قریبی
دراصل 'اناالحسن' کا اظہار، انا لعشق
ہے عشق قمر نقوی نماز اور دعا بھی
درکار ہے تسبیح نہ زنار، انا لعشق

غزل

تمثیل، نہ تشبیہ، نہ اخبار، انا لحسن
آفاق میں صرف ایک ہی شہکار، انالحسن
رنگینیِ احساس کی تفسیر جو لکھے
عنواں ہو رقم، مطلع انوار، انا لحسن
رقاصۂ جذبات سر بزم تمنا
خود وجد میں ہے صورت دلدار انا لحسن
کہتے ہیں سبھی اپنے طریقے سے فسانہ
دیتا ہے صدا مرکزی کردار انا لحسن
اب روشنی خوشبو سے ہم آغوش ہوئی ہے
پہنچا کوئی تا منزل دیدار انا لحسن
کیا نکہت و رعنائی و رنگینی و نزہت
ہر دلکشی و وصف کا حقدار انا لحسن
وہ جلوہ جو خود آئینہ خود آئینہ گر ہے
ہرسمت سے ہے دل میں روئے یار انالحسن
سنتے ہیں قمر نقوی نے یہ دعویٰ کیا ہے
ہے مملکت شوق میں سردار، انا لحسن

6446, S. Indian Polis Place, Tulsa
OK-74136 (U.S.A.) Tel: 001-918-481-1580

رفیق راز
سرینگر

غزلیں

دعا قبول ہوئی بادشہ سلامت کی
عدو کی فوج کے سالار نے بغاوت کی

مرے بدن میں رواں دجلہ وفرات بھی تھے
مگر لبوں پہ مرے پیاس تھی قیامت کی

تمام نخل ثمر دار اکھڑ گئے جڑ سے
یہاں سے موسم راحت فزا نے ہجرت کی

ہمارے شعر میں آباد ہے جہان طلسم
ہماری طرز میں اک شان ہے روایت کی

میں کتنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ سکتا ہوں
طویل ہوتی ہے کتنی یہ رات فرقت کی

ہماری روح میں نشہ ہے تیرے جلووں کا
ہماری آنکھوں میں ہے روشنی بھی حیرت کی

☆

ڈر ہے کہ لگ نہ جائے مرے ہی مکاں میں آگ
بھڑکی ہوئی ہے آج تو خوب آسماں میں آگ

ظاہر ارادہ اونچی اڑانوں کا کر دیا
طائر نے خود لگائی خس آشیاں میں آگ

ہر سمت بارشوں میں کھلے سرخ رو گلاب
برسات ہے لگی ہے ترے گلستاں میں آگ

جھرنے خموشیوں کے تھے دونوں طرف رواں
اور رقص کر رہی تھی کہیں درمیاں میں آگ

ورد زباں درود براہیم ہے تو پھر
ٹھنڈی رہے گی میرے لیے ہر زماں میں آگ

غزلیں

خالی ہاتھ ہیں بات مگر کچھ اور ہی ہے آواروں کی
دو دو آنکھوں سے یہ رونق لوٹتے ہیں بازاروں کی

اپنی سنا کیا رینگتا ہے تو اب بھی اسی کے کوچے میں
میری چھوڑ میں خاک اڑاتا پھرتا ہوں سیاروں کی

اک مدت کے بعد ہلی ہے شہر کی یہ بدمست زمین
ایک ہی جھٹکے میں اکتاہٹ دور ہوئی دیواروں کی

گرم لہو کی بارش بھی اس سرد زمیں پر خوب ہوئی
دھوپ بھی پر کچھ کم تو نہیں تھی لہراتی تلواروں کی

جب تک فکر کے گلشن میں حیرت کے پھول کھلیں گے نہیں
کوکھ رہے گی تب تک خالی یاروں کے فن پاروں کی

☆

سائے چپکے ہوئے ہیں، اونگھتی دیواروں سے
خوف آتا ہے مجھے راہ کے نظاروں سے

اب بھی طاری ہے کہستاں پہ فقیروں کا سکوت
اب بھی آتی ہے خموشی کی صدا غاروں سے

میں تو اک سلطنت خاک کا شہزادہ ہوں
کام کیا مجھ سے تہی دست کو بازاروں سے

اب نہ ہوتا ہے اندھیرا ہی تری زلفوں سے
اور نہ ہوتی ہے کوئی روشنی رخساروں سے

خواب کی فصل ہی آنکھوں میں اگا دے کوئی
کاٹے کٹتی ہی نہیں شب ترے بیماروں سے

حیرت آباد جہاں کے یہ اجالے ہیں رفیق
رونق آنکھوں میں نہیں شہر کے مہہ پاروں سے

I.G. Road, Baghat Barzala, Srinagar-05
(J&K) Cell: 09622661666

کرشن کمار طور
دھرم شالہ

غزل

طلسم خواب سے حسن گماں نکل گیا ہے
زمیں گرفت میں ہے آسماں نکل گیا ہے
میں اپنے دل کی بلاخیزی سے ہوں خود حیراں
نکلنا چاہیے اس کو، جہاں نکل گیا ہے
یہاں تو کوئی بھی اب سر جھکا کے چلتا نہیں
دلوں سے خوف صف قاتلاں نکل گیا ہے
چھپا رہا ہوں جسے ہو رہا ہے وہ ظاہر
غبار عشق مرے درمیاں نکل گیا ہے
وہ باب حسن کرے وا کہ بند رکھے کواڑ
اب اس گلی سے دل خونچکاں نکل گیا ہے
یہاں تو کچھ بھی نہیں گرد کارواں کے سوا
کوئی کہاں تو کوئی اب کہاں نکل گیا ہے
یہ کیا گرفت ہے یہ کیسی دسترس ہے طور
چمک پہ کچھ بھی نہیں خاکدان نکل گیا ہے

134/E, Khaniyara Road, Dharamshala-15
(H.P.) Cell: 09816020854

مینا نقوی
مراد آباد

غزل

دن ڈھلے لمس سے یادوں کی پگھلتا ہے چراغ
شام سے درد کے احساس سے جلتا ہے چراغ
جانے کس بات پہ ہو جاتا ہے وہ لو سے خفا
جانے کیوں وقت سحر رنگ بدلتا ہے چراغ
در حقیقت یہ محبت کا ہے روشن پہلو
روشنی کے لیے ہر عکس میں ڈھلتا ہے چراغ
نیند تیری نہ اچٹ جائے فقط اس ڈر سے
آسماں پر بھی دبے قدموں سے چلتا ہے چراغ
نور پیکر تھا کوئی جس سے بچھڑ جانے پہ
ایسا لگتا ہے کہ ہاتھوں سے پھسلتا ہے چراغ
روشنی رہتی ہے آغوش میں لیکن مینا
جانے کس کے لیے ہر رات مچلتا ہے چراغ

Meena Nursing Home, Aghwanpur,
Moradabad-02 Cell: 09458836705

پی. پی. شریواستو رند

غزل

نشاط درد کے موسم میں گر نمی کم ہے
فضا کے برگ شفق پر بھی تازگی کم ہے

سراب بن کے خلاؤں میں گم نظارۂ سمت
مجھے لگا کہ خلاؤں میں روشنی کم ہے

عجیب لوگ ہیں کانٹوں پہ پھول رکھتے ہیں
یہ جانتے ہوئے ان میں مقدری کم ہے

نہ کوئی خواب، نہ یادوں کا بیکراں سا ہجوم
اداس رات کے خیموں میں دلکشی کم ہے

میں اپنے آپ میں بکھرا ہوا ہوں مدت سے
اگر میں خود کو سمیٹوں تو زندگی کم ہے

کھلی چھتوں پہ دوپٹے ہوا میں اڑتے نہیں
تمہارے شہر میں کیا آسمان بھی کم ہے

پرانی سوچ کو سمجھیں تو کوئی بات بنے
جدید فکر میں احساس نغمگی کم ہے

کہاں سے لاؤ گے اے رند معتبر مضمون
غزل میں جبکہ روایت کی چاشنی کم ہے

غزل

چند دھبے رینگتے دیوار پر، در پر چلے
وہم کے مانوس سائے تھے، گمانوں بھر چلے

اک شفق پھیلی ہوئی ہے جسم و جاں سے روح تک
لمس کے جگنو فضا میں شعلگی بھر کر چلے

جب سرابوں سے مسلسل جنگ کا اعلان تھا
کیوں مرے سائے مرے پیچھے لہو میں تر چلے

اک عجب غائب سا منظر تھا دھوئیں کی صف کے پار
پشت پر لادے ہوئے دن کے خرابے گھر چلے

ہم نے دیکھا ہے سمندر کا سلگتا احتجاج
بادبانوں میں جو ہم طغیانیاں بھر کر چلے

تہہ بہ تہہ جمتی چلی جاتی ہے سناٹوں کی گرد
کچھ گھڑی تو گھر میں سناٹوں کا شور و شر چلے

دفعتاً جب گم ہوا احساس لاسمتی تو پھر
ہم سنہری خاک کے پیچھے تجسس بھر چلے

مخملی سے راستے ہم کو میسر تھے کہاں
ہم تو پوری زندگی اے رند کانٹوں پر چلے

R-16, Sector 11, Noida-201301 (U.P.)
Cell: 09711422058

بی.ایس.جین جوہر

غزلیں

بھوک اور نیند کی گولی نگلتے ہیں کچھ لوگ
تلاش رزق میں دن بھر بھٹکتے ہیں کچھ لوگ
سروں پہ ان کے نہ سایہ، نہ سائبان کوئی
سڑک پہ پیڑ کی چھاؤں کو تکتے ہیں کچھ لوگ
خدا نے سب کو قناعت کا ہے دیا تحفہ
مگر امیروں کے در پر بھٹکتے ہیں کچھ لوگ
وطن کی راہ میں دن رات رہتے ہیں مصروف
نہ ان کو مرنے کی فرصت نہ تھکتے ہیں کچھ لوگ
چراغ سب کے ہیں لیکن ہوا کسی کی نہیں
بجھے چراغ تو پھر کیوں سسکتے ہیں کچھ لوگ

☆

پردیس میں مرنے والے کو کب کس نے رویا، گایا ہے
کس نے اسے سمان دیا ہے، کس نے سوگ منایا ہے
گھر پر اس کی شوک سبھا میں کس سے کیا امید کریں
وہ بھی مرنے جینے میں کیا کام کسی کے آیا ہے
کوئی بھی نہیں کہرام مچا اک مرگ ناگہاں پر اس کی
پتنی کے ہی آنسو ڈھلکے ہیں بیٹے نے داغ لگایا ہے
ہلچل نہ ہوئی ذرہ بھر بھی اس کاروبار کی دنیا میں
جانے والے نے نام نہیں بس دھن دولت ہی کمایا ہے
یہ ٹھاٹ باٹ کوٹھی بنگلے سب یہیں چھوڑ کر جاتا ہے
دنیا سے کوئی کیا لے جائے، دنیا میں کوئی کیا لایا ہے
تخلیق میں زندہ رہتا ہے، فنکار کبھی مرتا ہی نہیں
شہکار تو اس کا دنیا نے صدیوں صدیوں تک گایا ہے

اگر سب فیصلے باہم نہ ہوں گے
دلوں کے فاصلے بھی کم نہ ہوں گے
یہ دنیا بس یونہی چلتی رہے گی
مگر افسوس یہ ہے ہم نہ ہوں گے
گنے جائیں گے جب کچھ کرنے والے
کسی فہرست میں بھی ہم نہ ہوں گے
ہزاروں خواہشیں پوری ہوں لیکن
مرے ارمان پھر بھی کم نہ ہوں گے
بہت دشوار ہو جائے گا جینا
خوشی کے ساتھ گر کچھ غم نہ ہوں گے
بکھر جائے گا شیرازہ وطن کا
جو پابند وفا باہم نہ ہوں گے
وطن کی راہ میں دشمن کے آگے
کٹا دیں گے، مگر سرخم نہ ہوں گے

☆

میں تو کہتا ہوں سب امیروں سے
ملتے جلتے رہو فقیروں سے
آدمی کے وقار کی عظمت
ہے جواہر سے اور نہ ہیروں سے
زندگی میں ہمارے حوصلوں کی
جنگ ہے ہاتھ کی لکیروں سے
اور سننے کی اب کہاں ہے تاب
دل ہے چھلنی زباں کے تیروں سے
سنتے ہیں ہم تو دل پہ رکھ کر ہاتھ
داستان قفس اسیروں سے
خود ہی ہم ہوگئے ہیں خانہ بدوش
بات کرتے ہیں راہ گیروں سے
چین سے جینے ہی نہیں دیتے
سب پریشان ہیں ضمیروں سے

سحر تاب رومانی
(دبئی)

غزلیں

در و دیوار پیہم رو رہے ہیں
مرے گھر میں اداسی بو رہے ہیں
قیامت در پہ دستک دے رہی ہے
مگر ہم لوگ ابھی تک سو رہے ہیں
سروں پر گٹھریاں ہیں رنج و غم کی
یہی اک بوجھ ہے جو ڈھو رہے ہیں
طلب کی آخری حد سے گزر کر
جسے پایا تھا اس کو کھو رہے ہیں
پرندے آنے والی آفتوں پر
پروں میں منہ چھپا کر رو رہے ہیں
سحر جو داغ ہیں دامان دل پر
انہیں ہم آنسوؤں سے دھو رہے ہیں

☆

سانحہ ہوگا نیا، معلوم تھا
لوح فردا کا لکھا معلوم تھا
وہ بھی راہوں میں کہیں گم ہوگئے
جن کو سارا راستہ معلوم تھا
اس لیے کرتے رہے اس سے وفا
اس کا انداز جفا معلوم تھا
زندگی کی رمز بھی کیا رمز ہے
مجھ کو سب اپنے سوا معلوم تھا
ہر چراغ زندگی کو پھونک کر
نوحہ گر ہوگی ہوا معلوم تھا

غزلیں

میں اپنے مسئلوں میں ہی الجھا رہا سدا
میرا وجود راہ میں بکھرا رہا سدا
جلتی ہوئی ہوائیں بھی زخمی نہ کرسکیں
طائر فلک نورد تھا اڑتا رہا سدا
بستی مرے خیال کی آباد ہی رہی
میری نگاہ میں ترا جلوہ رہا سدا
مجھ کو غموں کی آگ نے جھلسا دیا مگر
میں زخم زخم ہو کے بھی ہنستا رہا سدا
میری کتاب دل پہ سحر اس نے ایک بار
جو حرف عشق لکھ دیا لکھا رہا سدا

☆

میں نے کہا کہ دوست ہوں اپنا میں یا عدو
اس نے کہا کہ آئینہ رکھا ہے رو برو
میں نے کہا کہ سانس بھی لینا محال ہے
اس نے کہا کہ بکھری ہے گلیوں میں آبرو
میں نے کہا کہ ہجر تیں میرا نصیب کیوں
اس نے کہا کہ پھرتے ہیں دیوانے کو بکو
میں نے کہا کہ حسن ہے یہ ساری دلکشی
اس نے کہا کہ عشق کا جلوہ ہے چار سو
میں نے کہا کہ بکتا ہے کوڑی کے مول فن
اس نے کہا کہ ہونا ہے تجھ کو تو سرخ رو
میں نے کہا کہ کس سے ہوں محو کلام میں
اس نے کہا مکالمہ کرتا ہے مجھ سے تو

C/o Dr. Zubair Farooq Alarshi
Cell: 00971-50-7246969

شفق سوپوری

غزلیں

مکانوں میں ابھی ہیں کچھ مکیں روشن
یہاں کی بستیاں یونہی نہیں روشن

مسافر سوچ کر شب کے نکلتے ہیں
ستارہ درد کا ہوگا یہیں روشن

اسی سے نور ہو کے نار ہوتا ہوں
ہے جو اک شعلہ تر میرے قریں روشن

عجب ہے شعبدہ میرے بھی قاتل کا
سیہ ہیں ہاتھ لیکن آستیں روشن

اٹھایا ساتواں پردہ تو کیا دیکھا
گماں کی ظلمتوں میں تھا یقیں روشن

☆

جنوں کا جوش تھا یا خود سری لہو کی تھی
طلب کا موسم تھا بے گھری لہو کی تھی

میں جس میں اڑتا تھا وہ فضا تھی آتش کی
میں جس پہ بیٹھا تھا وہ دری لہو کی تھی

تجھے تو خود ہی اجالے میں آ کے دیکھنا تھا
کہاں لباس پہ میرے تری لہو کی تھی

اسی پہ طائرِ غم آشیاں بنانے لگا
کہ ایک شاخ سی دل میں ہری لہو کی تھی

مجھے کسی کی نہ آئی شکست و ریخت نظر
میں جس میں گم تھا وہ بے منظری لہو کی تھی

غزلیں

آنکھوں سے معنیٔ سخن میر دیکھتے
ہم بھی کبھی بہار میں زنجیر دیکھتے

کرتے نگاہ اپنے بھی دامن کے داغ پر
اپنا گناہ دیکھتے، تقصیر دیکھتے

اتنا ہمارے تن کا لہو خشک بھی نہ تھا
ہم زخم دل کو غنچۂ تصویر دیکھتے

تیری گلی میں خاک ہوئے ہم پھر اس کے بعد
کیا فائدہ تھا خاک کی تاثیر دیکھتے

اچھا ہوا جو ٹوٹ گیا آ کے ہاتھ میں
ہم آئینے میں بخت کے تدبیر دیکھتے

وہ غم تو تھا عزیز پر اس کی کہاں تلک
تخریب دیکھتے کبھی تعمیر دیکھتے

☆

جی ہاں کچھ سے کچھ ہو رہا ہے
جہاں کچھ سے کچھ ہو رہا ہے

نہاں خانۂ زندگی میں
عیاں کچھ سے کچھ ہو رہا ہے

زمیں پر وہی آگ، لیکن
دھواں کچھ سے کچھ ہو رہا ہے

وہاں کی خبر تو نہیں کچھ
یہاں کچھ سے کچھ ہو رہا ہے

ہمیں وہم ہے ہم سے ہی اب
جہاں کچھ سے کچھ ہو رہا ہے

Dept. of Urdu, Govt. Degree College,
Bemina, Srinagar. Cell: 09419001693

مقصود نشتری
(اندور)

غزل

کیا بتاؤں کہ میں کب، کون سے پل جاؤں گا
دور اس عالم فانی سے نکل جاؤں گا
زندگی سانس کی گرمی سے ہے قائم لوگو
میں بھی سورج کی طرح شام کو ڈھل جاؤں گا
میری قسمت کو سمجھ لو اے پرکھنے والو!!
میں وہ سکہ ہوں جو ہر دور میں چل جاؤں گا
آندھیاں بھی جو چلیں گی تو بچا کر دامن
میں دیا بن کے زمانے میں جو جل جاؤں گا
سنگدل ہوتے ہوئے بھی میں برائے الفت
موم کی طرح سر بزم پگھل جاؤں گا
منعقد ہوگی کہیں بھی جو سخن کی محفل
ہو کے مقصود میں باذوق و عمل جاؤں گا

غزل

کیسے کہہ دوں کہ کسی غیر نے مجھ پر پھینکے
مری جانب تو مرے اپنوں نے پتھر پھینکے
خار بھی میرے لیے پھول سے برتر ہوگا!!
اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر جو قلندر پھینکے
اس نے مئے بار نگاہوں سے عطا کی مجھ کو
میں نے اس دن سے سبھی شیشہ و ساغر پھینکے
یہ ہے تعظیم مری یا ہے مقدر میرا!!
میں جو ڈوبوں تو مجھے موج سمندر پھینکے
جسم سے جان نکل جائے تو تیرا کنبہ!!!
تیری تکفین کرے خاک بھی تجھ پر پھینکے
قطرہ قطرہ سے وہ محروم بھی کر سکتا ہے
وہ اگر چاہے تو بادل سے سمندر پھینکے
ان ہی الفاظ سے غزلوں کو سنواروں اپنی
چست فقرہ جو سر بزم سخنور پھینکے
وہ کبھی سر نہ اٹھا پائے گا بیشک لوگوں
اپنے ہاتھوں سے جسے اس کا مقدر پھینکے
شیشۂ دل تو ہے مقصود بہت ہی نازک
تیر نظروں کے جو پھینکے تو سمجھ کر پھینکے

16, Daulatganj, Street No. 7, Indore-07
(M.P.) Cell: 09755029978

مشتاق صدف

غزلیں

آج میرے حق میں کوئی فیصلہ ہو جائے گا
جب نہیں ہوتا مرا وہ جانے کیا ہو جائے گا

میرے دل کی دھڑکنوں میں ہے اضافہ اس قدر
وہ نہیں آیا تو اب کے حادثہ ہو جائے گا

وہ نہ آئیں گھر ہمارے خط مگر لکھا کریں
آنے جانے کا بھی اک دن سلسلہ ہو جائے گا

لوگ اپنے دل میں پالیں گے اگر یوں نفرتیں
ملک سے امن و اماں کا خاتمہ ہو جائے گا

ایک مدت ہوگئی اس کو صدف بچھڑے ہوئے
دفعتاً وہ مل گیا تو معجزہ ہو جائے گا

☆

لبوں پہ پیار، دلوں میں غبار رکھتے ہیں
ستم شعار یہی روزگار رکھتے ہیں

انہی کو سونپ دی خوش رنگ زندگی اپنی
وہ ہیں غنیم، مگر اعتبار رکھتے ہیں

نہیں ہے دخل مرا ان کی چاہ میں لیکن
کبھی کبھی ہی سہی، اختیار رکھتے ہیں

درخت سوکھ گئے نفرتوں کے باہر سے
ابھی جڑوں میں مگر برگ و بار رکھتے ہیں

وہ روشنی کی بھلا بھیک ہم کو کیا دیں گے
جو خود چراغ صدف مستعار رکھتے ہیں

غزلیں

پوچھئے مت دل کا کیسا حال ہے
آپ کا البتہ استقبال ہے

رونقیں ہی رونقیں چاروں طرف
دیکھئے کتنا یہ اچھا سال ہے

آئی ہے کچھ اس طرح سے فصل گل
باغباں کی بدلی بدلی چال ہے

بے رخی ان کی سمجھ آتی نہیں
بے سبب یہ دشمنوں کی چال ہے

کچھ دنوں سے بے سبب ہی اے صدف
خواب کی تعبیر پامال ہے

☆

یہ جو لمبی رات ہے یارو
کچھ ہی دن کی بات ہے یارو

خاموشی کا شور سے رشتہ
یہ بھی عجب سی بات ہے یارو

داغ دلوں کے دھل جائیں گے
آنکھوں میں برسات ہے یارو

پاس نہ مایوسی آ جائے
انساں کی یہ مات ہے یارو

شکوہ نہیں مشتاق صدف کو
کم سے کم وہ ساتھ ہے یارو

381/22-E, Zakir Nagar, Jamia Nagar, New
Delhi-110025 Cell: 09891471765

منصور اعظمی
(قطر)

غزل

ظاہر میں کر رہے ہیں وہ ہمدردیاں نہ پوچھ
لیکن ہیں دل میں کتنی دغابازیاں نہ پوچھ

آب رواں کو دیکھ کے دل نے یہی کہا
کس درجہ محترم ہیں تری ایڑیاں نہ پوچھ

چاقو کا یہ کمال کہیں، یا جمال حسن
کس طرح سے فگار ہوئیں انگلیاں نہ پوچھ

کچھ مصلحت سے ظلم و ستم سہہ رہا ہوں میں
کیا کیا ہیں میرے سامنے مجبوریاں نہ پوچھ

یوں تو محافظوں کی قطاریں تھیں چار سو
ویران کس طرح سے ہوئیں بستیاں نہ پوچھ

مجرم ٹہل رہے ہیں بڑی آن بان سے
ہم بے گنہ پہ سختیاں، پابندیاں نہ پوچھ

تنخواہ سے تو گھر کا چلانا محال ہے
کیسے بنائیں اس نے مگر کوٹھیاں نہ پوچھ

منصور ہر سوال کا رکھتا تھا وہ جواب
کیوں آج کل خموش ہے اس کی زباں نہ پوچھ

غزل

بادشاہ وقت گر نمرود ہو، شداد ہو
کس طرح پھر دل کسی کا شاد ہو، آباد ہو

میں وہ طائر ہوں کہ لے کر جال بھی اڑ جاؤں گا
ڈال کر پھندا دکھانا، تم اگر صیاد ہو

زور بازو یوں دکھا کر بات کرتے ہو کہ بس
جیسے کہ سارے جہاں میں اک تمہیں فولاد ہو

غیر ہیں قابض تمہاری دولت تہذیب پر
صرف کہنے کے لیے تم وارث اجداد ہو

ہم کسے الزام دیں، خود ہی بھلا بیٹھے اصول
ورنہ ہم آباد ہوتے، تم جہاں آباد ہو

یہ ضروری تو نہیں کہ چور کا بیٹا ہو چور
اور ہر اک مولوی کی مولوی اولاد ہو

بد دعا کو ہاتھ اٹھ جائے اگر مظلوم کا
اے ستم پرور! یقیں جانو کہ تم برباد ہو

جب تمہارے دل سے ایمان و یقیں جاتا رہا
خود بتاؤ کس طرح اب غیب سے امداد ہو؟

مضطرافتخاری
کولکاتا

غزل

جرم تو پہلے مرا مجھ کو بتایا ہوتا
پھر مجھے شوق سے سولی پہ چڑھایا ہوتا
دل کے گوشے سے عداوت کو مٹایا ہوتا
بڑھ کے احباب کو سینے سے لگایا ہوتا
ہم سمجھتے تھے بہت مخلص و ہمدرد ہیں آپ
کسی روتے ہوئے انساں کو ہنسایا ہوتا
بزم میں ساغر و شیشہ کی ضرورت تو نہ تھی
مدبھری آنکھوں سے ہی جام پلایا ہوتا
بے سبب عشق میں آنسو تو نہ ضائع ہوتے
سوز غم میں نہ اگر دل کو جلایا ہوتا
نئی دنیا کی طرف آیا جب اس دنیا سے
فطرت شر کو وہیں چھوڑ کے آیا ہوتا
دھوپ میں سانس تو لے سکتے مسافر مضطر
سایہ دار ایسا شجر کوئی لگایا ہوتا

غزل

جب غم سے منسلک یہ مری ذات ہوگئی
دنیا میں معتبر مری ہر بات ہوگئی
درد و الم، فراق، جلن، ٹیس، زخم دل
جو شئے ملی مرے لیے سوغات ہوگئی
دن ان کے انتظار میں، اور رات خواب میں
دنیا میں میری یوں بسر اوقات ہوگئی
آیا نہ تھا کبھی مرے خواب و خیال میں
کیوں راہ چلتے ان سے ملاقات ہوگئی
دیکھا نہیں تو آنکھ سے آنسو نکل پڑے
کیا گرمی نشاط تھی برسات ہوگئی
دیر و حرم میں ڈھونڈ رہے تھے جسے سدا
اپنے ہی گھر میں ان سے ملاقات ہوگئی
مضطر نہ اور وصل کی روداد پوچھئے
تقدیر میں یہ بات تھی پس بات ہوگئی

166/H/84, Keshab Chandra Street,
Kolkata-700009 Cell: 09433417042

اختر کاظمی
فتح پور

غزل

یا وہ رہتا تھا فقط عالم تنہائی میں
یا ہے اب شہرۂ آفاق کی اونچائی میں
کوئی آگے نہ بڑھا حوصلہ افزائی میں
ایک سے ایک تھے فنکار تماشائی میں
اس کے ہونے کا نہیں اس میں ذرا سا بھی ثبوت
تاب دیدار ہی باقی رہی بینائی میں
ہاتھ پھیلائے نہیں غیر کے آگے ہم نے
اپنے دن کاٹ دیے صبر و شکیبائی میں
نیند آئی کہ چلے آتے ہیں یادوں کے ہجوم
کس کی پازیب کی جھنکار ہے انگنائی میں
یوں خمار اس کی جوانی کا اترتے دیکھا
کچھ تو زیبائی میں تھوڑا کبھی انگڑائی میں
نظم لکھتے ہیں بہ عنوان غزل آج سبھی
کیوں اترتے نہیں اصناف کی گہرائی میں
کس لیے کرتے ہو لوگوں سے تمنا اختر
فائدہ کچھ نہیں بے وقت کی شہنائی میں

غزل

نہ میرے پاس آتی ہیں نہ مجھ سے دور جاتی ہیں
عجب یادوں کی یادیں ہیں نہ جانے کیوں ستاتی ہیں
زمانہ خود خدا ہے مت زمانے کو برا کہیے
مگر عادات انسانی ہیں پل میں بھول جاتی ہیں
ہمارے گھر کے گملوں میں کبھی کچھ تتلیاں آ کر
پروں پر قدرت کامل کی گلکاری دکھاتی ہیں
انہیں تشنہ لبی کا بھی سدا احساس ہوتا ہے
برس جاتے ہیں جب بادل تو فصلیں لہلہاتی ہیں
کبھی تو پاؤں کے سائے ہمیں رستہ دکھاتے ہیں
کبھی پرچھائیاں بھی آدمی سے روٹھ جاتی ہیں
عجب سی رقتیں دل پر اثر انداز ہوتی ہیں
ہمارے گاؤں کی گلیاں ہی جب آنکھیں چراتی ہیں
مرے گھر کی منڈیروں پر پرندے آتے جاتے ہیں
عنادل بھی کبھی آتی ہیں بیٹھے سر میں گاتی ہیں
خزاں کے پھول ہاتھوں میں لیے گر آ گیا کوئی
تو بے موسم میں بھی اختر یہ آنکھیں مسکراتی ہیں

349, Arabpur, Near Basant Talkies,
Fatehpur-212601 Cell: 09793529755

ڈاکٹر وارث انصاری
فتح پور

غزل

سکھ بھی، عیسائی بھی، ہندو بھی، مسلمان بھی ہے
یار بتلایئے ان میں کوئی انسان بھی ہے
ناخدائی بھی عطا کی ہے اسی نے مجھ کو
اور کشتی کا مرے وہ ہی نگہبان بھی ہے
تم بھی پہچان نہیں پائے ہو اس مجنو کو
وہ تو دیوانہ بھی ہے، وقت کا سلطان بھی ہے
جن کا کردار ہے سچا وہ کیے ہیں سرخم
بے ضمیروں کی زمانے میں بڑی شان بھی ہے
تم نئی بستی بسانے تو چلے ہو لیکن
جس جگہ جاتے ہو واں پر کوئی پہچان بھی ہے
شاعری کچھ بھی نہیں جز ہے خیالوں کا فقط
جو بہت سخت سخن ہے، بڑی آسان بھی ہے
کیفیت کون سمجھ پائے گا وارث اس کی
اس کی تصویر میں آنسو بھی ہیں، مسکان بھی ہے

غزل

ذہن میں جب بھی تمہارا خیال آتا ہے
تو زندگی میں انوکھا کمال آتا ہے
بدل ہی جاتا ہے پھر وقت کا مزاج ہی خود
جسے لہو میں اگرچہ ابال آتا ہے
کہ ہم نے مانا ہے خاروں کو بھی گل زیبا
ہماری سوچ میں ایسا جمال آتا ہے
وہ بدنصیب ہے جو مست نہ ہوا پی کر
ہمیں تو دیکھ کے ساقی کو حال آتا ہے
تمام فکر کے ساغر کھنگالتا ہوں جب
تو پھر ذہن میں کوئی لفظ لعل آتا ہے
کبھی کسی پہ بھی غصہ مجھے نہیں آتا
مگر کبھی کبھی خود پہ جلال آتا ہے
امیر قوم کی کرتی نہیں ہے جو عزت
اسی ہی قوم پہ وارث زوال آتا ہے

P.O. Patti Shah, Fatehpur-212652 (U.P.)
Cell: 09935005032

سردار آصف

غزل

آئینہ گھبرائے، اتنی روشنی کی جائے گی
اب ہمارے ساتھ بھی یہ زیادتی کی جائے گی

ہر گلی کے ذہن میں محفوظ ہے قصہ مرا
شہر میں کیا اب کسی سے دوستی کی جائے گی

دل بہ ضد ہے، کیا کروں لاچار ہے مرا دماغ
طے ہوا ہے کچھ دنوں آوارگی کی جائے گی

بھر دیا جائے گا پانی دیکھنا چاروں طرف
اس طرح بنیاد میری کھوکھلی کی جائے گی

لان کے پودھوں پہ رکھے جائیں گے کاغذ کے پھول
اور پاگل تتلیوں سے دل لگی کی جائے گی

میں نہیں دکھلائی دوں گا، لوگ ڈھونڈیں گے مجھے
مجھ کو خدشہ ہے کہ یہ جادوگری کی جائے گی

ہے اگر بیمار تو ٹل جائے گا حملہ مرا
جنگ سے پہلے عدو سے بات بھی کی جائے گی

غزل

ہوتا ہوں میں تھوڑا تھوڑا سب کے ساتھ
آدھا ادھورا ہی رہتا ہوں اپنے ساتھ

ہے مجھ کو معلوم یہ عادت آندھی کی
لے کر آتی ہے اکثر سناٹے ساتھ

دنیا میں کیسے پکڑوں تیری رفتار
اک دیوار رہا کرتی ہے میرے ساتھ

تو ہی منزل، تو ہی راستہ، تو ہی چراغ
ترے علاوہ جا سکتا ہوں کس کے ساتھ

کیا رونا، وہ برے وقت میں چھوڑ گیا
عام روش ہے، یہ ہوتا ہے سب کے ساتھ

نمبر ہی کالونی کے گھر کی پہچان
اک کھڑکی، اک دروازہ ہے سب کے ساتھ

دل جڑتا ہے کہیں کسی سے برسوں میں
بیٹھنا اٹھنا تو ہوتا ہے سب کے ساتھ

Deputy Director (P.R.) Moradabad
Division, Panchayat Bhawan, Company
Bagh, Moradabad-01 Cell: 09412678897

ابرار نغمی
رائسین

غزل

زندگی واقف صدمات کہاں تھی پہلے
اتنی سنگینیٔ حالات کہاں تھی پہلے

میری مشتاق نگاہی کا کرشمہ ہے یہ
آپ کے حسن میں یہ بات کہاں تھی پہلے

یہ تو نیرنگ طرازی مرے احساس کی ہے
فصل گل، بادل و برسات کہاں تھی پہلے

صدقۂ اہل جنوں ہے یہ بہار گلشن
بوئے گل مظہر جذبات کہاں تھی پہلے

آپ کے عشق نے معروف کیا ہے ورنہ
اتنی مشہور مری ذات کہاں تھی پہلے

میکشی لائی ہے مجھ کو در میخانہ تک
ورنہ ساقی سے ملاقات کہاں تھی پہلے

پھر تمھیں رنج بتوں نے دیا شاید نغمی
لب پہ دن رات مناجات کہاں تھی پہلے

غزل

نہ کی کسی سے شکایت، نہ کچھ گلہ میں نے
جو غم ملا اسے ہنس کر اٹھا لیا میں نے

اسی کا عکس ابھر آیا روبرو جو ہوا
بنا لیا ہے عجب خود کو آئینہ میں نے

ابھی سے اڑ گئی کیوں نیند اس کی آنکھوں سے
ابھی کہا ہی نہیں حرف مدعا میں نے

الگ ہے گرد سفر سب سے میرے دامن پر
رکھا ہے سب سے جدا اپنا راستہ میں نے

خدا کا شکر کہ اس دور خود نمائی میں
ہوائے دہر سے دامن بچا لیا میں نے

نہ کوئی چاپ نہ آہٹ یہ دشت تنہائی
کہ اپنے آپ کو گھبرا کے دی صدا میں نے

خدا پہ چھوڑ دیا اپنے خون کا انصاف
کسی سے مانگا نہیں نغمی خوں بہا میں نے

Near Mohammadi Masjid, Raisen-464551
(M.P.) Cell: 09424433844

عزیز نبیل
(قطر)

غزلیں

جس طرف چاہوں، پہنچ جاؤں مسافت کیسی
میں تو آواز ہوں آواز کی ہجرت کیسی

سننے والوں کی سماعت گئی، گویائی بھی
قصہ گو تو نے سنائی تھی حکایت کیسی

ہم جنوں والے ہیں، ہم سے کبھی پوچھو پیارے
دشت کہتے ہیں کسے، دشت کی وحشت کیسی

آپ کے خوف سے کچھ ہاتھ بڑھے ہیں لیکن
دست مجبور کی سہمی ہوئی بیعت کیسی

پھر نئے سال کی سرحد پہ کھڑے ہیں ہم لوگ
راکھ ہو جائے گا یہ سال بھی، حیرت کیسی

میں کسی آنکھ سے چھلکا ہوا آنسو ہوں نبیل
میری تائید ہی کیا، میری بغاوت کیسی

☆

حیات و کائنات پر کتاب لکھ رہے تھے ہم
جہاں جہاں ثواب تھے، عذاب لکھ رہے تھے ہم

ہماری تشنگی کا غم رقم تھا موج موج پر
سمندروں کے جسم پر سراب لکھ رہے تھے ہم

سوال تھا کہ جستجو عظیم ہے کہ آرزو
سو یوں ہوا کہ عمر بھر جواب لکھ رہے تھے ہم

زمین رک کے چل پڑی، چراغ بجھ کے جل گئے
کہ جب ادھورے خوابوں کا حساب لکھ رہے تھے ہم

غزلیں

اگرچہ ذہن کے کشکول سے چھلک رہے تھے
خیال شعر میں ڈھلتے ہوئے جھجک رہے تھے

کوئی جواب نہ سورج میں تھا نہ چاند کے پاس
مرے سوال سر آسماں چمک رہے تھے

کسی سے ذہن جو ملتا تو گفتگو کرتے
ہجوم شہر میں تنہا تھے ہم، بھٹک رہے تھے

یہ اس نے دیکھا تھا اک رقص ناتمام کے بعد
وفور شوق میں کون و مکاں تھرک رہے تھے

کتاب عمر گزشتہ کے حاشیوں میں نبیل
وہ شور تھا کہ زمیں آسماں دھمک رہے تھے

☆

عذاب خواہش تعمیر لے کے اترا ہے
وہ میرے خواب میں تعبیر لے کے اترا ہے

سفر کے بوجھ تلے خود کو کھینچتا ہوا دن
مری ہتھیلی پہ تاخیر لے کے اترا ہے

یہ کیسا دشت ہے جس کی جڑوں کا سناٹا
تمام شہر پہ تعزیر لے کے اترا ہے

لہو جمی ہوئی آنکھوں میں وقت کا پنچھی
جو کھو گئی تھی، وہ تصویر لے کے اترا ہے

افروز عالم
کویت

غزلیں

دشمنوں کو مرے ہمراز کرو گے شاید
وقت تنہائی میں آواز کرو گے شاید
تم بہت تیز ہو، شہ زور ہو، استاد بھی ہو
تم بنا پر کے بھی پرواز کرو گے شاید
یہ کھلا جسم، کھلے بال، یہ ہلکے ملبوس
تم نئے صبح کا آغاز کرو گے شاید
تلخ انداز سے بدلو گے زمانے کا مزاج
اپنے اطراف کو ناساز کرو گے شاید
تم تو خاموش ہو، لو میں ہی ذرا بولتا ہوں
بات سے بات کا آغاز کرو گے شاید

☆

شبنم کی طرح صبح کی آنکھوں میں پڑا ہے
حالات کا مارا ہے پناہوں میں پڑا ہے
تھا زندگی کے ساز پہ چھیڑا ہوا نغمہ
بے ربط جو ٹوٹے ہوئے سازوں میں پڑا ہے
سورج کی شعاؤں سے الجھتا ہے مسلسل
سایہ ہے ابھی وقت کی بانہوں میں پڑا ہے
تاریخ بتائے گی وہ قطرہ ہے کہ دریا
آنسو ہے ابھی وقت کے قدموں میں پڑا ہے
اس طرح وہ رد کرتا ہے عالم کے کہے کو
جیسے کوئی بھرپور گناہوں میں پڑا ہے

غزلیں

آپ سے انس ہوا چاہتا ہے
پھر کوئی باب کھلا چاہتا ہے
میرے احباب میں خبر کر دو
وہ بھی اب میرا ہوا چاہتا ہے
عقل ہی کو نہیں ندرت مرغوب
دل بھی انداز نیا چاہتا ہے
ہم نئی دوستی کے قائل تھے
کوئی دشمن کا پتہ چاہتا ہے
جو کھٹکتا ہے ایک عالم کو
وہ بھی لوگوں کی دعا چاہتا ہے

☆

نہیں خبر تھی بستی بستی روشنیاں پہنچانے میں
دل، دامن اور ہاتھ جلیں گے، بات ہمیں منوانے میں
ہم کو اندازہ یہ نہیں تھا کھلتے کھلتے سارے راز
ذہن و دل اکتا جائیں گے دل کا حال سنانے میں
کاش کہ ایسا ہو پاتا، تم میری بات سمجھ پاتے
دھرتی امبر کروٹ لیں گے، سر کا بوجھ بڑھانے میں
عالم بھر کی فکر سجائے، خواب سہانے لرزاں ہیں
آنکھیں پرنم، بوجھل بوجھل، سب کا دل بہلانے میں

P.O.Box 451, Farwaniya-81015 Kuwait
Cell: 0096566272697

ڈاکٹر بختیار نواز

غزلیں

لہولہان کبوتر ہوا میں اڑتا ہے
کہ اک نشان ستمگر ہوا میں اڑتا ہے
ہمارا خون کسی دن تو رنگ لائے گا
ہمارے قتل کا منظر ہوا میں اڑتا ہے
میں اپنی سوچ کے پر کاٹ دوں مگر پھر بھی
مرا یہ ذہن برابر ہوا میں اڑتا ہے
اسے زمین کی عظمت کا کچھ نہیں احساس
وہ ایک شخص جو اکثر ہوا میں اڑتا ہے
کئی دنوں سے ہے دہشت میں سارا شہر نواز
یہ کس کے ظلم کا خنجر ہوا میں اڑتا ہے

☆

کل جو کرتا تھا منع سب کو شجر کاٹنے کو
اب وہ آمادہ ہے انسانوں کا سر کاٹنے کو
ہم سفر کوئی نہیں ہے تو مجھے کیا غم ہے
'کچھ کتابیں ہیں مرے پاس سفر کاٹنے کو'
چیخ پڑتا ہے ہر اک پیڑ گھنے جنگل کا
لوگ آسان سمجھتے ہیں شجر کاٹنے کو
تو نہیں ہے تو عجب حال ہوا ہے میرا
دوڑتا ہے مجھے تنہائی میں گھر کاٹنے کو
میں نے جس کے لیے شہکار بنایا ہے نواز
وہ ہے تیار مرا دست ہنر کاٹنے کو

12/461, Teliyana, Bajardiha, Varanasi
Cell: 9336900864

ساجد سروری

غزلیں

حاصل کریں تو کیا کریں اس زندگی سے ہم
واقف نہیں ہیں ذات کی ہی آگہی سے ہم
چہروں کو پڑھنے کا ہنر اب آگیا ہمیں
حاصل تو کر چکے ہیں کچھ آوارگی سے ہم
کس سادگی سے اب تلک کھاتے رہے فریب
اے راہنمائے قوم تری رہبری سے ہم
یہ وقت کی پکار ہے ساجد سنو ذرا
آؤ ملائیں آدمی کو آدمی سے ہم

☆

اندھری اک ڈگر ہے اور میں ہوں
بہت مشکل سفر ہے اور میں ہوں
ادھر ان کی جفائیں ہائے توبہ
ادھر میرا جگر ہے اور میں ہوں
یہاں تو وسوسے ہیں الجھنیں ہیں
مگر، لیکن، اگر ہے اور میں ہوں
یہ بستا ہے اجڑتا اور بستا
یہ دل دلی نگر ہے اور میں ہوں
یہ بارش پتھروں کی پھر بھی ساجد
میرے کاندھے پہ سر ہے اور میں ہوں

Iqbal Bazm-e-Adab, Bhadrawah-182222
Distt. Doda (J&K) Cell: 09419270971

فیاض فاروقی

P.O.Box #445, Head Post Office, Luchiana-01

Cell: 09878555400

فیاض فاروقی

لدھیانہ

غزلیں

جو قلندر میں جھلکتی ہے، وہی شان ہوں میں
سلطنت دل ہے مری اور یہاں سلطان ہوں میں

چھٹپٹاتا رہا سرمائے کے پنجوں میں سدا
مجھ کو پہچانئے، مفلس کا گریبان ہوں میں

ہم کو کافی تھا کہ انسان ہی بن جاتے مگر
ہر کسی کو یہی دعویٰ ہے کہ بھگوان ہوں میں

دل مجھے کہتے ہیں، آباد تھیں مجھ میں قدریں
ایک مدت ہوئی مجھ کو بڑا ویران ہوں میں

لب تمہارے نہیں تھکتے مری قسمیں کھاتے
بچ بھی آتے ہو جس کو وہی ایمان ہوں میں

کبھی ہندو، تو کبھی سکھ، تو مسلمان کہا
کاش فیاض یہ کہہ دے کوئی، انسان ہوں میں

☆

فضا میں، برگ و ثمن میں تلاش جاری ہے
نہ جانے کسی کی چمن میں تلاش جاری ہے

یہ دھن کسی کو سکوں آج تک نہ دے پایا
مگر سکون کی دھن میں تلاش جاری ہے

جو اس کو ڈھونڈنا چاہیں تو دل میں پالیں مگر
نگر میں، دشت میں، بن میں، تلاش جاری ہے

لکیریں اپنے مقدر کی دیکھتا میں کہاں
تری جبیں کی شکن میں تلاش جاری ہے

چمن اجڑتے ہیں دے کر نمو کی امیدیں
یوں زندگی کی کفن میں تلاش جاری ہے

ہر ایک پھول ہے خاروں کی نوک پر فیاض
یوں لذتوں کی چبھن میں تلاش جاری ہے

غزلیں

پڑے ہے چوٹ کبھی دل پہ جب انا کے خلاف
چراغ زور پکڑتا ہے تب ہوا کے خلاف

وفا کے نام پہ دے کر ہمیں فریب ہزار
وہ اب وفا کے ہیں حامی تو ہم وفا کے خلاف

بھلا دوں تجھ کو یہ مانگی ہے جب بھی میں نے دعا
دعائیں مانگی ہیں فوراً اسی دعا کے خلاف

چراغ پوچھتے پھرتے ہیں اب پتہ اس کا
چلی ہے آج کچھ ایسی ہوا، ہوا کے خلاف

وہ شئے ہے عشق کہ بھردے ہر ایک زخم مگر
کچھ اک مریض ہیں لیکن اسی دوا کے خلاف

بلند کی ہے جو ہم نے صدائے حق فیاض
تو اک زمانے کو پایا اسی صدا کے خلاف

☆

ہے منزل دور، طغیانی کہیں اس سے بھی آگے ہے
یہ کشتی مجھ کو لے جانی کہیں اس سے بھی آگے ہے

زمینیں جیت کر کتنی یہ دنیا جیت لو لیکن
فقط اک دل کی سلطانی کہیں اس سے بھی آگے ہے

ہزاروں رنگ یہ موسم بدل ڈالے مگر پھر بھی
مرے دلبر کی من مانی کہیں اس سے بھی آگے ہے

خرد کی برتری ثابت ہے دنیا میں بہر صورت
مگر الفت میں نادانی کہیں اس سے بھی آگے ہے

یہ جلوے چاند تاروں کے سحر انگیز ہیں لیکن
ترے جلوؤں کی تابانی کہیں اس سے بھی آگے ہے

گنہ لذت تو رکھتے ہیں، مگر فیاض لذت میں
ندامت اور پشیمانی کہیں اس سے بھی آگے ہے

غزلیں

سرشار مئے سے ہے تو کوئی محو یاس ہے
ساقی کی چشم مست زمانہ شناس ہے

پھر مجھ میں اس کی یاد کے خنجر اتار کر
دو زخم پھر نئے کہ بہت دل اداس ہے

اٹھلائی شوخیوں سے ہوا کی جو شاخ گل
ایسا لگا تو اب بھی یہیں آس پاس ہے

ہر لمحہ دے رہی ہے مجھے زخم یہ نئے
خنجر بکف ہر ایک مری تشنہ آس ہے

منھ پھیر کر کے حکم دیا قتل کا مرے
کچھ پچھلی قربتوں کا اسے اب بھی پاس ہے

فیاض تو بچے گا سزاؤں سے کب تلک
جرم وفا ہر ایک ترا بے لباس ہے

☆

طلاطم خیز تھے اتنے کہ طوفانوں کو لے ڈوبے
مرے قصے نہ جانے کتنے افسانوں کو لے ڈوبے

فقیری بے کسی کے ساتھ ہی پروان چڑھتی ہے
مگر جب موج میں آئے تو سلطانوں کو لے ڈوبے

غریبوں سے نظر پھیری جہاں پر حکمرانوں نے
وہی مغرور جذبے ان کے ایوانوں کو لے ڈوبے

ڈبویا صرف شاہوں کو نہیں مغرور جذبوں نے
یہ کتنے ساتھ میں تسبیح کے دانوں کو لے ڈوبے

یہ اچھا ہے کہ تم کو دیکھ کر پیتے نہیں ورنہ
یہ چشم نیم وا تیری تو پیمانوں کو لے ڈوبے

یہی تو بے خودی ہے جو انہیں دیتی ہے سلطانی
وگرنہ ہوش کا لمحہ تو دیوانوں کو لے ڈوبے

غزلیں

کسی بھی حال میں حق کا بیاں اچھا نہیں لگتا
زمانے کو تو مقتل کا سماں اچھا نہیں لگتا

بہاروں پر خزاں کا دور آنا تو یقینی ہے
ترا اس حسن پر پھر یہ گماں اچھا نہیں لگتا

ہٹا کے جب بھی دیکھے دل سے تیری یاد کے موسم
کھنڈر لگتا ہے دل کا یہ مکاں اچھا نہیں لگتا

جلا ہے آج کس کا آشیاں صحن گلستاں میں
چمن کے بیچ سے اٹھتا دھواں اچھا نہیں لگتا

تری ہی مسکراہٹ سے تبسم ریز ہے دنیا
تری آنکھوں میں یہ سیل رواں اچھا نہیں لگتا

نگاہوں میں بسی فیاض جب ہوں بے کفن لاشیں
تو پھر اپنی امیدوں کا جہاں اچھا نہیں لگتا

☆

بدلتی رت میں بدلتا وہ جام کس کا تھا
سحر کو میرا تھا گر وہ، تو شام کس کا تھا

جواب سب کو پتہ ہے سوال سے پہلے
دلوں میں نفرتیں بونے کا کام کس کا تھا

بپا تھا شور قیامت کا آج محفل میں
"تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا"

خدا نے کس کی اذانوں کو معتبر مانا
شرف بلال کو، آخر غلام کس کا تھا

تمام عمر مری اس خلش میں گذری ہے
تری کتاب میں دھندلا وہ نام کس کا تھا

یہ اس کے ابرو کی فیاض ہے صفت ورنہ
لے خنجروں سے محبت کا کام کس کا تھا

آنند لہر
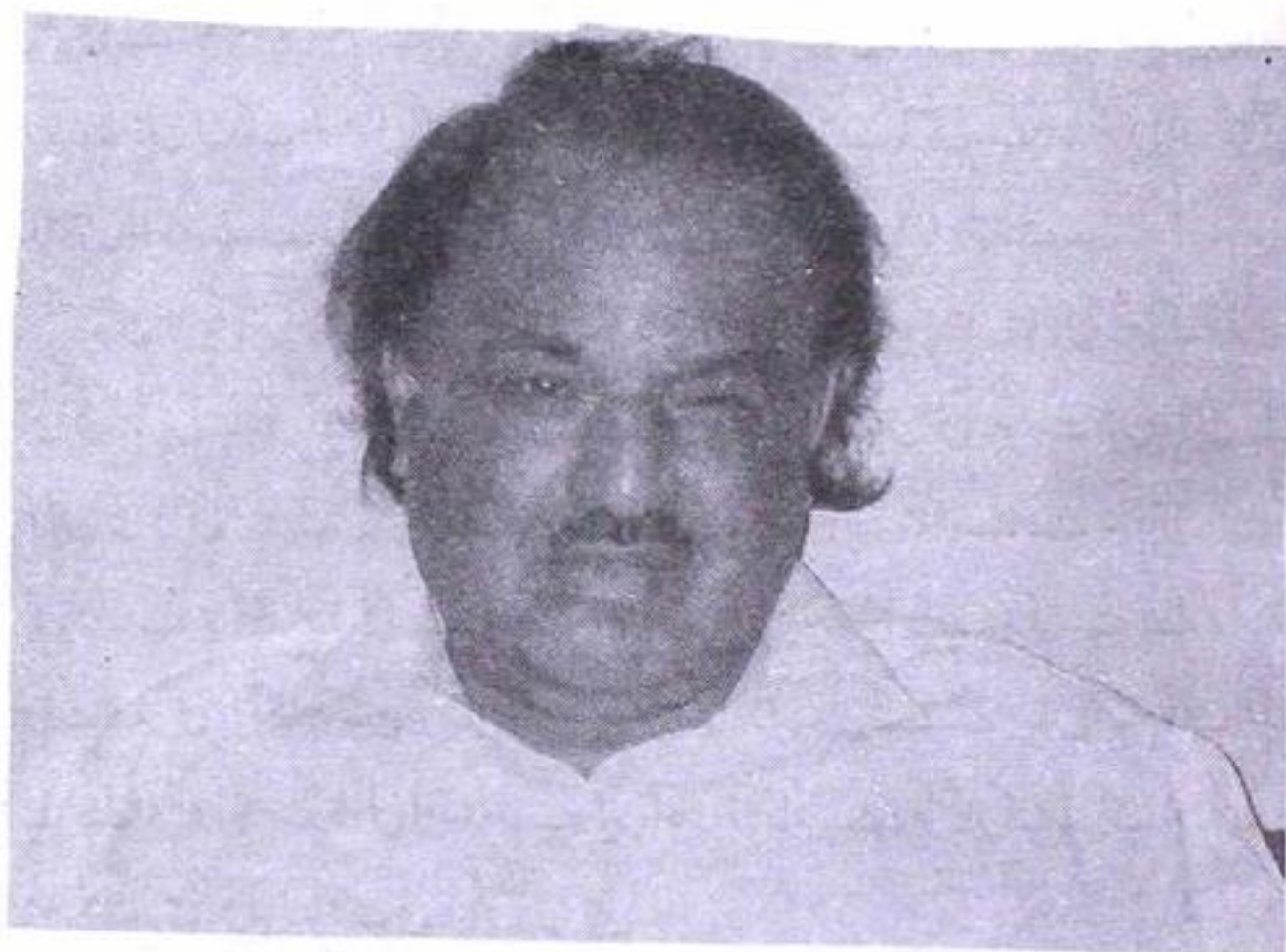
19, Bakhshi Nagar, Jammu-180001 (J&K)
Cell: 09419797660

آنند لہر۔ احترام انسانیت کا فن کار

پروفیسر قدوس جاوید (سرینگر)

عالم انسانیت ''نوتاریخیت'' کے حصار میں انسان تاریخ نہیں لکھ رہا ہے، تاریخ انسان کی تقدیر لکھ رہی ہے۔ کل کس فرد یا ملک وقوم کا مقدر کیا ہوگیا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا اور یہی غیر یقینی صورت حال انسان کو بار بار اپنے ماضی میں جھانکنے اور پھر ماضی سے اپنے حال کے رشتوں کی بازیافت پر مجبور بھی کرتی ہے۔ دراصل ہم کتنے بھی ''مستقبل پرست'' یا ''حال زدہ'' کیوں نہ ہو جائیں، حالات ثابت کر رہے ہیں کہ ملک وقوم کی فلاح کے سارے راستے ہمارے ماضی کے معاشرتی اور ثقافتی نظام میں موجود ہیں اور سب سے روشن راستہ مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کا راستہ ہے۔

وطن عزیز ہندوستان میں بھی نئی تاریخ رقم ہو رہی ہے لیکن چونکہ ہماری مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کی جڑیں ہماری آزادی اور بٹوارے سے قبل کی تاریخ میں ہی پیوست ہیں، اس لیے فرقہ وارانہ بحران کی ہر نئی کروٹ ہمیں بٹوارے کے شرمناک نتائج کے حوالے سے ۱۹۴۷ء سے قبل کی تاریخ کو یاد کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اردو فکشن میں کرشن چندر، منٹو اور بیدی سے لے کر قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، انتظار حسین، حسین الحق، عبدالصمد اور آنند لہر تک کے یہاں تقسیم ملک، فسادات اور ہجرت کے موضوع پر جو ناول اور افسانے ہیں ایک اعتبار سے وہ مشترکہ تہذیب اور فرقہ وارانہ اتحاد کی سنہری تاریخ کی بازیافت کی ہی کوشش ہیں۔

آنند لہر ایک مکمل فکشن نگار ہیں۔ افسانہ ناول اور ڈرامہ کو تمام تر فنی و جمالیاتی دروبست کے ساتھ برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ لیکن ان کی بنیادی پہچان ان کی افسانہ نگاری ہے۔ آنند لہر گذشتہ کئی دہائیوں سے لکھ رہے ہیں۔ ہندو پاک کا شاید ہی کوئی جریدہ ایسا ہو جس میں ان کے افسانے شائع نہ ہوتے ہوں، یوں تو ان کے افسانوں کے موضوعات متنوع ہوتے ہیں۔ زندگی اور زمانہ کی کن کن کروٹوں کو آنند لہر نے اپنے افسانوں میں سمیٹا ہے، اس کا محاسبہ آنند لہر کے تخلیقی عمل کو ہر ہر پہلو سے پرکھنے کے مترادف ہوگا۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ یوں تو آنند لہر کے افسانوں کے بنیادی موضوعاتی دائرے کئی ہیں مثلاً زندگی اور زمانے کا گہرا شعور، مشاہدہ اور تجربہ کے میل جول سے پیدا ہونے والا

نفسیاتی رویہ، جذباتیت سے بھرپور فکر و دانش، مثبت اور تعمیری کرداروں کی تراش خراش، پرامن معاشرے کی تشکیل کا خواب وغیرہ۔ لیکن ان موضوعاتی دائروں میں سب سے نمایاں ''بٹوارہ'' کے نتیجے میں قومی یکجہتی کی شکستگی کے کرب کا دائرہ ہے جسے آنند لہر نے اپنے زیادہ تر افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں الگ الگ انداز میں برتا ہے۔ آنند لہر اپنے افسانوں میں بٹوارہ، فسادات اور ہجرت سے جڑے واقعات محض بیان نہیں کرتے بلکہ سیاست کی کوکھ سے جنمے اس صورت حال کی گرہوں اور طرفوں کو ہندوستان کی روایتی مشترکہ تہذیب اور فرقہ وارانہ اتحاد کے حوالے سے کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آنند لہر کی سوچ اور فکر ہی نہیں تخلیقی رویہ بھی مثبت، مقصدی اور تعمیری ہے۔ اور آج کی تاریخ میں ہمارا معاشرہ ہماری تہذیب اور ہمارا ادب ایسے ہی رویے کا تقاضہ کرتا ہے۔ دراصل ۱۸۵۷ء میں ہم نے اپنی آزادی کھوئی تھی اس کے اسباب کچھ اور تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ہم نے اپنی آزادی دوبارہ حاصل کی لیکن اس طرح کہ زمین ہی نہیں تنگ نظر سیاست دانوں نے بڑی حد تک ہمارے ذہن اور ضمیر کے بھی دو ٹکڑے کر دیے۔ آزادی کے پرچم پر لہو کے چھینٹے عبرتناک کہانیاں لکھ گئے۔ بٹوارے نے وہ درد دیا کہ آج نصف صدی سے زائد کا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی ہم فسادات اور ہجرت کے مہلک اثرات سے اپنا دامن نہیں جھاڑ سکے ہیں۔ صدیوں کی ہندو مسلم یکجہتی اور مشترکہ تہذیب کچھ اس طرح پارہ پارہ ہوئی کہ اس کی کرچیاں آج بھی نہ جانے کہاں کہاں سے چبھتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے تقسیم ملک کے بعد اپنے پہلے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں ہندو مسلم اتحاد کی شکستگی کے حوالے سے بڑے ہی سچے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

''صدیاں نکل جائیں گی، جگ بیت جائیں گے، ہم ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ کے واسطے اجنبی ہو کر رہ جائیں گے۔ جنم جنم کے لیے ایک دوسرے کو شبہ اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ ارے تم نے فوجیں، سرکاری محکمے، توپیں، مشین گنیں، ہتھیار تو تقسیم کر لیے۔ لیکن ہمارے مشترکہ تمدن، ہماری موسیقی، ہمارے ادب، ہمارے آرٹ کا کیا ہوگا؟ کیا اب تم یہ کہو گے کہ ''یہ ہندو موسیقی ہے، یہ مسلم موسیقی ہے؟ یہ صرف اس ملک کا فن ہے؟ اور کمل اور نرملا کیا صرف ہندوؤں کے لیے ہیں؟ نذرالاسلام اور جوش فقط مسلمانوں کے لیے ہیں؟ ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟''

یہ سوال کہ ''یہ کیا ہو رہا ہے'' آج بھی نہ صرف قائم ہے بلکہ ایودھیا اور گجرات جیسے سانحوں کے تسلسل کے بعد اور زیادہ سنگین ہو گیا ہے۔ آنند لہر جیسے اردو ادیبوں کا فن اسی سوال کی آگ کو بجھانے اور شک و شبہ، نفرت و عداوت کے آتش کدے کو محبت و اخوت کے لالہ زار میں بدلنے کی کوشش ہے۔

''اب ان ہتھیاروں کا کیا کیا جائے۔

ایک کام کرتے ہیں..... پہلے نے کہا۔

......ہم درختوں کو پانی دیتے ہیں اور پھول اگاتے ہیں اور آنے والی نسل کو ہتھیار چلانے کی ٹریننگ نہ دے کر اسے پھول اگانے کے طریقے بتاتے ہیں۔''

وہ یہ سب سن کر خوش ہوگئے۔

مگران ہتھیاروں کا کیا کیا جائے؟ اس سوال سے وہ کافی پریشان ہوئے۔

اب تباہی جو ہم نے بوئی ہے اس کی فصل تو کاٹنی ہی پڑے گی۔

ہتھیاروں کو پڑا رہنے دو۔ آنے والی نسلیں انہیں چلانا بھول جائیں گی اور وقت بارود کو ضائع کر دے گا۔

وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور بول اٹھے۔

گھنگھروؤں میں گولیوں کی آوازیں جذب کرنے کی طاقت موجود ہے۔''

افسانہ ''ہتھیار'' مشمولہ، بٹوارہ ص ۱۰۳۔۱۰۲

ادب اور ادیب کی آزادی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن جس ادب میں اپنے معاشرہ، اپنی تہذیب کے حوالے سے مثبت اور تعمیری، فنی و جمالیاتی ردعمل کا اظہار نہ ہو۔ آج کے تناظر میں وہ ادب محض لسانی کھیل (Language Game) کہلائے گا، سچا، زندہ، متحرک اور ارتقا پذیر ادب نہیں۔ چنانچہ عالمی پیمانے پر تمام بڑے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں آج اگر منفی اور تخریبی (Negative & Distructive) رجحانات کے بالمقابل مثبت اور تعمیری رویوں کا اظہار ملتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ سماجی و سیاسی اور تہذیبی و اخلاقی بحران ہی ہے اور جس کے نتیجے میں ''عالم انسانیت'' کسی بھی طرح کے اقداری نظام (System Value) سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ برصغیر ہندو پاک میں زوال اور بحران کی یہ کیفیت کچھ زیادہ ہی سنگین اور تشویش ناک ہو چکی ہے۔ ایسے میں کوئی بھی جینوین ادیب رومانیت پسندوں یا جدیدیت کے حامیوں کی طرح زندگی اور زمانہ سے منھ موڑ کر ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ چنانچہ کرشن چندر، منٹو، بیدی اور قرۃ العین حیدر کے بعد اگر انتظار حسین اور آنند لہر، اقبال مجید اور خالد حسین، حسین الحق، مشرف عالم ذوق، شوکت حیات اور پیغام آفاقی وغیرہ اگر

اپنے فکشن کے ذریعے، منفی سوچ اور رویوں کو ان کی اصلی شکل میں دیکھ رہے ہیں اور انہیں مثبت اور تعمیری سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اسے اردو فکشن کے لیے اور اپنی معاشرت، اپنی تہذیب کے لیے فال نیک ہی سمجھنا چاہیے۔

"وہ دھرم کو مانتا تھا۔ وہ ہندو مسلم اور عیسائی بھی تھا اور نہیں بھی۔
کیونکہ وہ سب دھرموں کو مانتا تھا اور کسی دھرم کو نہیں مانتا تھا۔ وہ پاپ اور پن کے چکر کو سمجھتا تھا، وہ یہ بات بھی جانتا تھا کہ انسان کو اس کے گناہوں کی سزا ضرور ملتی ہے اور سچائی یہ بھی ہے کہ سزا ضرور ملنی چاہیے۔"

یہ سرحدیں۔ مشمولہ، بٹوارہ ص ۷۱

آنند لہر کی یہ سوچ، مشترکہ تہذیب کی دین ہے جس کا اظہار آنند لہر نے موجودہ حالات میں Self Humiliation کے دباؤ میں فنی و جمالیاتی دروبست کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن آج چند ایک تخلیقی فن کاروں سے قطع نظر کتنے لوگ ہیں جن کی سوچ میں آنند لہر کی طرح ایسا تعمیری رنگ جھلکتا ہے۔ ادب کے نام سے کاغذ پر سیکولر ہونے کا ڈھونگ رچانے والے زمین پر عصبیت اور تنگ نظری کے کیسے کیسے تماشے کرتے ہیں، اس کا اندازہ ہم سب کو ہے۔ دراصل جس طرح بٹوارے سے پہلے ہندوستان کی جغرافیائی اور سیاسی تقسیم کو تو روکا نہیں جا سکا لیکن بٹوارے کے بعد اس بٹوارے سے جنم لینے والی سائیکی اور تعصباتی ردعمل کو روکنے کے لیے بھی سنجیدہ اقدامات نہیں کیے جا سکے۔ اس بات کو فراموش کر دیا گیا کہ ایک فرقہ پرستی، دوسری فرقہ پرستی کو جنم دیتی ہے ہمارے حکمرانوں کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ چندر کے "وحشی" منٹو کے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" راجندر سنگھ بیدی کی "لاجونتی" کی سوچ ہر انسان دوست شہری کی سوچ بھی تھی حسیت بھی اور احتجاج بھی۔ لیکن آزادی حاصل کرنے کے بعد شاید آج تک ہم اپنی دروں بینی اور خود احتسابی کے اس مقام تک نہیں پہنچ پائے ہیں جہاں ہم پوری ایمانداری سے اپنے آپ سے یہ پوچھ سکیں کہ گوتم بدھ اور خواجہ اجمیری کی بصیرت کی ہماری قومی زندگی میں کیا معنویت (Relevance) ہے۔ کیا ان کا تہذیبی اور اخلاقی وژن عملاً ہمارے لیے محض خوش گوار خود فریبی ہے۔ ہندوستان میں بٹوارے کا منظرنامہ بدل چکا ہے۔ کئی زاویوں سے ہم بہت آگے نکل چکے ہیں لیکن آگے نکلتے ہوئے ہم کئی کئی ٹکڑوں میں بٹتے بھی چلے گئے ہیں باہمی منافرت، علاحدگی پسندی اور تشدد کا اژدھا اپنے کئی کئی سروں کے ساتھ ہماری یکجہتی اور مشترکہ تہذیب کو نگل رہا ہے۔ فرقہ پرستی، علاقہ پرستی، آتنک واد اور بدعنوانی اور یہ سب الگ الگ ناموں اور عنوانوں کے ساتھ سامنے آ رہے ہیں۔ رام راجیہ، نظام مصطفیٰ، خالستان، چرچ کو بچانے کی مہم، بھرشٹاچار کے خلاف انا ہزارے کی

تحریک وغیرہ۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کا اژدہا بھی بہت بڑا ہے اور اس کے سر بھی آٹھ سے زیادہ ہیں۔ یہ کوئی داستان یا متھ نہیں بلکہ ہماری آج کی زندگی کی تلخ سچائیوں کا آئینہ ہے۔ اور اردو کے جو ادیب اپنی کہانیوں کے حوالے سے یہ آئینہ تواتر کے ساتھ دکھا رہے ہیں ان میں آنند لہر بہت خاص ہیں۔

> ''.....موسم کب کسی کا لحاظ کرتے ہیں۔ وہ بدلتے رہتے ہیں۔
> گلو نے سوچا کہ ایک دن ضرور حنا کے پھول اس کے آنگن میں کھلیں گے، اور ادھر حنا نے سوچا کہ ایک دن ضرور اس کے گھر میں گلو کے بنائے ہوئے برتن ہونگے۔ مگر وہ اس بات کو بھول گئے تھے کہ موسم بدلتے رہتے ہیں۔ موسموں کے بدلنے کا اثر انسان پر ہوتا ہے اور اس زمین پر ہر جگہ ایک جیسے موسم نہیں ہیں۔''

افسانہ ''موسم بدلتے رہتے ہیں'' مشمولہ، بٹوارہ ص ۳۲

آنند لہر کے ایسے افسانے سانپ کا زہر اتارنے کی کوششیں تو ہیں ہی لیکن ایسے افسانوں کے تخلیقی محرکات بھی قابل غور ہیں۔ نفرت اور عصبیت سے لے کر قتل و خون تک میں ملوث سارے لوگ انسان ہی ہوتے ہیں۔ قاتل بھی انسان اور مقتول بھی انسان۔ لیکن دھرم نے ان کی پہچان الگ الگ کر دی ہے۔ وہ ایک ہی زبان بولتے ہیں، ایک ہی گیت گاتے ہیں۔ ایک جیسے رسم و رواج نبھاتے ہیں ایک ہی انداز میں بھانگڑا ناچتے ہیں پھر یہ جنون کیوں اور اس جنون کا خوف کیوں؟ کوئی بھی مذہب نہ اس جنون کو مانتا ہے اور نہ خوف و ہراس کو، دھرم یا مذہب تو امن و سکون کی زندہ اور متحرک علامت ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہر شریف انسان یہ سمجھتا ہے اس سچائی کو تسلیم کرتا ہے پھر بھی لوگ تشدد، دہشت گردی اور نفرت و عصبیت کے حصار میں ہیں۔ زندگی جینا ہم سب کی مجبوری ہے لیکن جینے کا سارا عمل سوالوں کے گھیرے میں ہے۔

> ''لگتا ہے ہر چیز سوال پوچھ رہی ہے۔ دریا بہہ نہ رہے ہوں بلکہ سوال پوچھ رہے ہوں۔ بچے گیند نہ اچھال رہے ہوں بلکہ وہ لفظ اچھال رہے ہوں جن سے سوال بنتے ہیں۔ پھر یہ سب دیکھ کر کبھی کبھی لگتا ہے کہ انسانی بدن جو دھرتی پر ہیں صرف سوال ہیں اور یہ سوال اس وقت کیے گئے جب انسان کے گناہوں کا حساب رکھنے کے لیے فرشتوں کو اس کے کاندھوں پر بیٹھا دیا گیا۔ فرشتے کاندھوں پر بیٹھے بیٹھے تنگ آ گئے۔''

افسانہ ''سوال'' مشمولہ بٹوارہ ص ۱۱۸

گیتا ہری ہرن کے ناول Intimes of Siege میں بھی، ایسے ہی حالات کے تناظر میں ''انسان'' سوالات کے گھیرے میں نظر آتا ہے۔ گیتا ہری ہرن کا ناول ایک رواں دواں اور طاقتور سیاسی بیانیہ (Political Narration) ہے جس میں ان سیاسی جماعتوں کو نشانہ بنایا گیا ہے جو ہندوستان کی تاریخ کو اپنی ہی سوچ کے حوالے سے لکھوانا چاہتی ہیں اور جو پورے تعلیمی نظام کو فرقہ پرستی اور تنگ نظری کا طرف دار اور مبلغ بنانا چاہتی ہیں۔ ناول یہ بھی بتاتا ہے کہ ہندوستانی معاشرہ روز بروز زیادہ ہی بنیاد پرست، نفرت کرنے والا، ایک دوسرے پر بھروسہ نہ کرنے والا اور رواداری کے بجائے عدم رواداری میں یقین کرنے والا معاشرہ بن رہا ہے لیکن آنند لہر کی کہانیوں میں کورا سیاسی بیانیہ نہیں ہے۔ وہ بڑے ہی سہج سادہ لیکن تخلیقی انداز میں فرقہ پرستی، عدم رواداری اور تعصب سے پاک ایک پرامن ہندوستانی معاشرے کی تشکیل جدید کرنا چاہتے ہیں، آنند لہر کی افسانہ نگاری کا یہی بنیادی امتیاز ہے۔ اس سے ان کی شناخت قائم ہوئی ہے۔

آنند لہر کے افسانوں میں بٹوارہ، قومی یکجہتی اور پرامن ماحول کی تشکیل کے علاوہ بھی بہت سارے موضوعات ملتے ہیں جو عصری زندگی اور زمانہ کی دین ہیں۔ اس ضمن میں ان کے افسانے ''سونامی، ان کے بچے، پھیکے آم، دوسری بے انصافی'' اور ''چلتے رہو'' وغیرہ قابل ذکر ہیں جن میں آنند لہر نے جدید معاشرتی اور ثقافتی حالات و واقعات کے حوالے سے فکر و عمل کے تضادات کو انتہائی فن کارانہ باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آنند لہر ایک مکمل افسانہ نگار ہیں، اسی لیے وہ کسی بھی واقعہ، سانحہ، تجربہ یا احساس کو کہانی کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ افسانہ میں، سادہ، علامتی یا اساطیری کسی بھی طرح کا اسلوب برتنے کی بھی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے افسانہ ''کلفیاں'' میں سادہ اور سہل بیانیہ اختیار کیا۔ افسانہ ''سنہری مچھلی'' میں علامتوں کا برتاؤ سماجی انسلاکات کے تناظر میں ہوا ہے جبکہ ''موسم بدلتے ہیں'' اساطیری اسلوب میں لکھا گیا ایک کامیاب افسانہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ آنند لہر عصری اردو افسانہ کا ایک ایسا نام ہے جن کا تخلیقی سفر گذشتہ کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ اور اب ان کا شمار اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں موضوع اور اسلوب، فکر و دانش، فنی و جمالیاتی رویہ ہر اعتبار سے وہ تنوع اور تازہ کاری نمایاں ہے جو کسی بھی تخلیقی فن کار کو معتبر بنانے کے لیے لازمی ہے۔ آنند لہر جس طرح جدید ہندوستان کے قومی، سماجی، ثقافتی، اخلاقی اور نفسیاتی حقائق اور مسائل کو کمال رواداری اور وسیع النظری کے ساتھ پیش کر رہے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ آنند لہر کا فن انسان اور انسانیت کے احترام کا فن ہے۔

محبت و ایثار کا ترجمان: نامدیو

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد (دربھنگہ)

محبت حسین ترین جذبہ ہے۔ اس میں حیات و کائنات کو تسخیر کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ یہ دلوں کو جوڑتی ہے اور دشمنوں کو بھی گلے لگانا سکھاتی ہے۔ یہ حاصل کرنے یا فتح کرنے کے بجائے سپردگی کا خوگر بناتی ہے، پانے کی چاہت سے بڑھ کر ایثار و قربانی کی عادت ڈالتی ہے۔ جس نے اس منتر کو اپنا لیا اس کی زندگی کامیاب و کامران ہوگئی۔ یہ گیان کی باتیں موجودہ صارفی عہد میں صرف کتابی باتیں رہ گئی ہیں۔ شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھے کے قصے آؤٹ ڈیٹیڈ کہلاتے ہیں۔ عشق کو بھی مادی ضرورتوں سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ حسیناؤں کو دیکھ کر دل کا مچلنا فطری ہے تو اس کا فوری اظہار آج کا فیشن۔ پوری زندگی کسی کی یاد میں یا کسی کے پیار میں گزار دینا صرف افسانہ ہے۔ سائنس کی تیز رفتاری نے ہمارے دلوں کو بھی غیر فطری افکار و اعمال کی جانب راغب کر دیا ہے۔ اب زمانہ محبت سے دلوں کو آراستہ کرنے کے بجائے استعمال کرنے کی صلاح دیتا ہے۔ ایسے وقت میں آنندلہر جیسا جینوئن فنکار محبت کو موضوع بنا کر ناول کی تخلیق کرتا ہے تو بلاشبہ یہ غور و فکر کا مقام ہے۔ ''نامدیو'' کے دل میں جذبۂ محبت کا دریا رواں دواں دیکھ کر کیا محبت کے ماحول کی بازیابی کا خواب نہیں دیکھا جا سکتا؟ اگر اس کا جواب مثبت ہے تو ہمیں اس تازہ ناول کے بطن سے برآمد پیار کی جیوتی سے روشنی ضرور حاصل کرنی چاہئے۔

آنندلہر موجودہ عہد کے مشہور فکشن نگار ہیں۔ ان کے افسانے ملک کے معتبر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کی پذیرائی ہوئی ہے۔ بطور ناول نگار بھی انہوں نے نام کمایا ہے۔ ''نامدیو'' ان کا پانچواں ناول ہے۔ اس سے قبل ''اگلی عید سے پہلے''، ''سرحدوں کے بیچ''، ''مجھ سے کہا ہوتا'' اور ''یہی سچ ہے'' ناولوں نے ناول نگار کی حیثیت سے ان کی شناخت مستحکم کی ہے۔ ''نامدیو'' مذکورہ ناولوں سے منفرد ہے۔ اس کا موضوع وسیع تر معنوں میں محبت کی بازیابی اور کامرانی ہے۔

کہانی کا آغاز مرد سوسائٹی کی اس دیرینہ خواہش سے ہوا ہے جس پر بیویاں بلی چڑھائی

جاتی رہی ہیں۔ گوبند رام کو تین بیٹیوں کے بعد بیٹے کا انتظار ہوتا ہے جو اس کی بیوی شانتی پورا کرتی ہے۔ نامدیو کی پیدائش کا جشن اتنا پر جوش اور پر شور ہوتا ہے کہ اس میں شانتی کی دردناک آواز اور آخری پکار گھٹ کر دم توڑ دیتی ہے۔ اس طرح نامدیو اپنی ماں شانتی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کی بہنیں سریتا، آرتی اور کلپنا اس کی پرورش کی ذمہ داری نبھاتی ہے۔ گوبند کی ہمسایہ ساوتری ایک خوبصورت عورت ہے۔ جس سے نام دیو بچپن سے ہی مانوس ہے۔ اس کو دیکھتے ہی رونا بند کر دیتا ہے۔ اس کی گود میں جا کر مسکراتا ہے۔ گوبند ساوتری کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہے مگر ساوتری ایک پاک باز عورت کی طرح خود کو بچا لیتی ہے اور گاؤں چھوڑ کر دوسری جگہ چلی جاتی ہے۔ ساوتری کی نفسیات کا بیان دیکھیے۔

> ''......گوبند گھر میں اکیلا تھا۔ اس نے عاجزی سے ساوتری کی طرف دیکھا۔ ساوتری کو محسوس ہوا کہ وہ پگھل رہی ہے اور ایک ایسی لکڑی ہے جو آہستہ آہستہ آگ میں جل رہی ہے۔ وہ بھاگی اور بھاگتی گئی۔ اسے لگا کہ اس کی رحم دلی اور سادگی اُس کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ دوڑتے دوڑتے وہ گری، پھر اُٹھی اور پھر دوڑی۔ اُسے کسی بھی لحاظ سے گوبند کی ہوس کا خطرہ نہیں تھا بلکہ وہ تو گوبند کی اُس خواہش سے ڈر رہی تھی جو رحم و عاجزی کے لباس میں تھی۔ ساوتری اور تیز دوڑی اور دوڑتی ہی چلی گئی۔''
>
> (صفحہ ۲۴۔۲۵)

گوبند اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی آشا سے شادی رچاتا ہے۔ کیوں رچاتا ہے ناول نگار کی زبانی سنئے:

> ''گوبند آشا سے دوگنی عمر کا تھا۔ وہ آشا سے پیار نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی اس میں آشا سے پیار کرنے کی ہمت تھی۔ وہ بس ہوس مٹا سکتا تھا۔ شام کو شراب پی کر آشا کے پاس چلا جاتا اور اس کے بدن کو نچوڑنے لگتا۔ زور زور سے اُس کے خوبصورت بدن کو مسلتا۔ وہ اپنا یہ غصہ کہ وہ بڑھاپے کی طرف کیوں جا رہا ہے، آشا کے جسم کو مسل کر نکالتا۔''
>
> (ص۔۳۹)

آشا نامدیو کو بہت پیار کرنے لگتی ہے۔ گوبند جل بھن کر اسے بار بار یاد دلاتا ہے کہ وہ اس کی سوتیلی ماں ہے مگر آشا جب تک رہتی ہے اپنا پیار نامدیو پر لٹاتی رہتی ہے۔ آشا کو بھی دو لڑکے ہوتے ہے۔ برہم دیو اور ہرش دیو۔ دوسرے بیٹے کی پیدائش پر اس کی یادداشت چلی جاتی ہے اور ایک دن گھر

سے لاپتہ بھی ہو جاتی ہے۔ بعد میں وہ ساوتری کے یہاں دیکھی جاتی ہے۔ نامدیو رنگوں کا رسیا اور حسیناؤں کی خوبصورتی کے دیدار کا مزاج رکھتا ہے۔اس کی زندگی میں کسم آتی ہے جس کی تعلیم جاری رکھنے کے لئے وہ ٹیوشن کرتا ہے۔مگر وہ بھی اپنے والدین کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور چلی جاتی ہے۔ پھر نامدیو اپنی ہم جماعت نیرو سے قریب ہوتا ہے۔

> ''.......... اِدھر نیرو کی آنکھوں نے محسوس کیا وہ تب تک مکمل نہیں ہیں جب تک نام دیو کا چہرہ نہ دیکھ لے۔ نام دیو کے کانوں نے محسوس کیا کہ انہیں صرف نیرو کی آواز سُننی ہے اور یہ آواز ہی اس کی زندگی بھی ہے اور موت بھی۔ نام دیو کی زندگی میں سب کچھ اچانک ہوتا تھا۔ نیرو کا ملنا بھی اچانک ہی تھا۔''
>
> (ص ۹۵)

اچانک نیرو کا ملنا اس کے دل کا کھلنا، اس کے خیالوں کو اس طرح معطر کر جاتا ہے کہ ایک دوسرے کی پسند و ناپسند اپنی عادت بنا ڈالتا ہے۔

> ''........ نامدیو کو پیلا رنگ پسند تھا، یہ نیرو کو معلوم ہو گیا تھا۔ نام دیو کی خواہش کا خیال رکھتے ہوئے نیرو زیادہ تر پیلے کپڑے پہنتی اور اپنی کاپیوں پر کور بھی پیلے رنگ کے ہی چڑھاتی۔ یہ محبت کا ایک انوکھا طریقہ تھا اور یہ بھی لگتا تھا کہ یہ عجیب وغریب محبت ہے۔ یہ نہ لکھی جا سکتی ہے اور نہ کہی جا سکتی ہے۔ یہ صرف شاعر کی شاعری اور موسیقار کی موسیقی میں رہتی ہے۔''
>
> (ص:۱۰۰)

نامدیو کو اس کے بغیر پھولوں میں خوشبو کی کمی کا احساس ہوتا۔ وہ جب نہیں ملتی تو سارے رنگ پھیکے معلوم پڑتے۔ وہ نیرو کو اتنا پسند کرنے لگا کہ اس کو ڈاکٹر بنانے کی خاطر اپنے اکزام پیپر خراب کر ڈالتا ہے۔ نیرو بھی ڈاکٹری پڑھنے گاؤں سے چلی جاتی ہے اور پھر نامدیو اکیلا ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کی دوسری محبت بھی قربان ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی میں ایک بار پھر پڑوسی گاؤں کی لڑکی نیماں آتی ہے۔ وہ اسے دل وجان سے چاہنے لگتا ہے۔ یہ وہ لڑکی ہے جس کو چھونے کی تمنا نامدیو کے دل کو ہوتی ہے۔ اس کا لمس اسے اچھا لگتا ہے۔ وہ اسے اپنانا چاہتا ہے۔ نیماں بھی اسے پسند کرتی ہے۔ وہ بہانے بنا بنا کر نامدیو سے ملنے آتی رہتی ہے۔ دونوں گاؤں کے درمیان پرانی رنجش ہے۔ نمبردار اس دشمنی کو ختم ہونے دینا نہیں چاہتا کیوں کہ اس کی اہمیت کم ہو جائے گی۔ نفرت کے سہارے

ہی اس کی سرداری چلتی ہے۔ دونوں گاؤں کے درمیان فٹ بال کا میچ ہوتا ہے۔ نامدیو فٹ بال کا اچھا کھلاڑی ہے۔ گوبند اور نامدیو مہمان کھلاڑیوں اور تماشبین کو دعوت دیتے ہیں۔ دعوت میں نیماں کے نہیں آنے پر اس کو بیحد تکلیف ہوتی ہے۔ وہ پریشان ہو اٹھتا ہے اور گلشن کی دکان پر چلا جاتا ہے اور کپڑوں کو کاٹنے لگتا ہے۔

"......... یوں لگ رہا تھا جیسے قینچی صرف ایک بہانہ ہو مگر اس کی انگلیاں اِن کپڑوں کو کاٹ رہی ہوں مگر نہ جانے نیماں کو کیسے معلوم ہو گیا کہ نامدیو گلشن کی دوکان پر گیا ہے۔ نیماں بھی وہاں آ گئی۔ نامدیو نے دل سے چاہا کہ وہ خود مشین بن جائے اور نیماں کے بدن پر چڑھ کر اُس کے کپڑوں کو سی ڈالے اور اپنے ہاتھوں کی اُنگلیوں سے نیماں کے بدن پر ہر جیت کی ہوس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ مگر نہ جانے کیسے ہر جیت کو پتہ لگ گیا اور وہ بھی وہاں آ گیا۔ وہ آتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔"

(ص:۱۴۷)

اسے جب یہ خبر ملتی ہے کہ ہر جیت کے بہکانے پر یہ طے ہو گیا ہے کہ نامدیو کی ٹیم اگر میچ جیتتی ہے تو نیماں اور اس کے گھر والوں کو گاؤں سے باہر نکال دیا جائے گا اور اس کو اذیت دی جائے گی۔ نامدیو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے گول میں ہی گول داغ دیتا ہے۔ اس طرح اس کا گاؤں ہار جاتا ہے۔ پھر نیماں ہر جیت سے زبردستی بیاہ دی جاتی ہے۔ اب نامدیو کی زندگی دیوداس جیسی ہوتی ہے۔ وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ بیمار ہو کر وہ نیرو سے علاج کرانا چاہتا ہے۔ مگر وہ بھی ممکن نہیں ہو پاتا۔ آخر کار اس کی موت ہو جاتی ہے۔ اس طرح نامدیو محبت کی خاطر زندگی گزارتا ہوا اس دنیا سے گزر جاتا ہے۔

نامدیو کے کردار کو پُر قوت بنانے کے لئے جہاں گوبند، گلشن، کرم دیو، ہربنس، ہر جیت جیسے مرد کردار تخلیق کیے گئے ہیں، وہیں آرتی، کلپنا، آشا اور ساوتری سے حسب رشتہ تعلق نے اسے مضبوط اور محبت کا راہی بننے میں معاونت کی ہے۔ اس معاشرے میں رجو اور گورجاں کی کمی نہیں ہے جو ہر موقعے پر اپنی موجودگی دکھانا ضروری سمجھتی ہیں۔

آنند لہر نے آرتی کی زبانی اس ناول کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ یہ تکنیک قاری کو متاثر کرتی ہے۔ آرتی محبت کے فلسفے اور زندگی کے نظریے کو واضح کرتے ہوئے بھی چلتی ہے اور نامدیو کی ذہنی کشمکش اور نفسیات کا اظہار یہ بھی بہ آسانی سامنے آ جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"...... نہ جانے نامدیو کس طرح کا شخص تھا اور اس کا دل بھی

عجیب تھا جو کئی خانوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک خانے میں نیرو رہتی تھی دوسرے میں نیماں، تیسرے میں آشا اور چوتھے خانے کے اندر طوطا رہتا تھا اور پھر کسم تو اس کے لہو کے اندر بسی ہوئی تھی۔''

(ص:۱۲۰)

''......یہاں ہر کوئی قید ہے۔ کوئی خوبصورتی میں، کوئی بدصورتی میں، کوئی پاپ میں تو کوئی پُنیہ میں۔''

(ص:۳۹)

''......زندگی کی حقیقت یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی انسان اپنے گناہوں کا بھار دوسرے پر اس طریقے سے لاد دیتا ہے کہ دوسرے کو معلوم ہی نہیں ہوتا اور دوسرا اسے پنیہ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

(ص:۶۴)

''......مت رو بیٹا، مت رو، یہ مرتیولوک ہے، یہاں مرنے کے لئے لوگ پیدا ہوتے ہیں اور پھر پیدا ہونے کے لئے ہی مرتے ہیں۔''

(ص:۹۴)

محبت اور حسن آنند لہر کے ناول میں مثل ستارے ٹنکے ہوئے ہیں۔ اس سے فنکار کی فطری حس اور جذبۂ احسن کا علم ہوتا ہے ملاحظہ کیجئے:

''......ایک دن نامدیو نے گلشن سے کہا'' گلشن محبت ایک ندی ہے جو ایک ہی وقت میں اپنے منبع سے نکلتی رہتی ہے اور چلتی بھی رہتی ہے اور اس کا پانی سمندر میں ملتا بھی رہتا ہے۔'' مگر گلشن نے اس سے کہا'' زندگی چلتی رہنی چاہئے اور اِسے اپنے مطابق ہی چلتے رہنے دینا چاہئے۔''

(ص:۱۰۵)

''......ساوتری ایک نہایت ہی خوبصورت عورت تھی۔ پتلی، لمبی جس رنگ کی ساڑی پہنتی اُس کا چہرہ اُسی رنگ کا دِکھائی دیتا تھا۔ ....ساوتری کے ہاتھ انتہائی خوبصورت تھے اور ہاتھوں کی انگلیاں بھی لمبی تھیں اور ان کی ترتیب پھول کی پنکھڑیوں سے ملتی جلتی تھی۔ جیسے پھولوں کی پنکھڑیاں چھوٹی بڑی ہو کر پھول کو سجاتی ہیں اسی طریقے سے ساوتری کی

انگلیاں بھی چھوٹی بڑی ہو کر اس کے ہاتھوں کو سجاتی تھیں.......''

(ص:۲۱۔۲۰)

''......آرتی ہمیشہ کہتی رہتی ''پپا، محبت کرنا سیکھو اور جب تم محبت کرنا سیکھ جاؤ گے اور اس سمندر میں تیرنا شروع کر دو گے تو تمہیں ہمیشہ لگے گا کہ محبت ایک وقت میں اپنی بیٹی بیٹے، خاوند، بیوی اور رشتوں سے بھی کی جا سکتی ہے۔ محبت کا آپس میں کوئی بھی ٹکراؤ نہیں ہے بلکہ یہ اپنا آنچل پھیلاتی رہتی ہے۔

(ص:۴۲)

'نامدیو' میں علامات کا بھرپور استعمال آنند لہر نے کیا ہے۔ بطور خاص انسانی زندگی اور جنس کی نفسیات کے معاملے میں انہوں نے کپڑوں کے کترن، گیند، لیر، رنگ برنگے لباس کے کترن، انگلی کا کاٹنا اور اس پر کترن کا لپیٹنا، کپڑوں کے گیند بنانا، اس پر ہٹیں لگانا پھر گیند کے تمام دھاگوں کو الگ کرنا وغیرہ سے ایک خاص فضا سازی ہوتی ہے جو نفسیات پر ان کی گہری نگاہ کو درشاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے ایک دو مثالیں:

'' رنگ برنگے کپڑے، کئی رنگوں کے کپڑے، خوبصورت کپڑے۔ نامدیو گلشن کی دوکان پر بیٹھ کر خوبصورت سوٹ بھی دیکھتا اور کپڑوں کو بھی دیکھتا۔ پھر گلشن اُن کپڑوں کو قینچی سے کاٹ کر سوٹ کے لئے تیار کرتا۔ نامدیو کی سوچ بڑھنے لگی۔ اُسے لگنے لگا کہ شاید کائنات کا مالک بھی اسی طریقے سے زندگی کو کاٹ کر خوبصورت بدن تیار کرتا ہے۔ لیکن بچی ہوئی زندگی کی لیریں کہاں جاتی ہیں۔

جوں ہی یہ سوال اُس کے دل میں پیدا ہوتا وہ کپڑوں سے الگ ہوئیں لیروں کو اکٹھا کر لیتا اور ایک گیند بنا دیتا اور پھر اُس گیند کو خوب ہٹیں لگاتا۔''

(ص:۹۴)

مذکورہ تمام باتیں آنند لہر کے ناول نامدیو کے محتویات میں ہیں۔ اس گفتگو کے پیش نظر اہم بات یہ ہے کہ ایک ایسا منتر اس ناول کی وجہ تخلیق ہے جسے پیروں فقیروں رشیوں اور فنکاروں نے نہ صرف اپنایا بلکہ اس کو پھیلانے میں خوشی محسوس کی ہے۔ وہ منتر ہے ''اصل خوشی دوسروں کو خوش دیکھنے میں ملتی ہے۔'' آنند لہر مبارک باد کے قابل ہیں جنہوں نے ایک ایسا موضوع چنا ہے جس کی وسعت بیکراں ارض و سماں سے بھی زیادہ ہے۔

جموں کشمیر کا اہم فکشن نگار: آنند لہر

ایم. قدیر مہتاب (راجوری)

سرزمین جموں کی ایک ادبی پہچان دورافتادہ ضلع پونچھ سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار آنندلہر ایک پرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ اس سرزمین کے باشندے ہیں جس سے کرشن چندر، ٹھاکر پونچھی، کشمیری لال ذاکر اور چراغ حسن حسرت جیسے شہرہ آفاق ادیبوں اور فنکاروں کی وابستگی رہی۔

شیام سندر آنند جو ادبی دنیا میں آنندلہر کے نام سے مشہور ہیں۔ ۲/جولائی ۱۹۵۱ء کو پونچھ کے مردم خیز علاقے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شری بلراج آنند تھا جو محکمہ مال سے وابستہ تھے اور والدہ محترمہ کا نام سمتری دیوی تھا۔ آنندلہر نے مینڈھر کی نیلم آنند سے شادی کی۔ ان کے بطن سے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بڑے بیٹے کا نام اکشے کمار آنند تھا جس نے جموں یونیورسٹی سے .L.L.B کی سند حاصل کی جن کا اچانک ۱۸/جنوری ۲۰۱۱ء کو انتقال ہو گیا۔ ان کے چھوٹے بیٹے کا نام سدھارتھ ناتھ آنند ہے۔ یہ انجینئرنگ کے طالب علم ہیں۔ ان کی چھوٹی بیٹی رونی آنند جن کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔

آنندلہر نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن میں ہی حاصل کی۔ ۱۹۷۲ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ سے .B.Sc اور بعد ازاں ۱۹۷۵ء میں کشمیر یونیورسٹی سے .L.L.B کر کے وکاوت کا پیشہ اختیار کر لیا۔

لہر صاحب طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر و ادب کے گرویدہ ہو گئے۔ ان کا تخلیقی سفر گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ سے شروع ہوا۔ انہوں نے اپنا پہلا افسانہ ۱۹۷۲ء میں ''پتھر کے آنسو'' کالج میگزین ''آئینہ'' کے لیے آنندلہر کے نام سے لکھا۔ جس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔

یہ ابتدائی ادبی کاوش کافی حوصلہ افزا ثابت ہوئی اور اس کے ساتھ ہی لہر صاحب کے اندر موجود تخلیق کار جاگ اٹھا۔ اس تیز گام ادیب نے بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا۔ اس وقت لہر صاحب ریاست جموں و کشمیر کے درجہ اول کے وکلا میں شمار ہوتے ہیں۔ جو ہائی کورٹ کے علاوہ سپریم کورٹ

میں بھی مقدمے لڑتے ہیں۔

اعلیٰ ظرفی اور شرافت ان کے چہرے سے عیاں ہے۔ غریب پروری، مذہبی رواداری، انسانی ہمدردی اور ادب دوستی کے اعلیٰ صفات ان کی شخصیت میں ایک خوبصورت نکھار پیدا کرتے ہیں۔ میری ملاقات ان کے بیٹے اکشے کمار آنند کے انتقال کے بعد تعزیت کی صورت میں ان کے گھر جنوری ۲۰۱۱ء میں ہوئی۔ ان کی صبر اور استقلال کی مثال یہ تھی کہ ایک طرف لخت جگر کا ہمیشہ کے لیے بچھڑنا اور دوسری طرف منشائے الٰہی کہہ کر اپنے زخم پر مرحم لگانا۔ شاید میر تقی میر کا یہ شعر ان کے زخم پر مرہم کر کام کرتا ہو۔

ہوا ضبط سے مجھ کو ربط تمام　　　لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام

یا علامہ اقبال کا یہ شعر۔

کھل نہیں سکتی شکایت کے لیے لیکن زباں　　　ہے خزاں کا رنگ بھی وجہ قیام گلستاں

ضبط، برداشت، صبر، عاجزی اور انکساری کی زندہ جاوید مثالیں ان کی شخصیت میں ہمہ وقت دیکھی جاسکتی ہیں۔ جب وہ وکالت کا کام کرتے ہیں تو لگتا ہی نہیں کہ وہ ایک مقبول تخلیق کار بھی ہیں۔ اور جب ادبی اسٹیج پر جلوہ افروز ہوتے ہیں تو اس وقت ان میں وکیلوں والی کوئی نشانی تک نظر نہیں آتی۔ مگر حق تو یہ ہے کہ وہ بیک وقت بہت اچھے قانون دان اور بہترین ادیب ہیں۔

ان کی اب تک گیارہ تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں جن کے نام بالترتیب اس طرح ہیں۔

۱	نروان	(مختصر ڈرامے)	۱۹۸۸ء
۲	تپسوی کون	(طویل ڈرامے)	۱۹۹۴ء
۳	اگلی عید سے پہلے	(ناول)	۱۹۹۷ء
۴	سرحد کے اس پار	(افسانوی مجموعہ)	۲۰۰۱ء
۵	انحراف	(افسانوی مجموعہ)	۲۰۰۲ء
۶	سرحدوں کے بیچ	(ناول)	۲۰۰۴ء
۷	مجھ سے کہا ہوتا	(ناول)	۲۰۰۵ء
۸	کورٹ مارشل	(افسانوی مجموعہ)	۲۰۰۶ء
۹	سرحدیں	(ریڈیائی ڈرامے)	۲۰۰۶ء
۱۰	یہی سچ ہے	(ناول)	۲۰۰۸ء
۱۱	بٹوارہ	(افسانوی مجموعہ)	۲۰۰۹ء

اس کے علاوہ ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' کا ترجمہ انگریزی میں ''گلبدن'' کے نام سے ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ اور ''سرحد کے اس پار'' کا ترجمہ ہندی میں ''سیمہ کے اس پار'' کے نام سے ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔ مصنف کی ساری کتابیں پڑھ کر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ بہت کم لفظوں میں بڑی بڑی باتیں تحریر کرنے کے فن پر کافی دسترس رکھتے ہیں۔

کوئی کہانی یا افسانہ پڑھتے ابھی پوری تسلی بھی نہیں ہوتی کہ وہ کہانی یا افسانہ اپنے انجام کو چھولیتا ہے اور یہی تخلیق کار کا فنی کمال بھی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ لہر صاحب دور حاضر کے عدیم الفرصت اور سہل انگار انسان کی تن آسانی کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھتے ہیں اور یہی وقت کی اشد ضرورت بھی تو ہے۔

انہیں یہ بھی فخر حاصل ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں تجریدی اور علامتی افسانے لکھنے والوں میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے افسانوں میں واقعات کی ترتیب، پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کے روایتی ارتقاء کے بجائے منتشر واقعات وخیالات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔

انہوں نے اپنی کہانیوں میں نہ صرف شہری بلکہ دیہاتی زندگی کے رسم و رواج، رہن سہن اور دیگر مسائل، تجربات، مشاہدات، نفسیات اور احساسات کے ساتھ گہرے معاشرتی شعور کے ساتھ برتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں سیاسی اور سماجی نظام کی کمزوریوں اور عصری صداقتوں کو تخلیقی جامہ پہنا کر پیش کیا ہے۔

آنندلہر نے جہاں اپنے افسانوں میں مردوں کی نفسیاتی خواہشات، خود غرضی، مادیت پسندی کو موضوع بنایا ہے، وہیں عورتوں کے مسائل، جذبات، جنسی استحصال اور نفسیات، ان کی نامرادی، درد اور قربانی کو کھل کر ابھارا ہے۔ ان کی عام فہم زبان میں چاشنی، شگفتگی اور مٹھاس ملتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تجریدی، لایعنی، اینٹی ناول نہ صرف تخلیق کیے بلکہ اپنا لوہا بھی منوایا۔ اسی طرح اپنے ڈراموں کے پس منظر میں دنیا، انسان، انسانی سوچ وعمل اور انسانی سماج جس میں رہنے والے ہر فرد وبشر دکھ درد، مصیبت، بیماری اور پریشانی سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔

آنندلہر فکشن کے افق کی اہم آواز ہیں عدالتی مصروفیتوں اور قانونی موشگافیوں سے وقت نکال کر اپنی تخلیقی قوتوں اور ادبی کاوشوں کو بروئے کار لا کر تواتر سے پروش لوح وقلم کرنا بہت بڑی بات ہے۔ دوسری طرف پیشہ کی نکتہ ریزیاں اور عملی زندگی کی ہنگامہ آرائیاں ان کی تخلیقات میں در نہیں آتیں۔ یہ ضرور ہے کہ وکالت نے ان کے ذہن کو تجرباتی بنا دیا ہے۔

آنندلہر میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جن کی بنا پر ایک فنکار جلد ہی فن کی انتہائی بلندیوں

کو چھو لیتا ہے۔لہر صاحب نے اتنی ترقی کی کہ مختلف انعامات سے بھی نوازے جا چکے ہیں۔ان کا یہ تخلیقی عمل جاری وساری ہے۔دعا ہے کہ آنند لہر اپنا تخلیقی سفر اسی سرگرمی سے جاری رکھیں اور مستقبل میں بھی اپنے فن پاروں کے ذریعہ معاشرے کو فلاحی اور تعمیری نظریات سے فیضیاب کرتے رہیں اور نئی نسل کو بھی ان کے تخلیقی سرمایہ سے فکر و آگہی کی دولت نصیب ہو۔وہ بقول علامہ اقبال ''سوئے قطاوں کشسم فاقہ بے زمام را'' کے مقدس عمل میں کامیاب و سرخرو ہوں جوان کے فن اور زندگی کی منزل مقصود ہے۔

جموں و کشمیر اور پورے ہندوستان میں اردو زبان و ادب کو اس کا جائز مقام
و مرتبہ دلانے کی جد و جہد میں سرگرم عمل

تحریک بقائے اردو

Farooq Shah Bukhari (Founder)
09419170752

Head Office:
Ward No. 9, Rajouri-185131 (J&K)

Branches:

Irfan Arif (President)
R/o W. No. 7, H.No. 75, Kama Khan, Tehsil Haveli, Poonch-185101 (J&K)

Jawed Anwar (Senior Vice President)
Urdu Ashiana, 167, Afaq Khan ka Ahata, Manduadeeh Bazar,
Varanasi-221103 (U.P.)

Mohammad Azeem Husain (Distt. President Mumbai M.S.)
Ideal Offshore & Interior Works
Agadi Industrial Gala No. 5, Subhash Road, Jogeshwari (E),
Mumbai-400060 (M.S.)

Usman Jauhari (Disst. President Jalgaon M.S.)
"Ashiana" Happy Home Colony, Auto Nagar, National Highway,
Jalgaon-425001 (M.S.)

Mannan Faraz (Distt. President Jabalpur M.P.)
199, Badi Omti, Bhartipur, Jabalpur-482002 (M.P.)

پتھر پتھر آئینہ

(ناول)

وحشی سعید

کنوارے الفاظ کا جزیرہ

(افسانے)
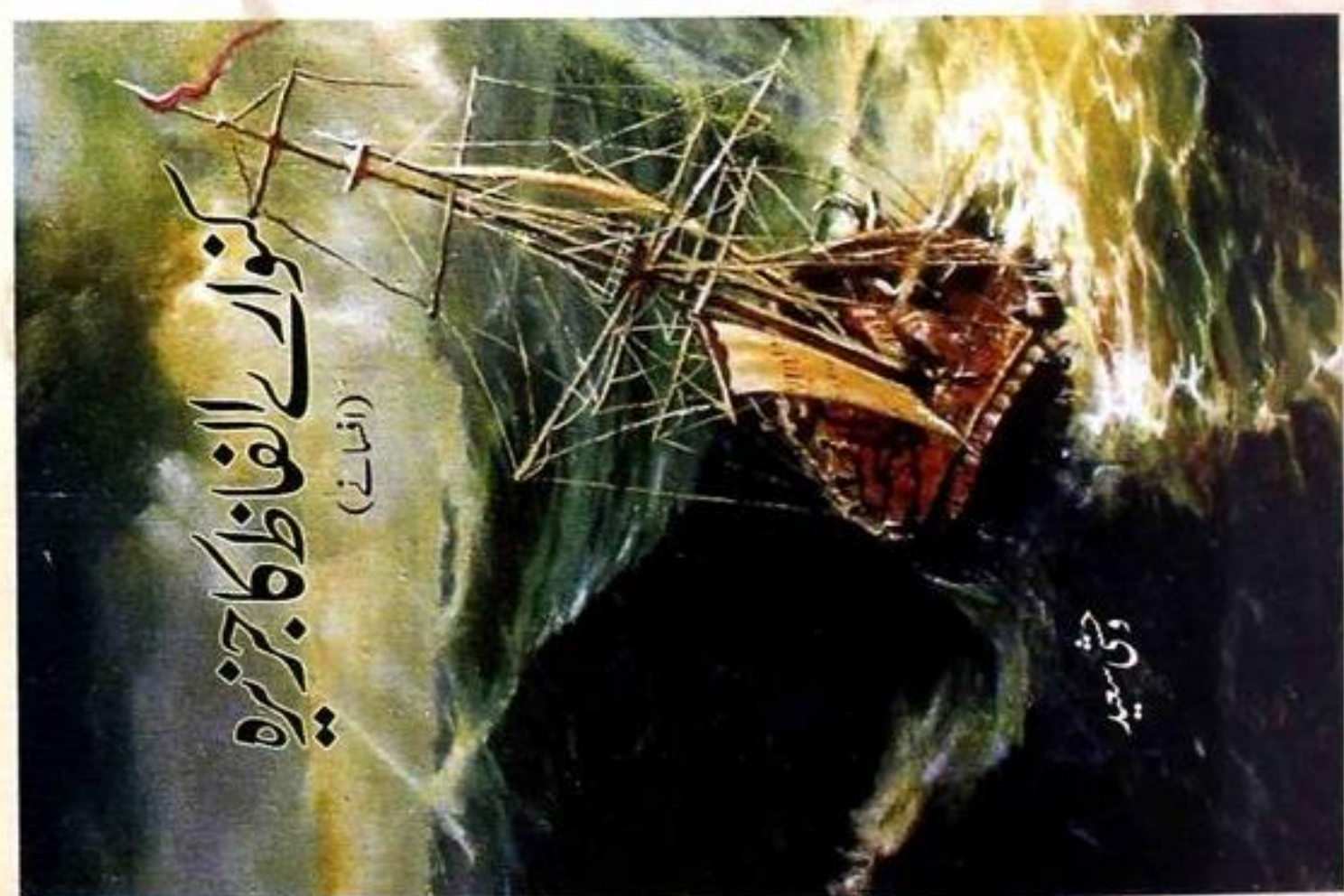
وحشی سعید

اپنا عکس اپنا آئینہ

وحشی سعید (سرینگر)

۹ بجے رات!

اس یگ کے آخری سال کے آخری صفحے کا آخر لفظ قلمبند ہو گیا۔

عکس آئینہ میں چھپ گیا۔

ایک قد آور شخصیت کا عکس مرے ہاتھوں سے نکل کر آئینہ میں چھپ گیا۔ پانچ سال تک اس عکس کو اپنے آپ میں ڈھونڈ تا رہا۔

آئینہ نے کہا ''تمہارا عکس مجھ میں جذب ہو گیا۔ لیکن تمہاری انا.....!''

آئینہ کے اس جواب کے بعد میں انا ڈھونڈ تا رہا۔

میری پہچان کیا ہوگی۔

میں اپنی تاریخ خود قلمبند کراؤں گا۔

آنے والی پیڑھیوں کے لیے بے شمار محبت وراثت میں چھوڑ کے جاؤں گا۔ یہ میرا اقبال جرم ہے۔

اپنا عکس اپنے آئینے میں چھپالوں گا۔

بیتے ہوئے یگ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ایک قد آور شخصیت نے اپنوں کے لیے اپنی پوری قوم کو یرغمال بنا دیا۔

اس یگ کے لوگ اسے یگوں پوجتے رہے اور اس کی ہر بات کو فرمان سمجھتے رہے۔ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے سادہ لوح لوگ۔ جو یہ نہ سمجھ پائے کہ فرد واحد کے لیے وہ قربان ہو رہے تھے۔

فرد واحد نے پرستاروں کی ایک ایسی مقدار چھوڑی جن کے لیے وہ ان کا ایمان تھا۔ یہ جانتے ہوئے اس فرد واحد نے ایک پوری قوم انا کی سولی پر قربان کر دی۔

ایسے ہی ہوشیار اپنی چھوٹی سی دنیا انا کے لیے فنا کر دیتے ہیں۔ اور ایک ایسی تاریخ اپنے

وارثوں کے لیے اپنے پیچھے چھوڑتے ہیں جس میں عدوات، بغض حسنہ، دشمنی پلتی بڑھتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے وارثوں کے لیے اچھا کرتے ہیں۔ اور انا کا سب سے دردناک پہلو یہی ہے۔ ایسا فرد واحد انا کو اپنی ذات سے بالاتر سمجھتا ہے۔ وہ مان لیتا ہے کہ وہ دانش ور ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اپنے اگلے یگوں کو دیکھ رہا ہے۔

یہی ان کی مات ہوتی ہے۔

انا ایک ایسا اندھیرا ہے جہاں ہر روشن چیز کالی نظر آتی ہے۔ قوموں کو تباہ کر کے رکھتی ہے۔ خاندانوں کو ملیا میٹ کر دیتی ہے۔

ایک دردناک رات۔

ایک یگ سمٹ گیا۔

اگلے یگ کے لوگوں کو پچھلے یگ کا وہ بوجھ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے سروں پر اٹھانا پڑے گا.....!

تمام عمر آخری سانس تک۔

ایک المیہ کی رات تھی!

اس رات نے ایسے ان گنت نشان چھوڑے جو اگلے یگ پر خوں ریز داستان رقم کرے گی۔

ہم کم ظرفی کے اس عالم میں مست ہیں جہاں اپنے اوپر کیے ہوئے ان گنت ظلموں کا حساب نہیں رکھتے۔ کیا ہم بھی کسی انا کے شکار ہیں۔

۱۷ فروری ۲۰۰۷ء

کیا یہ وہ رات نہ تھی جو سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی انا سے اوپر اٹھو۔
عکس بھی مکمل ہوا، آئینہ بھی صاف ہو گیا۔
اپنا عکس اپنا آئینہ۔

میٹھا چشمہ اور میں

مجھ سے میرے جاننے والے کہتے ہیں کہ میں نے اپنی پہچان مسخ کر دی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ تم بھی کسی زمانے میں ہمارے وہ ساتھی ہوا کرتے تھے جو ان راستوں سے گذرتے تھے جو کانٹوں سے بھرے ہوتے تھے۔ اب تم دودھ سے نہاتے ہو اور اطلس سے اپنے بدن کو سجاتے ہو۔ ہیرے جواہرات سے انگلیوں کو سنوارتے ہو۔ کروڑوں کی گاڑی میں گھومتے ہو۔ افسوس تم کو کانٹوں سے بھرے راستے راس نہ آئے۔ تم نے کاغذ پر کتنے بت تراشے، کہاں گیا وہ تخلیق کار!

وقت کے تھپیڑوں نے، زر کی چمک نے تمہاری سوجھ بوجھ تم سے چھین لی تم جادوئی نگر کے باشندہ بن گئے، ہر جادوئی چیز کو سچ ماننے لگے۔ اور اپنی آنکھوں اس سختی کے ساتھ بند کر کے رکھا تاکہ تمہارے آنکھوں سے تمہارا خواب کوئی نہ چرالے۔

خوابوں میں رہنے والے کم ظرف جاگو!

اس المناک رات کے چار بجے!!

اس رات پینتالیس سالہ وہ آدمی جو خود کو بچہ سمجھتا تھا، اچانک بوڑھا ہو گیا۔ جادوئی نگر، جادوئی چیزیں تتر بتر ہوگئی۔ خوابوں کی دنیا سے اس کو بہت دور پھینکا گیا۔ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں وہ اس قدر مست تھا کہ اسے احساس نہ ہوا کہ اس کے پاس جو میٹھا چشمہ تھا وہ کتنا دور چلا گیا۔ وہاں جہاں تک اس کی رسائی نہیں تھی۔

وہ المناک رات! خوفناک حقیقت!!

اس رات کے بعد ہر رات وہ آنکھوں میں کاٹتا رہا۔

ایک مقدس آواز سرگوشیوں میں کہتی تھی۔

"بیٹا اٹھ ابھی تمہیں بہت لمبا راستہ طے کرنا ہے۔"

راستہ لمبا ہے، وقت کم ہے۔ میری آنکھوں کے آنسو بھی سوکھ گئے۔

میں پیاسا ہوں۔ میٹھا چشمہ مجھ سے بہت دور ہے!

بہت دور ہے!!

عجب پریم کہانی

عجب پریم کہانی کے بانکے نوجوان نے جب حسینہ کو دیکھا تو بے ساختہ بول پڑا۔

'تم جیسا کوئی نہیں.....!'

حسینہ نے اپنے آوارہ بالوں کو اپنے چہرے سے ایک ادا کے ساتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

'تمہارا ابھی جواب نہیں.....!'

اس شہر کے لوگوں نے اس عجب پریم کہانی کو پروان چڑھتے ہوئے دیکھا۔

گواہ بن گئے ان کی پریم کہانی کے لہلہاتے ہوئے کھیت، بل کھاتی ہوئی ندیاں، مسکراتے ہوئے پھول، گنگناتے ہوئے پرندے، آسمان سے باتیں کرتی ہوئی پہاڑیاں۔ اس شہر کا ہر باشندہ اس پریم کہانی کا حصہ بن گیا تھا۔

اچانک اس شہر کو ایک کالی آندھی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ آناً فاناً سنسناتی ہوئی گولیوں نے شہر کی خاموشی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اس کی سرزمین لہولہان ہوگئی۔ ایک گولی نوجوان کے سینے کو پار کرگئی۔ اس کے نیم مردہ جسم کو گاڑی کے اندر ایسے پھینکا گیا جیسے کسی مردہ جانور کو!

حسینہ نے جب اپنی پریم کہانی کو اپنی آنکھوں کے سامنے راکھ ہوتے دیکھا تو یہ صدمہ برداشت نہ کرسکی۔ غش کھا کر بے ہوش ہوگئی۔ اس کالی رات کو آسمان بھی رویا۔ اس واقعہ کے تیس سال تک وہ شہر غم میں ڈوبا رہا۔

تیس سال کے بعد سنہری دھوپ میں ایک ادھیڑ عمر کی ایک پرکیف شخصیت اس شہر میں وارد ہوئی۔

وہ ایک مشہور و معروف ڈاکٹر تھا۔ اور اس شہر کی ایک رحم دل عورت کے بلاوے پر آیا تھا۔ رحم دل عورت نے ایک بیمار بچے کے علاج کے لیے اسے بلایا تھا۔ جو موت اور زندگی کی لڑائی لڑ رہا تھا۔

ڈاکٹر نے معصوم بچے کا معائنہ کیا اور اپنے ارد گرد ڈاکٹروں کی ٹیم سے بولا۔

'کیس مشکل ہے، بہت مشکل!!'

ایک نوجوان ڈاکٹر ادھیڑ عمر ڈاکٹر سے بولا۔

'آپریشن تو ہوگا؟'

'آپریشن ضرور ہوگا لیکن پہلے کچھ ٹیسٹ کرنے ہوں گے۔''

دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔

'سر! آپ کے اعزاز میں میڈم نے اپنی حویلی میں آج شام ایک پارٹی رکھی ہے۔ میں آپ کو شام کو حویلی لینے آؤں گا۔'

ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ 'ٹھیک۔'

اس خوبصورت شام شاندار حویلی میں جگمگاتی ہوئی روشنیوں میں ڈاکٹر نے میڈم کو دیکھا تو کچھ دیر کے لیے ہکا بکا رہ گیا۔ اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ بول پڑا۔

'حسینہ'

میڈم بولی۔

'کیسے ہو ڈاکٹر صاحب! آپ کا سفر ٹھیک رہا۔'

'میں ٹھیک ہوں' ڈاکٹر نے کہا 'یقین نہیں آرہا۔'

'حقیقت کبھی کبھی یقین کو بھی دھوکہ دے جاتی ہے۔'

ڈاکٹر بولا۔

'ہاتھ میں ہاتھ، تیس سال کا وقفہ ایک لمحے میں تبدیل ہوگا۔'

حسینہ بولی۔

'ہم وہاں کھڑے ہیں جہاں سمندر بیچ میں ہے۔'

وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت دیر تک دیکھتے رہے۔

وقت جیسے ٹھہر گیا۔ حسینہ نے اپنے آپ کو اس کیفیت سے دور کیا۔ وہ بولی۔

'میرا بچہ۔'

ڈاکٹر نے پوچھا 'تمہاری شادی کب ہوئی۔'

حسینہ بولی 'شادی کا خیال نہ دماغ میں آیا نہ دل میں۔'

'یہ بچہ۔'

'یہ بچہ میرا ہے' حسینہ نے کہا 'اور تمہاری شادی۔'

'ہاں! اب وہ اس دنیا میں نہیں۔'

'کوئی اولاد' حسینہ نے معلوم کیا۔
'ہاں..... بیٹی۔'
'کہاں؟'
'معلوم نہیں۔'
'ایسا کیوں؟'
ڈاکٹر بولا۔
'وہ سمجھتی ہے کہ میں نے اس کی ماں کو وہ پیار نہیں دیا جس کی وہ حقدار تھی۔'
'کیا وہ غلط تھی۔'
'نہیں وہ صحیح تھی۔'
'شادی کیوں کی؟'
'بھول۔'
'تمہاری بھول کی سزا دوسرا کیوں بھگتے۔'
'اب میں بہت آگے نکل چکا ہوں۔'
'اور اپنے قدموں کے نشان چھوڑتا جارہا ہوں۔'
'تمہاری بیٹی کہاں ہے، کس حال میں ہے؟'
کسی نے کہا اس نے شادی کی..... اطلاع نہیں دی۔
'کیا تم وہی ہو جو مجھ سے ملتے رہے' حسینہ کی آواز میں مایوسی ٹپکتی تھی۔
ڈاکٹر حسینہ کے چہرے کو تکتا رہا۔
'خیر......! میرا بچہ میری دنیا ہے۔'
ڈاکٹر نے کہا 'سخت بیمار ہے۔'
حسینہ دردناک آواز میں بولی۔
'ڈاکٹر میرے بچے کو بچالو۔ یہ تمہارا احسان ہوگا۔'
اس طویل ملاقات کے بعد ڈاکٹر اپنے ہوٹل کے کمرے میں آیا۔ وہ خود کو بھاگتے ہوئے وقت کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ نینداس کی آنکھوں سے غائب ہوگئی۔
وقت کے تھپیڑوں نے حسینہ کو بدل ڈالا۔ ڈاکٹر نے خود سے کہا۔
'یا میں خود بدل گیا ہوں؟'

ڈاکٹر بچے کے علاج میں دن رات ایک کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کو یہ نہ معلوم پڑتا کہ کب رات ہوئی کب دن شروع ہوا۔ پھر وہ دن آیا جب بچے کا آپریشن ہوا۔ حسینہ آپریشن تھیٹر کے سامنے گھنٹوں کھڑی رہی۔ حسینہ نے بچے کو آپریشن سے پہلے خوب پیار کیا اور ڈاکٹر سے کہا۔

'میں اپنے بچے کو تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔'

'دعا کرو۔'

سات گھنٹے کے طویل آپریشن کے بعد جب ڈاکٹر تھیٹر سے باہر آیا حسینہ اس کی طرف دوڑتی ہوئی آئی۔ ڈاکٹر نے لرزتی آواز میں کہا۔

'بچے کی حالت نازک ہے۔'

حسینہ لڑکھڑائی، آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ نرس تھیٹر سے دوڑتی ہوئی آئی۔

'ڈاکٹر..... بچے کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'

ڈاکٹر دوبارہ جب آپریشن تھیٹر سے واپس نکلا اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

'مجھے افسوس ہے میں بچے کو بچا نہ سکا۔'

حسینہ کی آنکھوں کے آنسو جذب ہو گئے۔ وہ بت کی طرح کھڑی رہی۔

اس شام بچے کو سپرد خاک کیا گیا۔

ڈاکٹر اس شام ہوٹل کے کمرے میں خود کو کوستا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ میں نے کہاں غلطی کی۔

وہ اپنے آپ سے بولا۔

'حسینہ کی خواہش بھی پورا نہ کر سکا۔'

اگلے دن وہ حویلی گیا۔ حسینہ اپنے کمرے میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ تین دن تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ چوتھے دن ڈاکٹر واپس اپنے شہر جانے کے لیے ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ آدھا راستہ طے ہوا جب اس نے ڈرائیور سے کہا۔

'حویلی کی طرف گاڑی موڑ لو۔'

حسینہ حویلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی بچے کی تصویر کو تک رہی تھی۔ حسینہ نے جب ڈاکٹر کو آتے ہوئے دیکھا تو کہا۔

'ڈاکٹر صاحب آیئے۔'

'کیسی طبیعت ہے؟'

'یوں لگتا ہے تین صدیاں گذر گئیں۔' کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد وہ بولی۔

'مجھے آپ کو حقائق سے دور نہیں رکھنا چاہیے۔'
حسینہ رک گئی اور پھر سوچوں کی دنیا میں کھوگئی۔
ڈاکٹر بول پڑا 'کون سے حقائق۔'
'صبح سویرے میری آنکھ لگ گئی۔ میرے خوابوں میں ننھا فرشتہ آیا۔ وہ مجھے کہنے لگا ڈاکٹر کا حق ہے کہ وہ حقیقت جانے۔'
ڈاکٹر پھر بول پڑا 'اب کیا فیصلہ کیا؟'
حسینہ نے ڈاکٹر کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے کہا۔
'تمہاری بیٹی اور تمہارا داماد ایک بھیانک حادثے کے شکار ہوگئے۔ تمہاری بیٹی کا شوہر موقعے پر فوت ہوگیا تمہاری بیٹی کو نزدیک کے اسپتال میں لایا گیا۔ اس اسپتال سے مجھے فون آیا کہ تمہاری بیٹی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی ہے اور مجھے ڈھونڈ رہی ہے۔ یہ سب کچھ میرے باعث پریشانی اور حیرانی کا معاملہ تھا۔ بہر حال میں اسپتال چلی گئی۔' حسینہ کچھ دیر خاموش رہ کر پھر بولی۔
'آپ کی بیٹی زندگی کے آخری لمحوں میں مجھ سے بولی۔'
'حسینہ میں تمہاری بے حد شکر گزار ہوں کہ تم آگئی۔ میں اور میرا شوہر تم سے ملنے آرہے تھے لیکن یہ حادثہ ہوگیا۔ میں تم کو اس لیے دیکھنے آرہی تھی کہ میرے باپ نے کس عورت کے لیے میری ماں کو تمام عمر اپنی محبت کے لیے ترسایا۔ میرا باپ ایک پل تم سے جدا نہیں رہا۔
پھر وہ رک رک کے بولی۔
'میری آخری خواہش پوری کروگی۔'
میں نے کہا۔
'بول میری بچی بول!'
'میرے باپ کو نہ معلوم ہو کہ میں اس دنیا میں نہیں ہوں اور میرے بچے کو اپنے زیر سایہ رکھنا۔ تمہارا اکرم ہوگا۔'
'میری بچی یہ تم نے مجھ پر کرم کیا۔'
یہ سنتے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔
'کچھ دنوں کے بعد میں بورڈنگ اسکول سے بچہ لے آئی۔ وہ بچہ آج مجھ سے بہت دور چلا گیا۔ آپ کی بیٹی کو دیا ہوا وعدہ میں نبھانہ پائی۔'
حسینہ کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو گرنے لگے۔

'میرا پوتا..... میرا پوتا۔' ڈاکٹر پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔
پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔
دس دن کی علالت کے بعد ڈاکٹر کی حالت بہتر ہونے لگی۔ حسینہ نے دن رات ڈاکٹر کی نگہداشت کی۔ راتوں کو سوئی نہیں، دنوں کا پتہ نہ چلا۔ ڈاکٹر جب ہوش میں آیا تو حسینہ سے کہا۔
'تم نے میرے لیے اور میرے بچوں کے لیے بہت کچھ کیا! میں......'
حسینہ نے کہا۔
'چپ!.......... میں نے سب کچھ اپنے لیے کیا۔'
عجب پریم کہانی کا ڈاکٹر حسینہ کی آنکھوں میں سما گیا۔

لمبا آدمی چھوٹا قد

چھوٹے قد کے آدمی نے لوگوں کی بھاری تعداد کو مخاطب کر کے کہا۔

’جھنڈ میں سور آتے ہیں، شیر اکیلا آتا ہے۔‘

پھر چھوٹے قد کے آدمی نے ایک لمبے قد کے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’یہ وہ شیر ہے جو ہر بلا اور آفت کا مقابلہ کرے گا۔ اس قوم کا شیر اس قوم کی رہنمائی کرے گا اور قوم کو منزل مقصود تک لے جائے گا۔ ہمارے اس قد آور شیر میں جذبہ ہے ہمت ہے لگن ہے اور یہ سب کچھ اپنی قوم کو دینے کے لیے ہے۔‘

لوگوں کا ایک بڑا ہجوم کھڑا ہو کر ناچنے لگا۔

جن کے پاس شیر ان کو کیا پرواہ۔

وقت کے سیلاب نے تاریخ کے ایسے صفحے لکھے کہ وہ چھوٹے قد کا آدمی جو کسی زمانے میں لمبے قد کے آدمی کی آنکھیں تھا کان تھا اور دماغ۔ گم ہو کے رہ گئے۔

پھر وہ چھوٹے قد کے آدمیوں کے سامنے کھڑا ہوا اور دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

سنو بھائیو! میرا سر قلم کر دیا گیا، میری آنکھوں کی بینائی، سرخ انگارے جیسی سلاخوں سے چھین لی گئی۔ میرے کانوں میں شیشہ ڈالا گیا۔ میرا دماغ مجھ سے علیحدہ کیا گیا۔ میں.....! اندھا ہوں بہرہ ہوں میری سوچ مجھ سے الگ کی گئی۔

کسی نے کہا۔

’یہ سب ہوا اور ہمیں خبر تک نہیں......!‘

چھوٹے قد کے آدمی نے کہا۔

’کیا تمہیں معلوم نہیں شیر کے حواری شیر کی کھال پہن کر شہر میں دندناتے ہوئے گھوم رہے ہیں۔‘

اس آدمی نے کہا۔

’اچھا مذاق کر رہے ہو۔ تم شیر کی روح ہو۔ روح کیسے جسم سے الگ ہوگی۔ بے جان جسم

مٹی کا خول نہیں رکھتا۔'

چھوٹے قد کے آدمی نے کہا۔

اس مٹی کے پتلے کو آپ لوگ پوجتے ہو۔ یہ اس قوم کی کمر ہے۔'

پھر اس آدمی نے کہا۔

'کیا تم اس قوم کا حصہ نہیں ہو؟'

چھوٹے قد کے آدمی نے کہا۔

'اس حقیقت سے کب انکار!'

پھر اس آدمی نے کہا۔

'یہ سب ہونے کے باوجود تم نے کب اس قوم کے بارے میں سوچا۔'

چھوٹے قد نے غصہ سے کہا۔

'میں نے چاہا تھا زہر ہلاہل زہر کاٹ دوں لیکن......'

آدمی نے کہا۔

'اب کیسا پچھتاوا؟'

چھوٹے قد آدمی نے کہا۔

'اس لیے کہ میں اپنے پیچھے کوئی ایسی وراثت چھوڑے نہیں جا رہا ہوں جس کو یاد کیا جائے۔
وہ زندگی کے آخری لمحوں میں بہت رویا۔ لیکن اب بے سود۔ اس آوارہ گردی نے ایک معصوم کو یرغمال بنا دیا۔ اس نے اپنے آخری وقت میں کہا۔ آپ لوگوں کی عنایت ہوگی کہ مجھے یاد نہ کرنا۔

وہ صبح کب آئیگی

چلو!......چلو!!......چلو!!!

ایک نہیں......دو نہیں......دس نہیں......سب چلو۔ جوق در جوق چلو!

اپنے بچوں کو اپنے ساتھ لے چلو۔ وہ بھی تاریخ کا حصہ بننے جا رہے ہیں۔ لیکن خیال رہے کہیں اس بھیڑ میں نہ کھو جائیں۔

بھیڑ کے سامنے ایک وسیع میدان تھا۔ اس میں داخل ہونے سے پہلے ان مقبروں سے گذرنا ہوگا جہاں لاکھوں لوگ سوئے ہوئے ہیں۔ اس میدان کو پار کرنے کے بعد ہم ان ہواؤں میں سانس لینے لگیں گے، جو ان غموں کا مداوا ہوگی، نئی صبح کا ضامن ہوگی۔

یہ لوگ اس مٹی کی پیداوار ہیں جس کی جھیل کا صاف شفاف پانی ان کے اعمالوں سے غلیظ ہوگیا۔ جہاں کے سرسبز جنگل بھی ریگستان بن گئے۔ اب یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم سے نفرت نہ کرو کیونکہ نفرت ہم سے پشیمان ہو جائیگی۔ ہم پر ترس نہ کھاؤ کیونکہ ترس بھی ہزاروں سوال کھڑا کرے گی۔ ہم وہ ہیں جو اپنے بچوں کو اپنی خمیر سے خود واقف کرتے ہیں کیونکہ ہم اپنے آپ پر بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔

دور میدان میں کسی کونے سے آواز آئی۔

''ہوشیار......نظر پاک۔''

اس بھیڑ میں کچھ بونے بھی تھے، کچھ لنگڑے بھی تھے، اندھے بھی تھے، بہرے بھی تھے۔ روگی بھی تھے، ہر رنگ، ہر نسل کے لوگ۔ یہ سب دن کی روشنی میں کھلی آنکھوں سے خواب دیکھتے اور ان خوابوں کو پالتے اور خوابوں کے کیے ہوئے وعدوں پر یقین رکھتے۔

لوگوں کی اس بھیڑ کو یہ بھی یقین ہے کہ جو میدان پار کر جائے گا وہ ان ہواؤں میں سانس لیگا جو دکھوں کا مداوا ہوگی اور اسے نئی صبح دیکھنی نصیب ہوگی۔

ان خوابوں کا یہ المیہ ہے کہ لوگ اپنے آپ سے، اپنی ذات بہت دور ہوتے جا رہے ہیں۔ جادوگر کی طرح اپنی دنیا خود ہی سجاتے ہیں اور خود ہی اسے مٹاتے ہیں خود ہی بت کھڑا کرتے ہیں، خود ہی بتوں کو توڑتے ہیں۔

یہ لوگ گرمی میں ٹھنڈی ہواؤں کو یاد کرتے ہیں اور ٹھنڈ میں گرمی کو۔ خود اپنی دنیا بناتے ہیں، خود ہی اپنی دنیا کو تہس نہس کرتے ہیں۔

اس میدان میں ایک اونچے منبر پر سفید پوشاک پہنے ایک لمبے قد کا ایک آدمی لوگوں سے کہہ رہا تھا۔

''جو مجھ سے وفا کرے گا وہی میدان پار کرے گا''

میدان کے دوسرے کونے سے آواز آ رہی تھی۔

''ہوشیار......خبردار''

اس میدان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ جو میدان پار نہیں کرے گا وہ میدان میں ضم ہو جائے گا۔

میدان میں قیامت کا شور برپا تھا۔ ہر طرف آوازیں آ رہی تھیں۔ بھانت بھانت کی آوازیں۔ انسانوں کی، پرندوں، چرندوں کی۔

میدان میں کچھ لوگ ننگے اور آوارہ گھوم رہے تھے، لوگوں سے کہہ رہے تھے۔

'کھو جاؤ گے، پھر نہ ملو گے'

وہ لوگ جو یاقوت زمرد، الماس، چاندی اور سونے کو اپنا شفیق اور رفیق مانتے ہیں، عزیزوں کی موت پر روتے تھے، ننگے اور آوارہ لوگ ان سے کہہ رہے تھے۔

'آنسوؤں کو سنبھال کے رکھو، کسی اور دن کام آئیں گے'

میدان کو پار کرنے کی تگ و دو میں لوگ ایک دوسرے کو دھکیلنے میں بھی لگے ہوئے تھے۔ کوشش یہ تھی کہ ایک دوسرے سے سبقت لے جائے تاکہ وہ ان ہواؤں میں سانس لے جہاں غموں کا مداوا ہو گا۔

'ہوشیار......غرض مند ہوشیار'

اس آواز کو لوگ ان سنی کر دیتے کیونکہ غرض میں آدمی اندھا بھی ہو جاتا ہے اور بہرہ بھی۔

لوگوں کی بڑی تعداد بے تحاشا دوڑ رہی تھی نہ دائیں دیکھ رہی تھی نہ بائیں۔ بس ایک دھن سوار تھی کہ وہ ان ہواؤں کو اپنی سانسوں میں اتار لے جو ان کے غموں کا مداوا کر سکے۔

اس دوڑ میں وہ ان عزیزوں کی قبروں کو بھی روندتے جا رہے تھے جن کے لیے وہ کبھی روئے تھے۔

کچھ لوگ مقصد کے بہت قریب پہنچ گئے، ان کے چہروں پر شادمانی جھلک رہی تھی۔

یکا یک کہیں سے ننگے، بے حال لوگوں کا جھنڈ ابھرا۔ اور ان سے کہنے لگا۔ کتنے قریب ہو.....اور اب بھی کتنے دور ہو۔ اچانک تیز ہواؤں کی موسلا دھار بارش، زلزلوں کے جھٹکوں اور اندھیرے نے سارا ماحول خوفناک بنا دیا۔ اچانک طوفان کے اس ریلے نے ان لوگوں کو اپنے لپیٹے میں لے لیا اور وہ ان ہواؤں کو خود میں نہ اتار سکے۔ جو ان کو غموں کا مداوا ہوتی۔ میدان کی مٹی نے پھر ایک بار ان لوگوں کو اپنے آپ میں ضم کر دیا۔

آئندہ بھی بہت لوگ آئیں گے اور ان ہواؤں کو اپنے اندر اتار لینے کی کوشش کریں گے جو غموں کا مداوا ہوگی۔

نہ معلوم وہ لوگ کب آئیں گے جو ان ہواؤں کو اپنے اندر اتار لینے میں کامیاب ہوں گے۔ کب وہ خوش قسمت لوگ آئیں گے۔ اس لمحے کا سب کو انتظار ہے۔ پھر سارے لوگ ان کے ساتھ جلوس میں شامل ہوں گے اور وہ لوگ جو قبروں میں سو رہے ہیں وہ بھی قبروں سے نکل کر ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔

نہ جانے وہ صبح کب آئے گی!

عبدالجبار خلجی

دوہے

غم میں کلیاں رو رہیں
سارے پھول اداس
وہ علم قرآن سے
بجھا رہے تھے پیاس

☆

منتیں اور کوششیں
ہوئیں سبھی ناکام
رب کے آگے چل سکے
بتا مجھے وہ کام

☆

تڑپ رہی ہے زندگی
سانسیں جائے چھوٹ
کرسی پر وہ بیٹھ کر
ڈال رہے ہیں پھوٹ

☆

دھرتی امبر کانپتے
آتے جب وہ شیر
باطل ان کے سامنے
ہو جاتے سب ڈھیر

☆

تشنگی شمشیر کو
مٹا سکا نہ کوے
کتنی گردن مار کر
آنسو خوں کے روے

☆

دنیا تیرے ہاتھ میں
ساری آن سمائی
جیسے پتلی آنکھ کی
پلکوں بیچ بسائی

☆

بارش ہے یہ آب کی
دیتی اک پیغام
گر کر بھی اونچائی سے
کھوتی نہیں مقام

☆

کیسی چنچل ہے ندی
جمنا اس کا نام
قدموں کو وہ تاج کے
دھوتی صبح و شام

☆

Near Do Masjid Road, Meat Market,
Makrana Distt. Nagaur-341505 (Rajasthan)
Cell: 09269059712

مختار شمیم
بھوپال

قطعات

شکر الحمد! چلا سلسلۂ نور
شکر الحمد! بڑھا سلسلۂ نور
ظلمتوں میں جو بسر کی ہم نے
شکر الحمد! ملا سلسلۂ نور

☆

ماں نے بچپن میں کہا بیٹا پڑھو! بسم اللہ
باپ نے ضرب لگائی تھی وہیں الا اللہ
ایک اقراء کی صدا عالم امکان میں تھی
ہفت اقلیم نے ہر وقت کہا 'صل اللہ'

☆

ماں نے بچپن میں کہا بیٹا پڑھو! بسم اللہ
باپ نے ضرب لگائی تھی وہیں الا اللہ
گویا اقراء کی صدا نور کی تجسیم میں تھی
عشق وہ جھوم کے اٹھا ہے کہ ماشاء اللہ!

☆

ایک اک لفظ کی رکھی ہے مگر شان نزول
ایک اک حرف کہ تھا کہ نور کی صورت مقبول
وہ جو اقراء کی صدا گنبد افلاک میں تھی
وہی نغمہ مری رگ رگ میں ازل سے مشغول

☆

مکتب عشق میں کیا خوب یہ تعلیم ملی
درس استاد کہ بجلی سی کوئی کوند گئی
آج تک پہلا سبق ہم تو مگر پڑھ نہ سکے
اک جھماکہ سے جو یہ آنکھ ہوئی خیرہ بھی!

☆

یہ ہمیں ہوش نہ تھا دیتے جو اس کو دستک
یوں تو کس شان سے جاتے تھے ہم اس کے در تک
بے نیازی نے مگر مڑ کے نہ دیکھا ہم کو
بے خبر ایسے کہ پہنچے نہ کبھی بھی گھر تک

☆

خود پہ کیوں رشک نہ آئے ہمیں سبحان اللہ
نور ہی نور کا عالم ہے کہ ماشاء اللہ
دل میں ہے لا الہ کی ہر دم تسبیح!
لب پہ ہے صل علیٰ، صل علیٰ، صل اللہ

☆

10, Queen's Home, Ahmedabad Palace,
Kohifiza, Bhopal-462001 (M.P.)
Cell: 09827355155

حکیم منظور

(جموں وکشمیر کے بے حد معتبر جریدے 'دھنک' سے)

غزل

زمیں کے گرد میں سورج کو گھومتا دیکھوں
یہ آرزو ہے کہ منظر کوئی نیا دیکھوں
کروں میں جسم کی دیوار پر یقین کوئی
کہ اپنے جسم میں ٹوٹا ہوا خلا دیکھوں
ہر ایک لمحہ لکیروں کو جاگتے دیکھا
میں اپنی آنکھ کو بھی کاش جاگتا دیکھوں
تیرے ہی لمس سے سیراب ہے بدن میرا
تجھے کہاں مگر اے موجۂ ہوا دیکھوں
سمندروں کا نہ لکھوں میں مرثیہ کیونکر
ہمکتی آگ کو جب خود سے کھیلتا دیکھوں
اس آفتاب سے اس دن مصالحت ہوگی
میں اپنے رنگ میں جب اس کو ڈوبتا دیکھوں
بگاڑتا ہے، بناتا ہے، توڑتا ہے مجھے
ذرا یہ کہہ میں تری کون سی ادا دیکھوں
شفق حسین سہی دلربا سہی لیکن
شکستگی کے سوا اس میں اور کیا دیکھوں
شکست وریخت کے اس عہد میں مجھے منظور
نہیں یہ ہمت بے جا کہ آئینا دیکھوں

غزل

یہ بھی اسیر ظلمت رفتار کیوں ہوا
سورج حریف رنگ شب تار کیوں ہوا
اڑتی ہوا بکھیرتی رہتی ہے مجھ پہ گرد
یہ کیا ہوا میں نقش بہ دیوار کیوں ہوا
کیوں سہہ سکا نہ زرد زمیں کی برہنگی
وہ پیڑ موسموں کا طرف دار کیوں ہوا
پانی کا رنگ کیا ہے خلاؤں کا رنگ کیا
یہ سوچنا بھی باعث آزار کیوں ہوا
یہ سچ اگر ہے میں فقط سایہ ہوں سوچئے
میں ایک آئینے کا پرستار کیوں ہوا
بکنا اگر نہیں کسی قیمت پہ بھی مجھے
حیراں ہوں پھر میں شائق بازار کیوں ہوا
میری طرح جو کالے سمندر کا خوف تھا
پھر اپنی پیاس کا وہ علمدار کیوں ہوا
منظور گرچہ دل ہے مرا مطمئن مگر
ہاتھوں کا خون پوچھے میں فنکار کیوں ہوا

گل ساحر

ہربنس سنگھ تصور (موہالی)

اس نے کہا تو کون ہے؟
میں نے کہا ذاکر ترا
اس نے کہا میں کون ہوں؟
میں نے کہا ساحر مرا
شیریں ہے تلخابہ ترا

ساحر صاحب کو میں نے پہلی بار پانچ دریاؤں والے پنجاب کے شہر لدھیانہ کے اردو بازار میں دیکھا۔ وہ ایک فوٹو گرافر کی دوکان میں اسٹیل کے فریم میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ فوٹو کے نیچے حاشیے پر ان کے دست مبارک سے تحریر کردہ یہ شعر بھی تھا:

ہزار برق گرے لاکھ آندھیاں اٹھیں　　وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

ساحر صاحب کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔

لدھیانہ ایگریکلچر یونیورسٹی کے ڈاکٹر اجے پال سنگھ گل نے گل داؤدی کی دو قسموں کو ملا کر ایک نیا پھول پیدا کیا اور اس کا نام رکھا 'گل ساحر'۔

ڈاکٹر اجے پال سنگھ گل صاحب انجانے میں ایک غلطی کر بیٹھے۔ انہوں نے اس پھول کا نام گل ساحر لدھیانوی کے بجائے گل ساحر رکھ دیا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ لدھیانہ کے علاوہ یہ ساحر، یہ جادوگر، یہ شاعر، ہوشیار پور، کپورتھلہ، سنام، سیالکوٹ، لکھنؤ اور امرناتھ (ساحر) میں بھی اپنے تلخ ترش اور شیریں کلام سے دلوں کو مسحور کر رہے ہیں۔ ان جادوگروں کے چاہنے والے گل ساحر کو اپنے کسی من پسند ساحر سے منسوب کرلیں تو تعجب کی بات نہیں۔ جس طرح مجھے یہ جان کر قطعی تعجب نہیں ہوا کہ میر حسن لطیفی لدھیانوی صاحب کا یہ شعر۔

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں　　اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا

اب آہستہ آہستہ ساحر لدھیانوی صاحب کا ہو رہا ہے۔

'سحرِ غزل' کے خالق شری رام پرکاش ساحر ہوشیار پوری شاگرد تو جوش مل (سیانی) صاحب کے تھے لیکن رہتے تھے دہلی میں جوش ملیح آبادی صاحب کے مکان میں۔ میری ان سے پہلی ملاقات ان کے ایک شاگرد جناب امرت لال عشرت صاحب کے دولت کدہ پر مالیر کوٹلہ میں ہوئی۔ استاد اور شاگرد دونوں بڑے غضب کے زندہ دل انسان تھے۔ غالب کی طرح انہیں بھی شعر و سخن کے علاوہ صرف دو مزید چیزیں عزیز تھیں۔ ایک تھی ولائتی اور دوسری تھی دیسی۔ شام کے بعد اور رات ہونے سے ذرا پہلے میجر عبدالحمید فرحت صاحب کی حویلی میں نیم انگوری اور دو نیم ادبی محفلیں جمتیں اور ان محفلوں کو پورا ادبی اور پورا انگولی اور صبح تک تر و تازہ بنائے رکھنے کے لیے کبھی کبھی سنگرور سے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب بھی تشریف لے آتے تھے۔ محترم بیدی صاحب ان دنوں پنجاب میں ضلع سنگرور کے ڈپٹی کمشنر تھے اور مالیر کوٹلہ اس ضلع کی ایک شاعرانہ شاخ۔

ایک دن بیدی صاحب نے سنگرور سے ساحر صاحب کو ٹیلیفون پر طلب فرمایا اور کہا کہ وہ تقریباً ایک گھنٹہ بعد مالیر کوٹلہ پہنچ رہے ہیں، ایک شعری نشست کے لیے پٹیالہ چلنا ہے۔ عشرت، فرحت اور کیا نام ہے اس غالب کے شخص کا۔ اسے بھی ساتھ لے لینا۔ فون سننے کے بعد ساحر ہوشیار پوری صاحب ہم سب سے یوں گویا ہوئے۔

آپ تینوں کو اپنے ساتھ رکھوں حکم ساحر کو یہ سحر کا ہے

پٹیالہ میں موتی محل کے دربار ہال میں وال ٹو وال ضیافت کا الف لیلوی اہتمام دیکھ کر استاد اور شاگرد دونوں یاد آ گئے۔ استاد نے اپنی ایک غزل کے ایک شعر کے مصروع اول میں کیا خوب فرمایا ہے: پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں۔ دو صد، اور شاگرد کے مصرع ثانی: اپنا کھانا کھا رہا ہے تیرے دستر خوان پر۔ اس پر کو دیکھ کر میں نے اپنا حرارت والا ایمان واپس لے لیا۔ کہاں اشک بلبل اور کہاں یہ اسٹیج اسٹیج شرابیں اور شیشہ شیشہ کباب۔

مہاراجہ پٹیالہ سردار یادوندر سنگھ صاحب کے ایما پر ان کے چند خاص مہمانوں کی دل جوئی کے لیے یہ شعری نشست منعقد کی گئی تھی۔ سب سے پہلے میں نے اپنی ایک غزل سنائی۔ حسن اتفاق سے غزل کے ایک شعر میں شراب کا ذکر خیر بھی تھا۔ میرے بعد فرحت صاحب نے اپنے اشعار پیش کیے۔ ان میں بھی حسن اتفاق سے جام و مینا سے بات بنائی گئی تھی۔ فرحت صاحب کے بعد عشرت صاحب نے اپنا کلام دیپک صاحب کی تانوں کے ساتھ سنایا اور سماں باندھ دیا۔ اس میں بھی حسن اتفاق سے شراب بھی تھی شعلہ بھی تھا اور آواز بھی دکھائی دیتی تھی۔ عشرت صاحب کے بعد ساحر صاحب نے کلام پیش کیا۔ حسن اتفاق سے وہاں بھی مصرع مصرع مہ خانہ تھا۔

مے کدے میں بھی آ کبھی واعظ　　ایک دنیا یہاں بھی بستی ہے

پینے والوں یہ سوچنا کیسا　　کون مہنگی ہے کون سستی ہے

ساحر صاحب اپنے حصے کی داد ابھی پوری طرح سمیٹ بھی نہ پائے تھے کہ سامعین میں سے ایک صاحب نے زیرلب مسکراتے ہوئے بیدی صاحب سے پوچھا کہ جناب یہ اردو شاعری میں شراب کا ذکر اس قدر کیوں ہے؟ بیدی صاحب انسانی نفسیات کے ماہر تھے اور وقت کی نزاکت سمجھنے میں انہیں قدرت حاصل ہے۔ چند سکینڈ کے بعد انہوں نے بھی زیرلب مسکراتے ہوئے فرمایا صاحب شراب تو قدرت کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے۔ دیوتاؤں کو بھی یہ بہت پسند تھی۔ سوم رس کے ذکر سے دھارمک گرنتھ بھی خالی نہیں۔ رام نام کی مدرا سیون کرنے کے لیے انیک بار کہا گیا ہے، کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ رام نام کی جلیبیاں کھاؤ یا رام نام کا اچار نوش فرماؤ۔ اس کے بعد بیدی صاحب نے جو کچھ کہا وہ کسی نے نہیں سنا۔ جب شور ذرا کم ہوا تو انہوں نے مرزا غالب کا ایک حسب حال شعر سنایا۔

وہ چیز جس کے لیے ہے عزیز پٹیالہ　　سوائے بادۂ گلفام و مشکبو کیا ہے

Kothi No. 429, Sec. 55 (Phase I), Mohali-160055 (Punjab)

Cell: 09872093744

پیاز کے سیاسی و معاشی فوائد

اسد رضا

پیاز کے طبی فوائد سے تو آپ یقیناً باخبر ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ اس کا استعمال خون کو صاف کرتا ہے، ہاضمہ کو دست اور درست رکھتا ہے، کان کے درد کو دور کرتا ہے اور نزلے کو ختم کرتا ہے، لیکن اس حقیقت کا علم کم ہی لوگوں کو ہے کہ پیاز کے سیاسی و معاشی فائدے بھی ہیں۔ مثال کے طور پر پیاز کی فصل آنے پر قدرت کا یہ انمول تحفہ مندا ہو جاتا ہے اور کسانوں کا معاشی ہاضمہ خراب مگر ذخیرہ اندوزوں کی مالی حالت درست کر دیتا ہے۔ جب بہت سے کسان معاشی تنگی اور مہاجنوں کے دباؤ میں خودکشی کر کے اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں تو پہلے ذخیرہ اندوز مہنگے دام پر پیاز فروخت کرتے ہیں اور عوام کو بغیر پیاز کے ہی رلا دیتے ہیں۔ چونکہ مہنگی پیاز عوام الناس کا نزلہ دور نہیں کر پاتی، لہٰذا عوام اپنا نزلہ الیکشن کے دوران برسراقتدار پارٹیوں پر اتار دیتے ہیں اور وہ حکومت سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے اپوزیشن پارٹیاں پیاز کے سیاسی فوائد سے خوب خوب فیضیاب ہوتی ہیں، تاہم الیکشن کے بعد پیاز کی مہنگائی سے حزب اختلاف سیاسی فائدہ نہیں اٹھا پاتا۔ ان دنوں بھی پیاز کافی مہنگی ہوگئی ہے لیکن 'ہنوز انتخابات دور است' اس لیے سیاسی جماعتوں بالخصوص اپوزیشن پارٹیوں کو پیاز کی اس غیر دور اندیشی یعنی غلط وقت پر مہنگا ہونے کے عمل پر بہت غصہ آرہا ہے۔ اگرچہ آئندہ سال یعنی ۲۰۱۱ء میں کچھ ریاستوں میں اسمبلی الیکشن ہونے ہیں، لیکن بقول مرکزی وزیر زراعت شرد پوار پیاز پر مہنگائی کا سایہ صرف تین ہفتوں تک رہے گا۔ ظاہر ہے کہ اسمبلی انتخابات ہونے تک عوام اپنی کمزور یادداشت کے باعث پیاز کی مہنگائی پر آئے اپنے غصہ کو بھول جائیں گے اور حزب اختلاف اس غصہ کو ووٹ بینک میں تبدیل کر پائے گا۔

میدان سیاست کی طرح اردو زبان و ادب میں بھی پیاز کافی مقبول رہی ہے۔ مثلاً اردو کے معروف طنز و مزاح نگار فکر تونسوی پیاز سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے ایک اردو روزنامہ میں اپنے طنزیہ کالم کا نام ہی 'پیاز کے چھلکے' رکھ لیا تھا۔ تاہم فکر صاحب کے دور یعنی بیسویں صدی میں پیاز کے صرف طبی فوائد پر ہی زیادہ زور دیا جاتا تھا اور اکیسویں صدی کے برعکس اس کے سیاسی و معاشی

ٹی. این. راز

غزل

قرض غالب سے بھی ادا نہ ہوا
مجھ سے سگریٹ کا کش جدا نہ ہوا

کاش میں جوتے مارتا ان کو
مہمانوں کا حق ادا نہ ہوا

مائیکے والے چڑھ کے آئے ہیں
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

پھر بھلا اس میں لطف ہی کیا ہے
عشق جب گالیوں بھرا نہ ہوا

افسر اعلیٰ اک منسٹر سے
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

تم محبت کرو رقیبوں سے
یہ تو دل کو مرے جلانا ہوا

کیا وہ امرود والی آئی تھی؟
کیوں مرا اس سے سامنا نہ ہوا

مایا مندر کی میں نے کھائی بہت
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

غم کو ڈھویا فقط ہنسی کے لیے
کوئی ہم سا یہاں گدھا نہ ہوا

بن کے انسان رہتا گھاٹے میں
راز لیڈر بنا برا نہ ہوا

غزل

دل سرجری کے بعد کوئی دل نہیں رہا
غم کی بھی گھاس کھانے کے قابل نہیں رہا

میری مسرتوں کا سبب بس یہی تو ہے
میں رشوتوں کے بیچ میں حائل نہیں رہا

منصف ہے کون، کیسی عدالت، کہاں کا سچ
قاتل بھی کہہ رہا ہے کہ قاتل نہیں رہا

اس کے ہی روز و شب ہیں، وہی کامیاب ہے
جو خود ہی اپنے قول کا قائل نہیں رہا

پہچان ساری بہہ گئی سیلاب شہر میں
گاؤں کے چھوہڑوں میں بھی ساحل نہیں رہا

پیسے کا مول تول ہے اب عشق کا نہیں
محبوب بھی بھروسے کے قابل نہیں رہا

اس خوف سے کہ بیوی اڑا لے کہیں نہ جیب
سویا تو میں ضرور تھا، غافل نہیں رہا

نظریں اٹھا کے دیکھیے کہ اب تو درمیاں
پردہ وہ موٹے ٹاٹ کا حائل نہیں رہا

دل کا پیام فون پر ہم کس طرح سے دیں
چونگا ہی صرف رہ گیا، ڈائل نہیں رہا

جب سے اکڑ کے راز میں پڑھنے لگا ہوں شعر
میں بھی پڑھے لکھوں میں ہوں، جاہل نہیں رہا

1395, Sector 15, Panchkula-134113 (HR)
Cell: 09646532292

کشمیر کہانی۔ دو ہزار گیارہ

نور شاہ (سری نگر)

میں جہاں اس پل پر کھڑی ہوں، میرے ٹھیک نیچے دریائے جہلم بہہ رہا ہے، میرے آنے سے پہلے اس میں جو طوفان آیا تھا وہ اب تھم چکا ہے اور طویل دشوار کن راستوں سے گذرتا ہوا میرے وجود میں سمٹ چکا ہے، جہلم نے اب خاموشی اختیار کر لی ہے۔ اور آہستہ آہستہ ابھرتی ڈوبتی لہروں کے ساتھ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا ہے، اس کی اپنی ایک منزل ہے لیکن میرے اندر جہلم کے پانیوں نے جو طوفان بپا کر رکھے ہیں، کیا ان کی بھی کوئی منزل ہے؟ کیا یہ طوفان کبھی خاموش ہوں گے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو بار بار میرے ذہن کے پردوں پر اگتا ہے اور ایک کھلبلی سی مچا دیتا ہے۔ میری سوچیں بے حس ہو جاتی ہیں اور میری آنکھیں بے نور..... نہ تو میں دیکھ سکتی ہوں اور نہ ہی سوچ سکتی ہوں۔ یہاں پل پر آنے سے پہلے میں کتنی بار مری، آخر وہ کون سا دکھ ہے جو میں برداشت نہ کر سکی اور ہمت ہار بیٹھی۔ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس نے مجھے گھر سے باہر آنے پر مجبور کیا اور یہاں ایک خطرناک موڑ پر کھڑا کر دیا..... گھر..... میرا گھر جو اب سے کچھ دیر پہلے میری محبت کی آماجگاہ تھا، میرے لیے جنت سے کچھ کم نہ تھا۔ اب بے سکونی کا لبادہ اوڑھ کر گہرے سناٹے اور پراسرار خاموشی میں دھواں دھواں سا منظر پیش کر رہا ہے۔ بار بار قدم قدم پر مرنے سے بہتر ہے کہ ایک ہی بار مر جاؤں لیکن میرے یہ دو معصوم پیارے پیارے بچے..... سلمان اور صابر..... ان کو کس کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں، کن کے حوالے کروں؟ کیا میں اتنی ظالم ہو گئی ہوں، اس قدر کٹھور کہ اپنے ہاتھوں سے دونوں بچوں کو کھو دوں۔ ذرا ان کی جانب دیکھئے..... کیسے خوش ہیں، زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ناآشنا، کاغذی ناؤ بنا کر انہوں نے دریا میں ڈال دی ہے اور ایک بڑی سی لہر اسے دور لے گئی ہے، دونوں خاموشی سے تالیاں بجا رہے ہیں..... یہ دونوں، میرے دونوں بیٹے زندگی سے بھرپور ہیں، انہیں اپنی ناکامی پر بھی ہنسی آتی ہے، میں انہیں کیسے موت کو سونپ دوں۔ میں تو پہلے ہی بہت کچھ کھو چکی ہوں لیکن اب......؟!

کل جب صبح ہو گی تو شہر کے سارے اخبار چیخ اٹھیں گے..... ایک عورت نے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ دریائے جہلم میں کود کر خودکشی کر لی اور کشمیر کی ساری مائیں حیران ہو کر ایک دوسرے کا

منھ دیکھیں گی۔ آخر وہ کون سا دکھ تھا، وہ کون سا کرب تھا جو یہ ماں برداشت نہ کر سکی.....آج میں.....
میں ایک عورت اپنی ہی صلیب کندھوں پر اٹھائے اس پل پر آ گئی ہوں۔ میں جانتی ہوں، بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں، مجھے احساس ہے اس بات کا کہ میں جب اپنے دونوں بچوں کو اپنے وجود سے لپٹا کر پانی میں کودوں گی تو وہ دونوں بڑی التجا بھری نظروں سے مجھے دیکھیں گے، ان کی نگاہوں میں اس قدر دکھ ہوگا، درد و کرب ہوگا کہ مرنے سے پہلے میں نہ جانے کتنی مرتبہ مروں گی۔ وہ چیخ چیخ کر کہیں گے۔

''امی پلیز.....ایسا نہ کرو، ہم مرنا نہیں چاہتے۔''

ان کی چیخیں جہلم کا سینہ چیر کر رکھ دیں گی، ہواؤں کے قدم رک جائیں گے، فضائیں جم جائیں گی، کائنات کا دم گھٹ جائے گا، یہ چیخیں قیامت تک ہر اس ماں کو سنائی دیں گی جو اس پل سے گزرے گی.....میں بھی ایک ماں ہوں اور دکھوں کے اس پل پر جانے کب سے کھڑی ہوں!!

''امی ہمیں گھر لے چلو جہاں ہمارے ڈھیر سارے کھلونے ہیں، جہاں کھیلنے کے لیے ہمارا چھوٹا سا آنگن ہے.....امی یہ پانی بہت گہرا ہے، ہمیں ڈر لگتا ہے، امی تم نے دیکھا ہماری ناؤ ابھی ابھی کیسے ڈوب گئی، نظر بھی نہیں آ رہی ہے، جانے کسی کنارے لگی کہ نہیں! امی اب تک ابو گھر آ گئے ہوں گے، وہ ہماری راہ دیکھ رہے ہوں گے، گھر کے گوشے گوشے میں تلاش کر رہے ہوں گے۔ ہمیں نہ دیکھ کر جانے کیا سوچ رہے ہوں گے۔ گھبرا گئے ہوں گے.....امی چلو گھر چلو.....!''

اپنے حواس پر چھائی ہوئی ان چیخوں سے بچنے کے لیے میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی ہیں اور اب میں جہلم کے بہتے ہوئے پانیوں کی جانب دیکھے جا رہی ہوں آس پاس کی ساری دھند، سارا کہرا میری آنکھوں میں بھرتا چلا جا رہا ہے، ہر شے دھندلی دھندلی سی ہو گئی ہے اور مجھے لگ رہا ہے کہ جہلم نے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے اداسی کی چادر میں لپیٹ لیا ہے۔ وہ اور اداس نہیں ہونا چاہتا!

''چلو میرے بچو لوٹ چلتے ہیں۔''

میں اپنے بچوں کو اپنے دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر پل سے نیچے آ گئی ہوں۔ ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ میرا گھر، میری جنت گہرے سناٹوں میں کھوئی کھوئی سی اب میرے سامنے ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ گھر میں قدم رکھتے ہی سلمان اور صابر مجھ سے پوچھیں گے۔

''یہ کیا ابو اب تک گھر نہیں آئے۔ کہاں گئے، بتاؤ امی، ابو کہاں ہیں، وہ کیوں نہیں گھر آئے!''

میں گھر کا دروازہ کھولتی ہوں اور اپنے بچوں کی طرف دیکھتی ہوں۔

''اندر آؤ میرے جگر کے ٹکڑو..... تمہارے ابو ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں، اسی گھر میں مگر تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ مل نہیں سکتے!''

''کیوں......کیوں امی۔''

اب میں ان بچوں کو کیسے بتاؤں، کیسے سمجھاؤں کہ کشمیر کی لال بستی میں ان گنت بے نام قبروں میں ان کی قبر کو تلاش کرنا میرے لیے ممکن نہیں......!!!

'Maskan' 14-Lal-ded Colony, Gauripora, Link Road, Rawalpora

Srinagar-190005 (J&K) Cell: 09906771363

ادھورا مرا آدمی

رونق جمال (چھتیس گڑھ)

آدھی رات کے سناٹے میں پانچ ستارہ ہوٹل کی پہلی منزل پر یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے! رات کے وقت پانچ ستارہ ہوٹل کے سناٹے کی وجہ سے فائر کی آواز صاف سنائی دی ہوٹل میں افراتفری مچ گئی۔ ہوٹل کا حفاظتی عملہ، ویٹرس اسٹاف کے دیگر لوگ اور منیجر بدحواسی کے عالم میں اوپر نیچے ہو رہے تھے لیکن کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ گولی کہاں سے چلی ہے؟ منیجر نے فون کے ذریعہ پولیس کو اطلاع دے دی تھی اس لیے انسپکٹر چار سپاہیوں کے ساتھ ہوٹل پہنچ گیا۔ وہ جیپ کے رکتے ہی مستعدی سے اتر کر کاؤنٹر کے قریب پہنچا جہاں منیجر اس کا منتظر تھا! وہ اسے ساتھ لے کر پہلی منزل پر گیا۔ انسپکٹر نے طویل راہداری کا ایک چکر لگایا اور کمرہ نمبر ۱۰۸ کے قریب کھڑے ہو کر لمبی لمبی سانسیں لے کر کچھ سونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحے ایسا کرنے کے بعد ہاتھ کی چھڑی سے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھولنے کا حکم صادر کرنے لگا۔ اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے سپاہیوں سے دروازہ توڑ دینے کو کہا۔ انسپکٹر کا حکم ملتے ہی سپاہی دروازہ توڑنے کی جدوجہد کرنے لگے۔ اس سے پہلے کہ دروازہ ٹوٹتا دروازہ اندر سے کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک حسینہ تھی جو دروازہ کھول کر تیزی سے کمرے میں لوٹتی دکھائی دی۔ انسپکٹر منیجر چاروں سپاہی اور ویٹرس بھی کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرے کے منظر پر نظر پڑتے ہی انسپکٹر کے ہونٹوں سے سیٹی کی سی آواز نکلی۔ جیسے وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو حادثہ والے کمرے کا جج انتخاب کرنے کے لیے داد دے رہا ہو!

ہوٹل کے کمرے میں دو نوجوان مردوں کی لاشیں تھی اور ایک نہایت خوبصورت خاتون! کمرے کا سارا سامان سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ ایک لاش پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ جس کے سینے میں گولی لگی تھی۔ دوسری لاش جو صوفے پر چت پڑی تھی اور اس کی کنپٹی سے اب بھی خون نکل رہا تھا۔ یعنی اسے بہت قریب سے کنپٹی پر گولی ماری گئی تھی۔ خاتون کالے رنگ کا قیمتی گاؤن پہنے ہوئے تھی..... شانوں کو چھوتے بال کھلے ہوئے تھے اور اس کے سیدھے ہاتھ میں ریوالور تھی۔ انسپکٹر نے خاتون کے چہرے کو غور سے دیکھا اور پوچھا۔

''کون ہو تم.....!!؟ اور یہ سب کیا ہے.....!!!؟''

''جناب میرا نام پشپا کھرانا ہے.....! میں مشہور صنعت کار جسپال رانا کی بیٹی ہوں اور راہول کھرانا کی بہو.....!! یہ مرڈر ہے! دوہرا قتل!! اور یہ دونوں قتل میں نے کیے ہیں اس ریوالور سے!!'' اتنا کہہ کر پشپا نے پستول انسپکٹر کی جانب بڑھا دیا۔ انسپکٹر نے جیب سے رومال نکال کر پھیلا دیا اور پشپا کو پستول اس میں رکھنے کو کہا۔ پشپا نے خاموشی سے پستول رومال پر رکھ دی تو انسپکٹر نے احتیاط سے رومال کو لپیٹا اور پتلون کی جیب میں رکھتے ہوئے پشپا سے پوچھا۔

''کون ہیں یہ دونوں.....!؟''

''پلنگ پر پڑی لاش میرے شوہر کی ہے اور صوفے پڑی لاش میرے کالج کے زمانے کے عاشق کی!!''

''لیکن تم نے ان دونوں کا قتل کیوں کر دیا.....!؟''

''آپ کو یہ جاننے کے لیے میری زندگی کی اب تک کی مختصر کہانی سننی پڑے گی!''

''ٹھیک ہے.....!! آؤ بیٹھو.....اور اطمینان سے سب کچھ سچ سچ بتاؤ تاکہ میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں.....تمہارے کچھ کام آسکوں.....!!''

''انسپکٹر صاحب دراصل میری بدنصیبی کی کہانی کی ابتدا آج سے دس سال پہلے کالج سے شروع ہوئی۔ میں سائنس کی طالبہ تھی۔ جس آدمی کی لاش صوفے پر پڑی ہوئی ہے اس کا نام راج سکسینا ہے۔ راج میرا ہم کلاس تھا۔ پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ اس لیے کلاس کے طلبا و طالبات ہمیشہ اس کے ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ میں بھی اس کے طلسم کا شکار ہو گئی اور ایک دن مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کے دام محبت میں گرفتار ہو چکی ہوں۔ میرے ڈیڈی ارب پتی ہیں، سوسائٹی میں ان کا بہت احترام و عزت ہے۔ اس لیے میں جانتی تھی کہ راج جیسے اوسط درجے کے آدمی سے میرا رشتہ ازدواج میں بندھنا ممکن نہیں ہے۔ ان ہی سب باتوں کو خیال میں رکھ کر میں نے راج سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا بلکہ جب کبھی اس نے اظہار محبت کرنے کی کوشش کی میں نے اسے ادھر ادھر کی باتوں میں الجھا کر اس لمحے کو خوبصورتی سے ٹال دیا۔ اس طرح پڑھائی کے چار سال کیسے گذر گئے پتہ بھی نہیں چلا۔ بی ایس سی کا نتیجہ آتے ہی ایک دن ڈیڈی نے اپنے دوست راہول کھرانا کو فیملی کے ساتھ رات کے کھانے پر بلایا۔ راہول کھرانا کی فیملی میں ایک بیٹا راکیش کھرانا ایک بیٹی آشا کھرانا راہول کھرانا کی پتنی اور بیوہ بہن ہے۔ پانچوں رات کے کھانے پر آئے۔ ان کے آتے ہی ڈیڈی نے مجھے بلا کر ان سب سے میرا تعارف کرا دیا۔ تعارف کے بعد ان لوگوں نے مجھ پر بھرپور توجہ دینی شروع

کر دی۔ کھانے کے دوران بھی وہ لوگ میری جانب ہی متوجہ رہے۔ آخر کھانے کے بعد ڈیڈی اور راہول انکل نے آپس میں کچھ صلح مشورہ کیا اور راکیش سے میرا رشتہ طے کر دیا۔ راکیش خوبصورت سلیقہ مند پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ ڈیڈی کے فیصلے کے آگے میں نے سر جھکا دیا کیونکہ ڈیڈی ہی میرے سب کچھ تھے۔ ماں میرے بچپن میں ہی گذر گئی تھی۔ اس لیے مجھے ماں کی شکل بھی یاد نہیں۔ ڈیڈی چاہتے تو دوسری شادی کر سکتے تھے لیکن میری خاطر اپنے جذبات کو دبا دیا تھا اور اپنے آپ کو کام کے جال میں الجھا کر رکھ دیا تھا۔

کچھ دنوں بعد راکیش سے میری شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد پتہ چلا کہ راکیش باپ بننے کا اہل نہیں ہے۔ ہم دونوں ڈاکٹروں کے پاس گئے، کئی مندروں درگاہوں اور گرودواروں میں ماتھا ٹیکا لیکن نتیجہ صفر رہا۔ میں نے حالات اور زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اپنے اندر مچل رہے ممتا کے سمندر کو سکھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن راکیش حالات سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ ہوا اور وہ اپنے باپ بننے اور مجھے ماں بنانے کے لیے نئے نئے پلان لے کر میرے پاس آتا جنہیں سن کر کبھی میں ہنس دیتی اور کبھی بے انتہا غصہ ہو جاتی....!! چند ہفتوں سے پہلے راکیش نے میرے سامنے راج سکسینا کا ذکر چھیڑ دیا اور مجھے کریدنے کی کوشش کی....! لیکن میں نے راکیش کے ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور معاملے کو درگذر کر دیا۔ ایک روز راکیش نے مجھ سے ایسی بات کہی جسے سننا کوئی بھی عورت گوارہ نہیں کر سکتی....!! راکیش نے راج کے سلسلے میں کافی معلومات حاصل کر لی تھی۔ وہ یہ جان گیا تھا کہ راج کالج کے زمانے میں میرا عاشق تھا اور میں بھی اس کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھی....!! اس لیے راکیش نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا کہ اگر میں راکیش کی بات مان لوں تو میری گود آباد ہو سکتی ہے۔ وہ باپ اور میں ماں بن سکتی ہوں......!! ہمیں اپنا جانشین اور اربوں کی دولت کا وارث مل سکتا ہے۔ مجھے راج کا پیار مل سکتا ہے....!!! راکیش نے میرے سامنے تجویز رکھی کہ میں راج سے ملنا جلنا شروع کر دوں۔ راج سے راہ و رسم بڑھاؤں اور بے تکلف ہو جاؤں۔ راج کے اتنا قریب چلی جاؤں کہ حاملہ ہو جاؤں....!! راکیش کے الفاظ میرے کانوں میں پگھلتے ہوئے لوہے کی مانند اثر کر رہے تھے۔ اس کے بے ہودہ الفاظ، گھٹیا سوچ اور خود پرستی نے اسے میری نظروں میں گرا دیا تھا۔ میں اس کی عزت کے لیے اپنے جذبات اپنی جوانی ممتا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھی لیکن وہ صرف اپنے آپ کو مکمل مرد ثابت کرنے کے لیے انسانیت اور ازدواجی رشتے کو داغدار کرنے پر آمادہ تھا۔ مجھے اس سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اور آج تو حد ہی ہوگئی۔ راکیش نے اپنی دولت سے راج کو خرید لیا تھا۔ اسے وہ سب کرنے پر راضی کر لیا تھا جس کا میں تصور بھی کرنا نہیں چاہتی تھی....!! راج جسے میں نے کبھی دل و

جان سے چاہا تھا وہ بھی ہوس کا پجاری نکلا اور چند کاغذ کے ٹکڑوں کے بدلے میرے جسم سے کھیلنے کو تیار ہو گیا۔ ان دونوں کے پروگرام کے مطابق راکیش مجھے لے کر یہاں اس ہوٹل میں پہنچا۔ راج پہلے سے کمرے میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی دونوں مجھ پر دباؤ ڈالنے لگے۔ یہ دونوں جس قدر مجھ پر دباؤ ڈال رہے تھے میرے اندر کی عورت اتنی ہی بیدار اور خونخوار ہوتی جا رہی تھی۔ آخر تھک ہار کر میں نے اپنی عزت بچانے کے لیے دونوں کی زندگیوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور راکیش کی ریوالور کو اپنے قبضے میں کر کے دو فائر کیے اور دونوں کا کام تمام کر دیا۔ یہ ہے انسپکٹر صاحب اس دوہرے قتل کی حقیقت اور مختصر کہانی.....!! جسے میں نے حرف بہ حرف سچ سچ آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں یہ قدم نہ اٹھاتی تو آج میری عزت عصمت تار تار ہو جاتی۔ ایک عورت ہوس کا ہی نہیں مردانگی کا بھی شکار ہو جاتی....!!''

پشپا کا بیان سننے کے بعد انسپکٹر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ جیب سے ریوالور نکالی۔ رومال سے اسے اچھی طرح صاف کیا اور صوفے پر پڑی ہوئی لاش کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے پشپا سے بولا۔

''آپ جا سکتی ہیں...!! میں وعدہ کرتا ہوں.... پوری تحقیقات میں آپ کا ذکر کہیں نہیں آئے گا۔ ریوالور آپ کے پتی کے ہاتھ میں تھما دینے سے میرا مقصد ہے کہ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ کسی بات پر رنجش ہو جانے کی وجہ سے آپ کے پتی نے پہلے راج سکسینا کو گولی مار دی اور پھر اپنے ریوالور سے خودکشی کر لی ہے.....!!

''کیا ایسا ہو سکتا ہے..... انسپکٹر صاحب!!؟؟''

''سب کچھ ہو سکتا ہے میڈم....!!''

''لیکن..... یہ سپاہی...... منیجر..... ویٹرس.....!!''

''یہ لوگ ویسا ہی کہیں گے جیسا میں کہوں گا....! آپ فوراً گھر چلی جائیے میں وہاں آ کر آپ کے ڈیڈی کا اور آپ کا بیان قلمبند کر لوں گا۔ آپ کو ان تمام باتوں سے انجانگی ظاہر کرتے ہوئے بیان دینا ہے۔ میں آپ کے ڈیڈی جسپال رانا اور خسر راہول کھرانا کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ڈیڈی سے کہیے ان سب کے منہ نوٹوں سے بھر دیں پھر یہ وہی کہیں گے جو ہم چاہیں گے..... کیونکہ ان لوگوں کو ہوٹل کا وقار اپنی نوکریاں پیاری ہیں.....!!

''اور سر آپ....!!''

''مجھے معاف کریں میڈم..... آپ کی شرافت اور پاک دامنی کی وجہ سے زندگی میں پہلی

بار ایک اچھا کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ شاید اس ایک اچھے کام کی وجہ سے سارے پاپ دھل جائیں!!! فی الحال تو آپ جلد سے جلد گھر جا کر ڈیڈی سے بات کرلیں....!! باقی مجھ پر چھوڑ دیں..... میں سب سنبھال لوں گا.....!!!!

'Kayenaat' Street No. 9, Mini Adarshnagar, Durg-491009 (C.G.)

Cell: 09981072672, 09425212354

میخانۂ اردو کا پیر مغاں۔ نارنگ ساقی

شاہد نعیم (دہلی)

۵ر ستمبر ۲۰۱۲ء کو رابندر بھون، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی میں نذیر فتح پوری صاحب کی مرتب کردہ ایک ضخیم کتاب ''میخانہ اردو کا پیر مغاں: نارنگ ساقی'' کا اجراء بدست گوپی چند نارنگ صاحب عمل میں آیا۔ رسم اجراء کی تقریب میں اردو ادب کی نامور شخصیات شریک ہوئیں۔ ۵۹۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب نارنگ ساقی صاحب کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مبسوط ہے، جس میں ہندو پاک کے ممتاز ادباء شعراء اور عظیم دانشور حضرات نے نارنگ ساقی صاحب کی حیات وادبی خدمات کے تعلق سے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ کتاب کا انتساب نذیر فتح پوری صاحب نے محبان کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی کے نام کیا ہے، جب کہ پیش لفظ گوپی چند نارنگ صاحب نے لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے نارنگ ساقی کی شخصیت، ان کی مہمان نوازی، اردو نوازی اور ان کی ادبی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ پیش لفظ میں نارنگ ساقی صاحب کے بارے میں نارنگ صاحب یوں رقم طراز ہیں:

> ''نارنگ ساقی ایک باغ و بہار شخصیت کا نام ہے، جن کی بہت ساری خوبیوں کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔ بس یہ کہوں گا کہ ان کی گفتگو ہو یا تحریر، دونوں میں اخلاص ومحبت کی زیریں لہریں ہمیشہ موجزن رہتی ہیں۔ ان کی زندگی ان اوصاف اور اقدار پر کھری اترتی ہے، جو ہماری صدیوں پرانی تہذیب کی شناخت رہی ہیں۔ وہ نہ صرف تہذیبی اقدار کے علمبردار ہیں، بلکہ ان کے رمز شناس بھی ہیں۔ ان کی شخصیت اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ انہوں نے آہستہ روی سے ہی سہی، وہ سب کچھ کیا جو کرنا چاہتے تھے۔ آج کے زمانے میں اقدار شناسی اور اقدار پروری کا جو تقاضہ ہے، اسے نارنگ ساقی جیسے لوگ بحسن وخوبی پورا کر رہے ہیں۔ نہ صلہ کی پروا، نہ ستائش کی تمنا، بس کام کیے جا رہے ہیں، جیے جا رہے ہیں۔ لیکن ان تمام اوصاف کے علاوہ وہ اپنی ایک الگ ادبی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اردو کے ممتاز ادیب وشاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے ان کا گہرا لگاؤ تھا اور اس گہری رفاقت کی دلیل

ان کی چار کتابیں ہمارے کنور صاحب، یادوں کے جشن، کلیات سحر اور مہندر سنگھ بیدی سحر (مونوگراف ساہتیہ اکادمی) ہیں۔ ان کے علاوہ ''ادیبوں کے لطیفے'' اور ''خوش کلامیاں قلمکاروں کی'' ان کی مقبول کتابیں ہیں۔ جوان کے ادبی خلوص کا اظہار یہ معلوم ہوتی ہیں۔ ان کتابوں کے کئی ایڈیشن ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ ''سحر خیال'' (شعری مجموعہ ساحر ہوشیار پوری) اور کلیات اکبرآبادی کے مرتب بھی ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت کا یہ اعتراف ہی ہے کہ قتیل شفائی اور مجتبیٰ حسین جیسے متعدد اہم قلمکاروں نے اپنی کتابوں کا انتساب ان کے نام کیا ہے اور کئی ادبی رسائل نے ان پر گوشے اور نمبر نکالے ہیں۔''

''میخانہ اردو کا پیر مغاں۔ نارنگ ساقی'' میں دوسرا مضمون شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا ہے، جس میں انہوں نے 'آ و ساقی کہ بزم عشرت ہے' عنوان کے تحت نارنگ ساقی کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 'ادیبوں کے لطیفے' اور 'خوش کلامیاں قلمکاروں کی' میں لکھے لطیفے کی بابت گفتگو کی ہے۔ ساقی صاحب کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ساقی صاحب کے بارے میں کوئی لکھنے بیٹھتا ہے تو خود اپنی شخصیت کو نمایاں کر دیتا ہے، یعنی ساقی کی دوستی کا نشہ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اردو کے لکھنے والے اپنی خاص عادت، یعنی دوسروں کی برائی کرنا، اسے ترک کر کے ساقی صاحب کی اچھائیاں بیان کرتے ہیں۔''

ساقی کے تعلق سے نذیر فتح پوری صاحب اپنے مضمون ''گفت باہمی'' میں لکھتے ہیں:

''ساقی کی ادبی خدمات محض لطیفوں تک محدود نہیں۔ انہوں نے ادبی مضامین لکھے ہیں، شخصیات پر بھی مضامین لکھے ہیں اور ایک قابل ذکر کام یہ بھی کیا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی ادبی حیثیت کو نمایاں کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ بے حسوں کی اس دنیا میں چلے جانے کے بعد گھر کے لوگ اپنے فنکاروں کو یاد نہیں رکھتے، بلکہ ان کی جمع شدہ کتب، رسائل، اخبارات کے تراشے اور ان کی ڈائریاں ردی والوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ایسے میں ساقی نے سحر کے ادبی اثاثے کا پوری طرح تحفظ کیا ہے۔''

'دیکھو ہم نے ایسے بسر کی' نارنگ ساقی صاحب کا مضمون ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے

گھر، خاندان، شادی اور بچوں کو متعارف کرایا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے سفر میں ملنے والے دوست واحباب اوران کی ملاقاتوں سے روشناس کرایا ہے۔ یہ وہی دوست واحباب ہیں جو اردو ادب کے افق کے آفتاب ومہتاب مانے جاتے ہیں۔ انہی اردو ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی میزبانی کے ذریعے نارنگ ساقی اس مقام پر پہنچ گئے کہ آج وہ میخانۂ اردو کے پیر مغاں بنے ہوئے ہیں۔ اس کا اعتراف وہ برملا کرتے ہیں:

> ''ایک انسان کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ میں نے بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کی دو ایک دہائیوں میں جس معاشرے میں زندگی جی، اور اس سے جو لطف وانبساط حاصل کیا، اس کا ادراک وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنہوں نے اس معاشرے کی تشکیل میں حصہ لیا ہو۔ ہر دور میں معاشرے اپنے تقاضوں، اپنی افادیت اور اپنے لوازمات اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے ہیں اور جب یہ تقاضے پورے ہو جاتے ہیں تو یہ معاشرے بھی خوشی خوشی معدوم ہو جاتے ہیں۔''

'میخانۂ اردو کا پیر مغاں: نارنگ ساقی' میں اردو زبان کی سو سے زیادہ عظیم ترین شخصیات نے نارنگ ساقی کی شخصیت اوران کی ادبی کارگزاریوں پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اختر الاسلام صاحب، نارنگ ساقی کی کتاب 'ادیبوں کے لطیفے' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ساقی صاحب کے مرتب کردہ ان لطیفوں میں اچانک دل سے نکلے ہوئے برجستہ فقرے، واقعے یا خوشگوار حادثے لطافت بیان اور نزاکت خیال سے امتزاج کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر پھیل کر سدابہار بن گئے ہیں۔ گویا پرانی شراب نئی برانڈ کے ساتھ پیش کر دی گئی ہے۔''

احمد عثمانی صاحب 'خوش کلامیاں قلمکاروں کی' کے حوالے سے یہ تبصرہ کرتے ہیں:

> ''اس کتاب کے پڑھنے سے دل کی بیماری، ذہنی کدورت، ذیابیطس عصر حاضر کی مشہور بیماری چکن گنیا تک دفع ہو جائے گی۔''

ادیب جاودانی صاحب نارنگ ساقی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''وہ ان لوگوں میں سے ہیں، اردو جن کی مجبوری نہیں بلکہ اختیاری ہے۔ اس اعتبار سے کہ ساقی صاحب کی مادری زبان اردو نہیں ہے، البتہ اردو سے ان کا رشتہ محبت کا ہے۔ اردو سے ان کا کمٹمنٹ اور لگاؤ مثالی رہا

ہے۔ اردو شاعروں اور ادیبوں کی وہ دل و جان سے قدر کرتے ہیں اور ان کی صحبتوں کا فیض اٹھاتے، وہ خود بھی ادیب بن گئے ہیں۔''

ارتضٰی کریم صاحب مضمون 'اچھا قاری سچا ساقی' نارنگ ساقی صاحب کے اسلوب کی بابت یوں بیان کرتے ہیں:

''نارنگ ساقی طنزیہ اور مزاحیہ اسلوب سے کام لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کا پیرایۂ اظہار شگفتہ بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ ان کے اسلوب میں موجود طنز و مزاح کی چاشنی اور نشتر کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ نارنگ ساقی اپنے مزاج اور منہاج کے اعتبار سے طنز نگار اور ظرافت پسند ہیں۔''

اسد رضا صاحب اپنے مضمون 'ساقیِ ادب۔ نارنگ ساقی' میں ان کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مۓ شعر و ادب کے اس ساقی کی مادری زبان اگرچہ پنجابی ہے، لیکن علمی قلمی زبان اردو ہے۔ وہ اردو اور اردو والوں دونوں کے عاشق ہیں، لیکن ہندی اور دیگر زبانوں کی بھی قدر کرتے ہیں اور ان کے ادیبوں کی بھی مہمان نوازی کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اپنے مضمون 'نارنگ ساقی ادیب بھی، ادب نواز بھی' میں نارنگ ساقی کی ادبی خدمات پر پرمغز گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''بعض لوگ ساقی کا شمار ادیبوں میں نہیں کرتے، میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ خواہ ہمارے کنور صاحب ہو یا کلیات اکبر، سحر خیال (سحر ہوشیار پوری) ہو یا کلیات سحر (کنور مہندر سنگھ بیدی سحر)، یادوں کا جشن (کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی سوانح) ہو یا پھر 'ادیبوں کے لطیفے' یا 'خوش کلامیاں قلمکاروں کی' ساقی کے ادیب ہونے کے روشن ثبوت ہیں۔ پھر ساقی کے متعدد تبصرے اور مضامین بھی ہیں، جن میں نہ صرف ان کے اندر کا ادیب سامنے آتا ہے بلکہ وہ ایک ناقد کی طرح تنقید بھی کرتے ہیں۔''

انور سدید (پاکستان) نے 'لاہور کی ایک شام نارنگ ساقی کے نام' عنوان کے تحت اپنے مضمون میں ساقی کی بذلہ گوئی کی جڑیں تلاش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں جب کبھی نارنگ ساقی کی بذلہ گوئی، لطیفہ نوازی کی جڑیں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو ان کے رابطے دلیپ سنگھ اور مجتبیٰ حسین کے ساتھ جا ملتے ہیں اور باور کرنا پڑتا ہے کہ جس طرح خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اسی طرح مزاح نگار کو مل کر دوسرے شخص کے باطن سے بھی مزاح کا رنگ ابھرتا ہے۔''

جوگندر پال نے 'اور' عنوان کے تحت ساقی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے:

''نارنگ ساقی نے اپنا تخلص شعر کہنے کے لیے 'ساقی' نہیں رکھا۔ ساقی کاروباری آدمی ہے اور اس کا کہنا ہے 'ہوتا وہی ہے جو ہم واقعی کر رہے ہوں' آپ کو شراب پلانے کا شوق ہو تو آپ ساقی ہیں اور شعر کہنے کا تو شاعر...... سو ساقی کوئی جھوٹ موٹ کا ساقی نہیں، واقعتاً ساقی ہے۔ آپ دوستی کے دعویدار ہوں تو شراب کا پورا ڈرم پی لینے پر بھی آپ اس سے یہی شکایت سنیں گے بس! ارے صاحب اور لیجیے...... اور! ہمارے زمانے کے دانشور جہاں بس، بس کی رٹ لگا کر زندگی کا دائرہ کار تنگ کیے ہوئے ہیں، وہیں یہ جیالا سا ساقی اپنی اور، اور کی بانٹ پر نہال ہو جاتا ہے۔''

'میخانۂ اردو کا پیر مغاں: نارنگ ساقی' میں سو سے زیادہ قلمکاروں نے نارنگ ساقی کی حیات و کارناموں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ سر دست سب کے تاثرات پیش کرنے سے قاصر ہیں، لیکن اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ واقعی یہ کتاب پڑھنے لائق ہے اور یہ اردو ادب کے خزانہ میں بیش بہا اضافہ ثابت ہوگی۔